مقالاتِ یوسفی

شخصیات و تأثرات

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

مکتبہ لدھیانوی

مقالاتِ یوسفی

شخصیات و تأثرات

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

☆☆☆☆☆

مکتبہ لدھیانوی

اشاعت اول .... جون ۱۹۹۵ء

قیمت ....

ناشر .... مکتبہ لدھیانوی جامع مسجد فلاح فیڈرل بی ایریا
نصیر آباد بلاک نمبر ۱۴ کراچی نمبر ۳۸

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

۱۔ ماہنامہ بینات کراچی کا اداریہ "بصائر و عبر" میرے حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد یوسف بنوریؒ تحریر فرماتے تھے، جو "بینات" کے ماتھے کا حسین جھومر ہوا کرتا تھا، حضرتؒ کے وصال (۳ر ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ) کے بعد "بصائر و عبر" کی خانہ پری اس ناکارہ، کم فہم و کم سواد کے ذمہ کردی گئی۔ پیشِ نظر مجموعہ میں شامل "شخصیات و تاثرات" دورِ ثانی کے "بصائر و عبر" ہیں۔

۲۔ البتہ دو شخصیات اس سے مستثنیٰ ہیں، ایک میرے والد ماجدؒ کہ ان کا تذکرہ ہفت روزہ "لولاک" فیصل آباد میں شائع ہوا تھا، دوسرے سیدی و مرشدی حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ کہ ان پر "بصائر و عبر" کا مختصر سا اداریہ میرے حضرت بنوریؒ نے تحریر فرما کر اس ناکارہ کو تکمیل و اضافے کا حکم فرمایا تھا، کیونکہ حضرتؒ غالباً سفر حرمین شریفین کے لئے پابہ رکاب تھے، چنانچہ اس ناکارہ نے "مخمل میں ٹاٹ کی پیوند کاری" کرکے اس کو پھیلایا، اور وہ حضرتؒ کے نام سے شائع ہوا (حضرتؒ کے "بصائر و عبر" کا جو مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہوا ہے یہ پورا مضمون اس میں بھی موجود ہے) اس ناکارہ نے بطورِ تبرک اس کو زیرِ نظر مجموعہ میں شامل کرلیا، تاکہ اس کا آغاز میرے شیخ مرشدؒ کے حسین "ذکرِ خیر" سے ہو، اور اس کی بسم اللہ میرے حضرت بنوریؒ کی پاکیزہ تحریر سے ہو، اور ان بزرگوں کی برکت سے یہ مجموعہ عند اللہ شرف قبول حاصل کرے، (اس مضمون کا ڈیڑھ صفحہ میرے حضرت بنوریؒ کے قلم سے ہے، اس سے آگے اس کوتاہ قلم کی پیوند کاری ہے)۔

۳۔ ''شخصیات و تاثرات'' میں تاریخی ترتیب ملحوظ ہے' اور حضرت ''سیدی و مرشدی'' سے اس مجموعہ کے آغاز کی ایک مناسبت یہ بھی ہو گئی کہ تاریخی لحاظ سے بھی ''سیدی و مرشدی''' کا ذکرِ خیر سب سے مقدم تھا۔

۴۔ یہ تمام ''تاثرات'' ان بزرگوں کی وفات پر معرضِ تحریر میں آئے' البتہ حضرت مخدوم مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ العالی پر جو شذرہ ''شاہ فیصل ایوارڈ'' کے سلسلہ میں کہا گیا وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

۵۔ میرے حضرت بنوریؒ پر متعدد مضامین اس کوتاہ فہم کے قلم سے نکلے تھے' پیشِ نظر مجموعہ میں ان سب کو یکجا کر دیا گیا۔

۶۔ اس ''بزمِ تاثرات'' میں شریک شخصیات کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا' اسے بس راقم الحروف کے شخصی تاثرات کی حیثیت سے پڑھا جائے' یہ ان بزرگوں کا سوانحی خاکہ بھی نہیں' نہ ان کے اوصاف و کمالات کا پورا مرقع' نہ ان کے عنداللہ مرتبہ کا معیار۔ ولا ازکی علی اللہ احدا۔ ناظرین کرام سے التجا ہے کہ اگر کوئی کام کی بات نظر پڑے تو ناکارہ مؤلف کو دعائے خیر سے ممنون فرمائیں' اور کوئی لغزش و کوتاہی نظر آئے تو من ستر علی اخیہ المسلم ستر اللہ عورانہ یوم القیمۃ پر عمل فرمائیں۔

۷۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ اور شخصیات بھی اس ''بزمِ حسین'' میں شریک ہوتیں' مؤلف اس کوتاہی پر نادم ہے' توفیقِ الٰہی دستگیری فرمائے تو خیال ہے کہ ایک اور محفلِ حسن آراستہ کروں' اور آپ کی محترم شخصیات کو دعوتِ شرکت دوں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

۸۔ یااللہ! آپ کے چند بندوں کا یہ تذکرہ آپ کی بارگاہِ عالی میں پیش کر رہا ہوں' اے کریم! آپ ان کے ظاہر و باطن اور ان کے مبداء و مآل سے پوری طرح واقف ہیں' یااللہ! اگر کسی بات کے نقل کرنے میں فروگزاشت یا کسی جذبہ کے اظہار میں افراط و تفریط ہوئی ہو تو اپنے لطفِ بے پایاں سے اس کو معاف فرما' اور اپنے ''سترِ جمیل'' سے اس کے عیوب کی ستاری فرما۔

فاطر السموات والارض انت ولي فى الدنيا والآخرة توفنى

مسلما والحقنى بالصالحين

وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه صفوة البرية سيدنا محمدن النبى الامى

وعلىٰ آله واصحابه واتباعه اجمعين

محمد یوسف عفا اللہ عنہ لدھیانوی

۲۸/۱۰/۱۴۱۵ھ

محمد یوسف لدھیانوی

دفتر ختم نبوت پرانی نمائش کراچی

فہرست

سیدی و مرشدی حضرت اقدس
مولانا خیر محمد جالندھری رحؒ

الحمد للّٰہ الذی لہ البقاء وکتب علی غیرہ الفنا والصلاۃ والسلام علی خاتم النبیین وسید الرسل الاتقیاء محمد والہ الاصفیاء وصحبہ الاذکیاء ' مادام تھمی العیون بالبکاء وتسلی القلوب بالعزاء۔ وبعد!

۲۱ شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء بروز جمعرات بوقت ساڑھے گیارہ بجے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ بانی خیر المدارس ملتان اس عالم فانی سے رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بلاشبہ موت وحیات اس عالم کون وفساد کا خاصہ ہے' یہاں جو آیا وہ رہنے کے لئے نہیں بلکہ جانے کے لئے ہی آیا۔ آنا اور جانا سنت بنی آدم ہے' اور **کل نفس ذائقۃ الموت** حق تعالیٰ کا تکوینی امر ہے جس سے کسی کو مخلص نہیں۔ یہاں صبروضبط' تسلیم وانقیاد اور رضا بالقضاء کے بغیر کوئی چارہ نہیں' **ان للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل شئی عندہ باجل مسمی۔**

تاہم بعض شخصیتیں قافلۂ ہستی کے لئے مینارۂ نور ہوتی ہیں۔ ان کے وجود مسعود سے علم ودانش' زہد وتقویٰ' اور یقین و معرفت کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں' اور ان کے دم قدم سے علوم نبوت کا وقار قائم رہتا ہے' ان کے جانے کے بعد ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے کہ مستقبل میں اس کے پُر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حضرت مولانا مرحومؒ کا شمار انہی جامع الکمالات ہستیوں میں تھا' وہ نہ صرف اپنے دور کے جید اور ممتاز عالم تھے بلکہ بڑے عاقل ومتین اور مدبر ومنتظم تھے' علم ووقار کا مجسمہ اور خدا ترسی وللّٰہیت کا بہترین نمونہ تھے' ان کی موت عقل ودانش' حلم ووقار' تدبر وانتظام اور مکارم اخلاق کی موت ہے۔ ان کے وجود سے علم اور علماء کا وقار قائم تھا۔ خانقاہ کی عظمت باقی تھی۔ ارشاد وتلقین کی شمعیں روشن تھیں اور اصلاح وتربیت کی محفلیں آباد وبارونق تھیں۔ پاکستان کے مرکزی اور تاریخی شہر "ملتان" میں ان کا مدرسہ "خیر المدارس" اسم بامسمّٰی تھا۔ جہاں تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفوس' اصلاح اخلاق اور تربیت قلوب کی طرف بھی توجہ تھی۔ صورت کے ساتھ روح بھی تھی۔ صفائی معاملات میں خصوصی امتیاز تھا۔ یوں تو حضرت مرحوم کی شخصیت تھانہ بھون اور دیوبند سے تعلق کی وجہ سے شہرۂ

آفاق تھی' آپ حضرت حکیم الامت (قدس اللہ سرہٗ) کے خلیفۂ مجاز اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے' لیکن حضرت مرحوم کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ اس وقت ملا جب کہ دینی درس گاہوں کی تنظیم "وفاق المدارس" کی بنیاد پڑی اور وفاق المدارس کے اجتماعات میں ان سے مصاحبت وہم نشینی کے مواقع میسر آئے' انہیں جذبات سے بالاتر اور طیش وغضب سے پاک دیکھا' ان کے رگ وریشہ میں عقل ودانش اور حلم وتدبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خفیف الجسم اور لطیف الروح تھے۔ بڑی قابل قدر ہستی تھی' حق تعالیٰ ان کو عفو ومغفرت اور رحمت ورضوان کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز فرمائے' صاحبزادگان گرامی مولانا حافظ رشید احمد' مولانا حافظ محمد شریف اور مولانا حافظ عبدالحق کو حضرت مرحوم کے صحیح جانشین بنائے اور ان کے آثار باقیہ کو قائم ودائم رکھے۔

ایک حدیث میں ہے:

یذھب الصالحون الاول فالاول ویبقی حفالہ کحفالۃ الشعیر او التمر لایبالیھم اللہ بالۃ

"نیک لوگ یکے بعد دیگرے اٹھتے جائیں گے اور (انسانیت کی) تلچھٹ پیچھے رہ جائے گی جیسا کہ ردی جو اور کھجور رہ جاتے ہیں' حق تعالیٰ ان کی کوئی پروا نہیں کرے گا"۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من قلوب العباد ولکن یقبضہ بقبض العلماء۔ حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جھالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔

"بیشک اللہ تعالیٰ اس علم کو اس طرح قبض نہیں کرے گا کہ بندوں کے سینوں سے چھین لے بلکہ قبض علم کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ علماء کو اٹھاتا رہے گا' یہاں تک کہ جب ایک عالم بھی باقی نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے' ان سے سوالات ہوں گے وہ بغیر جانے بوجھے فتوے دیں گے' خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے"۔

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بقائے انسانیت کا مدار دو چیزوں پر ہے' علم صحیح اور عمل صالح۔

یہ دونوں چیزیں انسانیت کے بنیادی جوہر ہیں' اور ان دونوں کی موت درحقیقت انسانیت کی موت ہے جو حضرات علم و عمل کے جامع اور انسانیت کے اعلیٰ نمونہ ہیں' ان کے بتدریج اٹھتے چلے جانے سے یہ دونوں چیزیں اٹھتی جارہی ہیں اور انسانیت بتدریج دم توڑ رہی ہے کسی زمانے میں کافروں سے جو اخلاقی نمونے دیکھنے میں آتے تھے' اب وہ مسلمانوں میں بھی بمشکل نظر آتے ہیں' نصف صدی پہلے کے فاسق وفاجر جس بلندی کردار کا مظاہرہ کرتے تھے' وہ آج کے بہت سے "صالحین" میں مفقود ہے' اور کچھ عرصہ پہلے کے امی اور جاہل خدا ترسی ودین شعاری کا جو نمونہ پیش کرتے تھے ' وہ آج کے اہل علم ودانش کے یہاں عنقا ہے۔

جس طرح انسانوں کی جسمانی صحت نسلاً بعد نسل کمزور ہوتی جارہی ہے اسی طرح اخلاقی صحت بھی دن بدن روبہ زوال ہے' آج کل عام طور پر انسان' انسان نہیں' انسانیت کی چلتی پھرتی لاشیں ہیں' جو حیات مستعار کا بار کندھوں پر اٹھائے پھر رہی ہیں اور فضائے بسیط کو اپنے تعفن سے مسموم کررہی ہے۔

نیستند آدم خلاف آدم اند
ایں بہائم در غلاف آدم اند

اجل مسمّٰی (موت) کا ہاتھ انسانیت کے دستر خوان سے قیمتی دانوں کو بتدریج اٹھاتا جارہا ہے اور اب انسانیت کے ڈھیر میں خال خال حضرات ایسے نظر آتے ہیں جو انسانیت کے اخلاقی جوہر کے امین ہوں' جن کے علم پر اعتماد کیا جاسکے' جن کا عمل امت کے لئے نمونہ بنے' اور جن کے سیرت وکردار کو دیکھ کر انسانی سیرت کی نوک پلک درست کی جائے۔

ان اکابر کے سانحۂ ارتحال کا ایک المناک پہلو یہ ہے کہ امت ان فیوض وبرکات سے محروم ہوجاتی ہے جن کا تعلق ان کی ذات سے ہوتا ہے' ان کی دعائے نیم شبی' بارگاہ خداوندی میں ان کی گریہ وزاری' پوری امت کے لئے ان کا سراپا سوزوگداز صلاح امت کی فکر اور لگن' یہ چیزیں ان کی ذات کے ساتھ ہی رخصت ہوجاتی ہیں اور امت کے لئے اس نقصان کی کوئی تلافی ناممکن ہوجاتی ہے۔

علاوہ ازیں ہر بزرگ کے ساتھ تعلق مع اللہ کی ایک نسبت قائم ہوتی ہے' جو امت میں قبول حق کی ایک خاص استعداد پیدا کرتی ہے اس نسبت کے ختم ہوجانے کے بعد قبول حق کی استعداد کا رنگ وہ نہیں رہتا ہے جو پہلے تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذات اقدس کی صحبت ومعیت کی وجہ سے ایمان ویقین کا جو نقشہ تھا نزول وحی کے مشاہدہ سے جو کیفیت حاصل ہوتی تھی' جبرئیل علیہ السلام کی آمد سے جو ملکوتی اثرات قلوب پر نازل ہوتے تھے اور اس کی وجہ سے تعلق مع اللہ کی جو نسبت قائم ہوتی تھی دور نبوت کے بعد اسے آخر کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

وما نفضنا ایدینا من التراب الا انکرنا قلوبنا

"ہم ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن سے فارغ بھی نہ ہوپائے تھے کہ ہمارے قلوب کی وہ کیفیت باقی نہ رہی"۔

غروب آفتاب کے بعد آپ روشنی کے ہزاروں وسائل جمع کرلیں' مگر وہ روشنی اور حرارت جو وجود آفتاب سے حاصل ہوتی ہے' کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتی' اسی طرح خلافت راشدہ کے چاروں ادوار میں نسبت مع اللہ کا رنگ بدلتا رہا' دور صدیقی کی برکات کبھی واپس نہ آسکیں نہ دور فاروقی کی نسبت کو واپس لیا جاسکا۔

فرض کیجئے ایک مکان میں بے شمار قمقمے روشن ہیں' جو اپنی تابانی اور ضیا پاشی میں مختلف ہیں اگر ان کو یکے بعد دیگرے گل کردیا جائے تو تدریجاً روشنی مدہم ہوتے ہوتے یکسر ختم ہوجائے گی اور پورے ماحول پر تاریکی کے مہیب سائے منڈلانے لگیں گے' اسی طرح اہل اللہ کا وجود اس کائنات کے لئے رشد وہدایت کی قندیل ہے' جوں جوں اہل اللہ اس عالم سے روپوش ہوتے جارہے ہیں' ہدایت کا نور مدہم پڑتا جارہا ہے اور آہستہ آہستہ یہ کائنات کفر وضلالت کی تاریکیوں کی لپیٹ میں آتی جارہی ہے' اور قلوب سے نور یقین گھٹتا جارہا ہے اور جب رشد وہدایت کی ایک بھی شمع باقی نہیں رہے گی اور ہرچہار جانب سے تاریکی چھا جائے گی تو اس عالم کی بساط کو لپیٹ دیا جائے گا۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:۔

لاتقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللہ اللہ لاتقوم الساعۃ الا علی شرار الخلق۔

"قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہا جاتا ہے۔ قیامت اس وقت قائم ہوگی جب کہ صرف شریر لوگ باقی رہ جائیں گے"۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے مقصود صرف یاس اور حسرت کے آنسو بہانا نہیں' بلکہ اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ جتنے باخدا بزرگ موجود ہیں ان کے وجود کو غنیمت سمجھ کر زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کی جائے۔ افسوس ہے کہ دنیا میں فتنوں پر فتنے بڑھتے جارہے ہیں' اور جن حضرات کا وجود ان فتنوں کے لئے سد راہ تھا وہ بتدریج اٹھتے جارہے ہیں۔

حق تعالیٰ کے مقبول بندوں کو مرنے کا غم نہیں' وہ تو مرنے کی خوشی میں جیتے ہیں' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

تحفۃ المؤمن الموت

"مومن کا تحفہ موت ہے"۔

ان کی زندگی کا ایک ایک دن موت کے انتظار میں کٹتا ہے موت کا دن ان کے لئے فرح وانبساط اور خوشی اور مسرت کا دن ہوتا ہے' ان کے نزدیک موت ہی وہ پل ہے جسے عبور کرکے وہ اپنے محبوب حقیقی تک پہنچ سکتے ہیں' وہ اسی مقصد کے لئے جیتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسہ هواها وتمنّٰی علی اللّٰہ۔

"دانا وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے تیاری کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے دوڑائے اور اللہ پر جھوٹی آرزوئیں باندھے"۔

وصلی اللّٰہ علی صفوۃ البریۃ سید الکائنات
وخاتم النبیین' محمد وآلہ واصحابہ
اجمعین

(بینات شوال ۱۳۹۰ھ)

حضرت بنوری رحمہ اللہ

آج کا دن پاکستان کی علمی ودینی تاریخ میں ایک المناک سانحہ اور جاں گداز المیہ کی حیثیت سے یادگار رہے گا۔ آج اقلیم علم کا تاجدار، مسند ولایت کا صدر نشین، گلشن دین کا باغبان، حریم نبوت کا پاسبان، ولی اللٰہی سلسلہ کا امین، قاسمی حکمت کا رازدان، انوری علوم و معارف کا وارث، علم ومعرفت کا بحر مواج، اسرار شریعت کا نکتہ رس، شجرہ سیادت کا گل سرسبد، سید زکریاؒ کا لخت جگر، شیخ آدم بنوریؒ کی آنکھ کا تارا حسینی خانوادہ کا چشم وچراغ، دودمان نبوت کا چاند اور سیادت وقیادت کا آفتاب دنیا کے افق سے غائب ہوگیا۔ ہمارے شیخ السید الامام محمد یوسف البنوری الحسینی رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

موت کوئی اچنبھا چیز نہیں کہ اس پر حیرت وتعجب کا اظہار کیا جائے۔ یہ سنت بنی آدم ہے، یہاں کا آنا ہی جانے کی تمہید ہے یہاں جو بھی آیا جانے کے لئے آیا، سرائے عالم کا ہر مسافر منزل عدم کا راہ نورد ہے۔

لہ ملک ینادی کل یوم
لدوا للموت وابنوا للخراب

موت کے قانون سے نہ کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ ولی، نہ عالم نہ جاہل، نہ نیک نہ بد، نہ مومن نہ کافر، نہ شاہ نہ گدا، اپنے اپنے وقت پر سب ہی گئے اور سب ہی کو جانا ہے، لیکن جانے والوں میں کچھ ایسے خوش بخت بھی ہوتے ہیں کہ زندگی ان کے نقش پا سے راستے ڈھونڈتی ہے، قومیں ان کے نور سے روشنی پاتی ہیں، انسانیت ان سے غازۂ حسن مستعار لیتی ہے، شرافت ان پر ناز کرتی ہے، محبوبیت انہیں دیکھ دیکھ کر اپنی کاکل وگیسو سنوارتی ہے، ایوان علم ان کے بہار آفریں وجود سے گل ولالہ بن جاتا ہے، مجروح قلوب ان کے

انفاس سے مرہم شفا پاتے ہیں' بے کس و درماندہ افراد ان کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے ہیں' وہ شمع کی مانند خود پگھلتے ہیں مگر مخلوق خدا پر ضوفشانی کرتے ہیں' خود جلتے ہیں مگر دوسروں کو جلا بخشتے ہیں' خود بے چین و بے قرار رہ کر دوسروں کو راحت و سکون عطا کرتے ہیں۔ ان کے آئینۂ رخ زیبا میں یاد خدا کی تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ (اذا رؤوا ذکر اللہ) ان کی دید دل کو سرور اور آنکھوں کو نور عطا کرتی ہے' ان کی محفل سکینت جنت کا نمونہ پیش کرتی ہے' وہ خاموش ہوں تو ہیبت و وقار پرا باندھے پہرہ دیتے ہیں' بات کریں تو موتی رولتے ہیں' مسکرائیں تو پھول برساتے ہیں' ناز کریں تو آسمان سے صدائے لبیک آتی ہے' گڑگڑائیں تو عرش الٰہی کانپ جاتا ہے۔ دنیا سے یہ بھی جاتے ہیں مگر اس شان سے جاتے ہیں کہ ہر چہار سو صف ماتم بچھ جاتی ہے' آسمان و زمین نوحہ کرتے ہیں' انسانیت کا پرچم سرنگوں ہوجاتا ہے' زمانہ تاریخ کی کروٹ بدل دیتا ہے اور قصر ملت میں زلزلہ آجاتا ہے۔ ہمارے شیخ "چلے گئے' لیکن آہ! ملت کا صبر و سکون بھی ساتھ لے گئے۔ آج کون اشکبار نہیں؟ کون دل فگار نہیں؟ مدرسہ میں کہرام ہے کہ اس کے محبوب بانی چپکے سے چلے گئے' دارالحدیث کے درودیوار پکار رہے ہیں کہ شیخ بنوری کے لحن میں قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سحر آفریں آواز آتی تھی' بند ہوگئی۔ "مجلس تحفظ ختم نبوت" اپنی یتیمی پر نوحہ کناں ہے کہ اس کے امیر و قافلہ سالار بچھڑ گئے۔ مدارس عربیہ کی تنظیم "وفاق المدارس" میں گھر گھر ماتم ہے کہ اس کے بانی و صدر رخصت ہوگئے' اسلامی نظریاتی کونسل پر سکوت مرگ طاری ہے کہ اس کی روح رواں نکل گئی۔ اہل قلوب مضطرب ہیں کہ ع ' جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"۔

اہل نظر تصویر حیرت ہیں کہ متاع دین و دانش لٹ گئی' علماء مبہوت ہیں کہ علم و فقاہت کی بساط الٹ گئی۔ دانشوروں کو غم ہے کہ فضیلت و سیادت کی مسند خالی ہوگئی۔ اہل حق سراسیمہ ہیں کہ ان کی ڈھال چھن گئی۔ یتیموں اور بے کسوں کو صدمہ ہے کہ ان کا مشفق و مربی اٹھ گیا۔ عالم اسلام مغموم ہے کہ ملت ایک دیدہ ور راہنما سے محروم ہوگئی۔

ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیئ عندہ باجل مسمّٰی۔

حق تعالیٰ شانہ نے حضرت شیخ قدس سرہ کو اس قدر ظاہری و باطنی کمالات سے نوازا اور اتنی خوبیوں سے آراستہ فرمایا تھا کہ نہ تو ان کا صحیح ادراک ہوسکتا ہے نہ ان کے لئے

مناسب الفاظ و تعبیرات مل سکتی ہیں۔ عام لوگ انہیں اخباری اصطلاح میں بس ایک "ممتاز عالم دین" اور "عظیم راہنمائے ملت" کی حیثیت سے جانتے تھے عرب دنیاان کی عربیت فصاحت وبلاغت اور وسعت معلومات کا لوہا مانتی تھی، اہل علم ان کے فضل و کمال ان کے تدین و تقویٰ، ان کے اخلاص و عزیمت، اور ان کی شہامت و نجابت کے معترف تھے، حکام ان کی حمیت و غیرت، ان کی جرأت و استقامت اور ان کی حق گوئی و بے باکی سے خائف تھے، اہل زیغ، ملاحدہ وزنادقہ ان کی ضرب یداللّٰہی سے لرزاں تھے، طلبہ ان کے حدیثی و تفسیری، فقہی وکلامی معارف وافادات پر سردھنتے تھے، احباب ان کے حسن صورت، حسن سیرت، حسن مصاحبت، حسن معاشرت، حسن تکلم، حسن تبسم پر گردیدہ تھے، مگر سچی بات یہ ہے کہ

خوبی ہمیں کرشمہ وناز وخرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

حضرت قدس سرہ کی ایک ایک ادا اپنے اندر "بسیار شیوہ ہا" رکھتی تھی، ان کی ایک ایک جنبش لب بجلیاں گراتی تھی، ان کا ایک ایک نقش پا جادۂ استقامت کی نشاندہی کرتا تھا۔

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم

حضرت قدس سرہ علم کا خزانہ تھے، عمل کا نمونہ تھے، عاقل و فہیم تھے، ذکی ولبیب تھے، عابد وزاہد تھے، متقی وپرہیز گار تھے، جری وبہادر تھے، نڈر حق گو تھے، فیاض اور سخی تھے۔ انہیں جو کچھ ملا تھا موہبت خداوندی سے ملا تھا اور ان کے تنہا وجود میں اس قدر فوق العادت اوصاف وکمالات قدرت نے جمع کردیئے تھے کہ ایک بڑی جماعت پر تقسیم کردیئے جائیں تو محاسن سے مالا مال ہوجائے۔

حضرت شیخ کو حق تعالیٰ نے عبدیت و محبوبیت کا بلند ترین مقام عطا فرمایا تھا، اور صحیح بخاری شریف کی حدیث ثم یوضع له القبول فی الارض کے مطابق ان کی یہ محبوبیت عطیۂ آسمانی تھا۔ وہ ہر محفل میں "چراغ محفل" ہوتے، خواہ یہ محفل بادشاہوں کی ہوتی یا درویشوں کی، طلباء کی یا دانشوروں کی، عربوں کی یا عجمیوں کی، احباب کی یا اغیار کی، وہ سب پر بھاری نظر آتے۔

مناسب الفاظ و تعبیرات مل سکتی ہیں۔ عام لوگ انہیں اخباری اصطلاح میں بس ایک "ممتاز عالم دین" اور "عظیم راہنمائے ملت" کی حیثیت سے جانتے تھے عرب دنیا ان کی عربیت، فصاحت وبلاغت اور وسعت معلومات کا لوہا مانتی تھی، اہل علم ان کے فضل و کمال ان کے تدین و تقویٰ، ان کے اخلاص و عزیمت اور ان کی شہامت و نجابت کے معترف تھے، حکام ان کی حمیت، و غیرت، ان کی جرأت و استقامت اور ان کی حق گوئی و بے باکی سے خائف تھے، اہل زیغ، ملاحدہ وزنادقہ ان کی ضرب یداللّٰہی سے لرزاں تھے، طلبہ ان کے حدیثی و تفسیری، فقہی وکلامی معارف وافادات پر سر دھنتے تھے، احباب ان کے حسن صورت، حسن سیرت، حسن مصاحبت، حسن معاشرت، حسن تکلم، حسن تبسم پر گرویدہ تھے، مگر سچی بات یہ ہے کہ

خوبی ہمیں کرشمہ وناز وخرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

حضرت قدس سرہٗ کی ایک ایک ادا اپنے اندر "بسیار شیوہ ہا" رکھتی تھی، ان کی ایک ایک جنبش لب بجلیاں گراتی تھی، ان کا ایک ایک نقش پا جادۂ استقامت کی نشاندہی کرتا تھا۔

ع ذھب الذین یعاش فی اکنافھم

حضرت قدس سرہٗ علم کا خزانہ تھے، عمل کا نمونہ تھے، عاقل وفہیم تھے، ذکی ولبیب تھے، عابد وزاہد تھے، متقی وپرہیزگار تھے، جری وبہادر تھے، نڈر حق گو تھے، فیاض اور سخی تھے۔ انہیں جو کچھ ملا تھا موہبت خداوندی سے ملا تھا اور ان کے تنہا وجود میں اس قدر فوق العادت اوصاف وکمالات قدرت نے جمع کردیئے تھے کہ ایک بڑی جماعت پر تقسیم کردیئے جائیں تو محاسن سے مالا مال ہوجائے۔

حضرت شیخؒ کو حق تعالیٰ نے عبدیت و محبوبیت کا بلند ترین مقام عطا فرمایا تھا، اور صحیح بخاری شریف کی حدیث ثم یوضع لہ القبول فی الارض کے مطابق ان کی یہ محبوبیت عطیۂ آسمانی تھا۔ وہ ہر محفل میں "چراغ محفل" ہوتے، خواہ یہ محفل بادشاہوں کی ہوتی یا درویشوں کی، طلباء کی یا دانشوروں کی، عربوں کی یا عجمیوں کی، احباب کی یا اغیار کی، وہ سب پر بھاری نظر آتے۔

انہیں بڑے قد آور بادشاہوں اور سربراہان مملکت سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ لوگوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں تک سے باتیں کرتے دیکھا' مگر ان کی صولت و شوکت' ان کی زیبائی و رعنائی' ان کے حسن و جمال' ان کے جاہ و جلال' ان کے حلم و وقار کا رنگ ہر جگہ یکساں نظر آیا۔ ان کی محبوبیت ہر جگہ نمایاں جھلکتی نظر آئی۔ انہیں اپنے اللہ پر بڑا اعتماد تھا' بڑا ناز تھا۔ یقین و توکل ایسا تھا گویا وہ لوح محفوظ سے ابھی ابھی پروانہ لے کر آئے ہیں۔ انہیں اسباب و وسائل کی پرواہ نہیں تھی' وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے اور خدا کے بھروسے پر کرتے تھے۔ حضرت قدس سرہ کا یہ فقرہ آج بھی بہت سے لوگوں کے کانوں میں گونج رہا ہوگا کہ "زمین و آسمان کے خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں' اگر ہم اخلاص کے ساتھ اس کے دین کا کام کریں تو اس کے خزانوں میں کیا کمی ہے؟"۔

وہ جس کام کا ارادہ کرتے اس کے لئے استخارے کرتے' دعائیں کرتے' غلاف کعبہ پکڑ کر گڑگڑاتے' روضۂ رسول کی جالیوں کے سامنے حق تعالیٰ سے التجائیں کرتے' اہل قلوب سے دعائیں کراتے' معاملہ فہم مخلصین سے مشورے کرتے' ان دعاؤں اور استخاروں کا سلسلہ بسا اوقات مہینوں تک چلتا' اور جب پوری طرح اطمینان ہو جاتا کہ اس میں نفسانی خواہش کا کوئی شائبہ نہیں تو توکل برخدا اسے شروع کر دیتے' اور پھر نتائج سے بے نیاز ہو کر اس پر اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتے۔ چنانچہ "مدرسہ عربیہ اسلامیہ" کا قیام اسی نہج پر ہوا اور اس راستے میں جو مشکلات پیش آئیں' جو مجاہدے کئے اور صبر و عزیمت سے ناموافق حالات کا جس طرح مردانہ وار مقابلہ کیا وہ ایک مستقل باب ہے۔

آج بحمد اللہ یہ مدرسہ حضرت کے اخلاص کی برکت سے **اصلها ثابت وفرعها في السماء** کا منظر پیش کر رہا ہے' مدرسہ کے بجائے یونیورسٹی بن چکا ہے۔ لیکن حضرت نے نہ اس کا کبھی کوئی اشتہار دیا' نہ کوئی سفیر بھیجا' نہ کبھی اپنے طرز عمل سے یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس مدرسہ کے بانی' شیخ الحدیث یا "بڑے" مولانا ہیں۔ بارہا فرمایا کرتے تھے: "یہاں کوئی حضرت نہیں' نہ کوئی بڑا چھوٹا ہے' ہم سب اللہ تعالیٰ کے دین کے خادم ہیں' اللہ تعالیٰ کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے مل کر کام کرنا ہے' اگر اخلاص ہو تو مدرسہ کی درس گاہیں صاف کرنے والا چپراسی اور بخاری پڑھانے والا برابر ہیں"۔

حضرت قدس سرہ کو نمود و نمائش اور طلب شہرت سے طبعاً نفرت تھی' مال و جاہ کے مریض کا ان کے ساتھ جوڑ نہیں بیٹھتا تھا' وہ جماعتوں کی صدارتوں اور امارتوں کے

عہدوں سے بہت بلند وبالا تھے' دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا عہدہ بھی ان کے شرف و مجد میں اضافہ نہیں کرتا تھا' بلکہ خود ان عہدوں کا آپ کے وجود سے مشرف ہونا ان کے لئے مایۂ صد افتخار تھا' وہ کسی عہدے کے خواستگار نہیں' بلکہ عہدے ان کے متلاشی تھے' ۱۹۷۴ء میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی امارت کے لئے آپ کو منتخب کیا گیا' جاننے والے جانتے ہیں کہ کتنی منتوں سماجتوں' کتنے استخاروں' دعاؤں اور مشوروں کے بعد آپ نے یہ منصب قبول فرمایا۔ ابھی "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی امارت قبول کئے آپ کو چند مہینے نہیں گذرے تھے کہ ربوہ اسٹیشن کا سانحہ پیش آیا' جس کے نتیجے میں ملک گیر تحریک چلی اور اس نے غیر معمولی شکل اختیار کرلی اس کی قیادت کے لئے تمام جماعتوں پر مشتمل "مجلس عمل ختم نبوت" تشکیل پائی تو باصرار اس کی صدارت کے لئے آپ کو منتخب کیا گیا' حضرت قدس سرہٗ نے اس تحریک کے دوران جس تدبر و فراست' جس اخلاص و للّٰہیت' جس صبر و استقامت اور جس ایثار و قربانی سے ملّی قیادت کے فرائض انجام دیئے وہ ہماری تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ ان دنوں حضرتؒ پر سوز و گداز کی جو کیفیت طاری رہتی تھی وہ الفاظ کے جامۂ تنگ میں نہیں سما سکتی۔ تحریک کے دنوں میں جو آخری سفر حضرتؒ نے کراچی سے ملتان' لاہور پنڈی' پشاور تک کیا اس کی یاد کبھی نہیں بھولے گی۔ کراچی سے رخصت ہوئے تو حضرتؒ پر بے حد رقت طاری تھی اور جناب مفتی ولی حسن صاحب سے فرمارہے تھے: "مفتی صاحب دعا کیجئے! حق تعالیٰ شانہٗ کامیابی عطا فرمائیں۔ میں کفن ساتھ لے جارہا ہوں مسئلہ حل ہوگیا تو الحمد للہ' ورنہ شاید بنوری زندہ واپس نہیں آئے گا"۔ حق تعالیٰ نے آپ کے سوز دروں کی لاج رکھی اور ...... قادیانی ناسور کو جسد ملت سے کاٹ کر جدا کردیا۔

حضرتؒ کے اخلاص و للّٰہیت' بے لوثی و بے غرضی اور بے نفسی و فروتنی کا ثمرہ تھا کہ یہ بے تاج بادشاہ کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکمرانی کررہا تھا اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا۔ آپ نے اپنے آپ کو جتنا مٹایا اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی اٹھایا' جس قدر اپنی پستی و فروتنی کا اقرار کیا حق تعالیٰ نے اسی قدر رفعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار کیا۔ سچ ہے: من تواضع للہ رفعہ اللہ۔ فوق العادت اخلاص و تواضع کے ساتھ ساتھ آپ کی خودداری و استغنا کی شان بھی نرالی تھی۔ جن دنوں ٹنڈو اللہ یار کے مدرسہ سے تعلق منقطع کرچکے تھے اور ابھی تک آئندہ کا لائحہ عمل تجویز نہیں

ہوا تھا' یہ دور آپ کی بے کسی اور کسمپرسی کا کربناک دور تھا۔ انہی دنوں کراچی میں ایک صاحب نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) آپ سے فرمائش کی ایک مدرسہ بنایئے' اپنے ساتھ ایک استاذ اور رکھ لیجئے' آپ دونوں صاحبوں کی سال بھر کی تنخواہ کی رقم میں آپ کے نام پر بینک میں جمع کرا دیتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا "سال کے بعد کیا ہوگا؟ بولے ایک سال تک چندہ آنے لگے گا اور مدرسہ چل نکلے گا' آپ نے فرمایا "شکریہ! میں ایسا مدرسہ نہیں بنانا چاہتا جس کی بنیاد مخلوق کے بھروسے پر رکھی گئی ہو' جب مدرسہ بنے گا تو آپ کا بھی جی چاہے تو چندہ دیجئے' پیشگی رقم جمع کرا کے مدرسہ شروع کرنا مجھے گوارا نہیں"

—— ایک صاحب نے کئی ہزار روپیہ حضرت کو زکوٰۃ کی مد میں پیش کرنا چاہا' آپ نے فرمایا کہ زکواۃ تو ہم صرف مستحق طلبہ پر خرچ کرتے ہیں۔ مدرسہ کے دیگر اخراجات میں زکواۃ صرف نہیں ہوتی۔ اس کے لئے عطیات کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ طلباء کی ضرورت کے بقدر رقم جمع ہو چکی ہے اس لئے اگر دینا ہے تو زکوٰۃ نہ دیجئے' عطیہ دیجئے' وہ صاحب کہنے لگے کہ اس کی تو گنجائش نہیں' فرمایا پھر زکوٰۃ کی ہمیں ضرورت نہیں' بولے' یہ روپیہ آئندہ سال طلبہ کے کام آئے گا۔ فرمایا' آئندہ سال آئے گا تو اللہ تعالٰی اس کا خرچ بھی بھیج دیں گے۔

۱۹۷۴ء کی تحریک بالکل آخری مرحلہ میں تھی' بھٹو حکومت کے ایک رکن رکین نے حضرت قدس سرہٗ کو پیغام بھجوایا کہ "قائد عوام آپ سے ملنا چاہتے ہیں' جواب دیا "۷ ستمبر کے بعد ملیں گے"۔

جود و کرم اور سخاوت و فیاضی تو سلالۂ نبوت کا خاندانی طغرائے امتیاز ہے' ہمارے شیخ قدس سرہ' کی فیاضی دیکھ کر فرزدق کا شعر یاد آتا تھا جو آپ کے جد امجد سیدنا علی بن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہما کے بارے میں اس کے مشہور قصیدے میں ہے:۔

ماقال لاقط الا فی تشہدہ
لولا التشھد کانت لاؤہ نعم

آپ کے ایک نیاز مند حج پر جا رہے تھے' حضرت نے تنہائی میں بلا کر انہیں بہت سی نصیحتیں فرمائیں' کچھ مسائل سمجھائے' اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا "وہاں خرچ میں تنگی نہ کرنا' میں وہاں بہت امیر ہوتا ہوں' جتنی رقم کی ضرورت ہو بلا تکلف مجھ سے لے لینا"۔

میرے ایک محترم دوست کراچی تشریف لائے' میں نے آنے کا سبب پوچھا تو بتایا کہ مدرسہ کے لئے کچھ زمین خریدلی تھی اس کا کچھ قرض ہوگیا ہے' یہاں کچھ احباب سے ملیں گے۔ میں نے نماز عصر سے فراغت کے بعد مسجد ہی میں حضرت ؒ سے ان کا تعارف کرایا' کراچی آنے کی وجہ دریافت کی تو میں نے بلا تکلف ان کا قصہ دہرادیا' بے ساختہ فرمایا کہ ایک ہزار روپیہ ہم دے دیں گے' اگلے دن صبح مجھے بلایا اور ہزار روپے میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا' "رسید کی ضرورت نہیں ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے"۔

تصوف وسلوک اور مجاہدہ وریاضت کا کوچہ حضرت شیخ آدم بنوری ؒ کی اولاد کے لئے اجنبی نہیں' اس راستے میں بادیہ پیمائی و آبلہ پائی اس خانوادہ کا موروثی پیشہ رہا ہے اور پھر ہمارے حضرت شیخ قدس سرہٗ تو ع "کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی" کا مصداق تھے۔ آپ نے عنفوانِ شباب میں اپنے وطن میں سلسلہ مجددیہ کے ایک شیخ سے تعلق ارادت قائم کیا۔ اور مجاہدہ ومراقبہ کی منزلیں اس سرعت سے طے کیں کہ بہت جلد لطائف جاری ہوگئے' اور آپ کی ہر رگ وپے سے ذکر کی آواز آنے لگی۔ پھر جب پہلے حج پر تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شفیع الدین نگینوی مہاجر مکی قدس سرہٗ (خلیفہ مجاز قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ) سے بیعت کی' اور اجازت سے مشرف ہوئے' بعد ازاں حضرت حکیم الامت تھانوی ؒ اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ سے بھی مدت تک مستفید ہوئے' اور حضرت حکیم الامت ؒ نے آپ کو "مجازین صحبت" میں شامل فرمایا۔

حضرت مدنی ؒ قدس سرہٗ سے غایت درجہ کی عقیدت وارادت تھی' اور ان کے بے حد مداح تھے' ہمارے ملک پر جو آفات وبلیات کا نزول متواتر ہو رہا ہے اس کا باطنی سبب حضرت کے نزدیک یہ تھا کہ لوگوں نے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی بڑی توہین کی ہے اور انہیں ایذائیں پہنچائیں' جب تک اس جرم سے توبہ نہ کی جائے اور اس کی معافی بارگاہ قدس نے نہ مل جائے تب تک اصلاح احوال کی کوئی صورت نہیں۔

حضرت کی تعمیر شخصیت میں سب سے بڑا حصہ ان کے شیخ امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری ؒ کا تھا۔ حضرت کشمیری ؒ سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔ بہت سے بزرگوں کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا' بعض حضرات نے ان سے پانچ پانچ بار صحیح بخاری کا درس لیا لیکن جس نے شیخ انور ؒ کے علوم وافادات ہی کو نہیں' ان کی پوری شخصیت کو

اپنے اندر جذوب کرلیا تھا وہ صرف حضرت بنوری قدس سرہٗ کی ذات گرامی تھی۔ حضرتؒ کو اپنے شیخ امام العصر سے صرف عقیدت نہیں تھی بلکہ عشق تھا اور ایسا عشق جس کا جوش پیرانہ سالی میں جوان رہا بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اسی عشق نے ان کے قلم زیب رقم سے "نفحۃ العنبر" ایسی علمی وادبی کتاب لکھوائی جسے نہ صرف علمائے دیوبند (حضرت مفتی کفایت اللہؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسے اکابر) نے خراج تحسین پیش کیا بلکہ علمائے عرب نے بھی اس کی ادبیت اور فصاحت وبلاغت کے سامنے سرنیاز خم کیا اور اس کی عربیت کو حافظ کی زبان کے ہم رنگ قرار دیا ہے' ایک چوٹی کے عالم نے آپ کو لکھا تھا۔ **"یا شیخ قرأت کتابک' فسجلت لبیانک"۔**

حضرت قدس سرہٗ اس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ مصر کے ایک بہت بڑے عالم نے (جو اس وقت تک حضرتؒ سے بالمشافہ متعارف نہیں تھے) خود آپ کے سامنے اس رائے کا اظہار کیا کہ ان کے خیال میں سرزمین ہند میں انور شاہؒ سے بڑا عالم پیدا نہیں ہوا اور یہ کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔ حضرت نے ان کے اس فیصلے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ انور شاہؒ کی سوانح "نفحۃ العنبر" کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ "یہ تو آپ کا یک طرفہ فیصلہ ہوا' جس قلم نے شیخ انور شاہؒ کی سوانح لکھی ہے اگر اسی نے شاہ عبدالعزیزؒ کی سوانح بھی لکھی ہوتی اور آپ نے دونوں کے مطالعہ کے بعد ان دونوں شخصیتوں کا موازنہ کرکے یہ فیصلہ کیا ہوتا تو آپ کا فیصلہ محققانہ کہلاتا' مگر افسوس ہے کہ جس قلم نے انور شاہؒ کی سوانح لکھی اس نے شاہ عبدالعزیزؒ کی سوانح نہیں لکھی"۔ اس کے بعد فرمایا:

> یا شیخ اتدری من تفاوض؟ انت تفاوض صاحب النفحۃ۔
> جناب کو معلوم ہے کہ آپ کس سے گفتگو کررہے ہیں؟ آپ کا مخاطب خود "نفحۃ العنبر" کا مصنف ہے۔

یہ سننا تھا کہ وہ آپ سے لپٹ گئے اور آپ کے سحر آفرین قلم سے بڑھ کر آپ کی نکتہ رسی' مرتبہ شناسی اور حاضر جوابی کی داد دینے لگے۔

حضرت قدس سرہٗ کی محفل میں آپ کے شیخ امام العصر نور اللہ مرقدہٗ کا ذکر چھڑ جاتا

(اور اس کے لئے معمولی تقریب یا مناسبت کافی ہوتی تھی) تو حضرتؒ پر ایک وجد اور وارفتگی کی کیفیت طاری ہوجاتی اور حضرت شاہ صاحبؒ کے کمالات اور ان کے اوصاف واخلاق کا گھنٹوں تذکرہ کرتے۔ شیخ کے ارشادات من وعن ان کے لب ولہجہ میں نقل کرکے فرماتے: **واللہ ھذا لفظہ۔ واللہ ھذا لفظہ۔**

قیس عامری کے بارے میں جو عارف رومیؒ نے فرمایا ہے:

گفت مشق اسم لیلیٰ می کنم
خاطر خود را تسلی می دہم

"مشق اسم لیلیٰ" سے مجنون کے دل کی تسلی واقعۃً ہوتی تھی یا نہیں؟ لیکن ہم نے دیکھا کہ انور شاہؒ کے تذکار سے حضرت بنوریؒ کے سوز جگر میں اور اضافہ ہوجاتا' آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑتے' چہرۂ انور پر بے خودی وبے کلی کی کیفیت طاری ہوجاتی اور بے اختیار فرماتے: **واللہ لم یر مثلہ' ولم یر ھو مثل نفسہ۔** اور کبھی فرماتے: **واللہ کان و کان** (اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا تذکرہ شروع ہوجاتا' ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے خطاب کرتے ہوئے ام المومنین خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: **یا عائشہ! واللہ کانت و کانت۔** اس پر حضرتؒ فرماتے "کیسا غضب کا فقرہ ہے"۔)

حضرت شاہ صاحبؒ کے ملنے والے اور دیکھنے والوں میں سے کوئی مل جاتا تو اس سے سب سے پہلی فرمائش یہی ہوتی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی کچھ باتیں سنایئے۔ فرماتے تھے ایک بار خطیب العصر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ڈابھیل تشریف لائے۔ میں نے ان سے فرمائش کی کچھ شاہ صاحبؒ کا تذکرہ ہوجائے انہوں نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں فرمایا: "بھائی یوسف! کیا پوچھتے ہو' صحابہؓ کا قافلہ جارہا تھا' پیچھے رہ گئے"۔ میں نے کہا **حسبک یا عطاء اللہ!**

ایک بار لاہور تشریف لے گئے تو مولانا عبید اللہ انورؒ سے دریافت فرمانے لگے' "حضرت لاہوریؒ سے حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں کیا سنا؟"۔ اسی عشق ومحبت اور اسی ربط وتعلق نے آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم وانفاس کا وارث اور ان کا صحیح جانشین بنادیا تھا' حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا آپ کے لوح

قلب پر کندہ تھی۔ ۴۵ برس پہلے کے واقعات اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات اس طرح سنایا کرتے تھے گویا ابھی ابھی شاہ صاحبؒ مجلس سے اٹھ کر گئے ہیں۔ استاذ شاگرد کے تعلق کی بہت سی داستانیں لوگوں نے سنیں ہوں گی۔ لیکن حضرت شیخ کو جو تعلق اپنے شیخ امام العصرؒ سے تھا اس کی مثال نہ دیکھی' نہ سنی۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کو دیکھ کر یہ یقین مشاہدہ میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ سیدنا حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار شاگردوں (صحابہ کرامؓ) نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو' آپ کی اداؤں کو اور آپؐ کے لب ولہجہ کو کس طرح یاد رکھا ہوگا' اور پھر کس طرح من وعن امت تک پہنچایا ہوگا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا تذکرہ کچھ ایسے انداز میں فرماتے کہ گویا ان کے نزدیک دنیا میں بس ایک ہی عالم پیدا ہوا جسے انور شاہؒ کہتے ہیں۔ مگر اس عشق وتعلق اور فرط عقیدت کے باوجود حضرت قدس سرہ کے یہاں فرق مراتب پوری طرح ملحوظ رہتا تھا۔ حضرت سے کئی بار سنا کہ "جب حضرت شیخ الہندؒ کے مقام پر نظر کرتا ہوں تو انور شاہؒ صفر نظر آتے ہیں' اور جب حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے مقام پر نظر کرتا ہوں تو حضرت شیخ الہندؒ صفر نظر آتے ہیں"۔ (قدس اللہ اسرارہم)

اس ارشاد سے نہ صرف حضرتؒ کی مردم شناسی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ حضرات متقدمین کے مقابلے میں متاخرین کے علوم کی کیا حقیقت ہے؟ اس میں کیا شک ہے کہ علم کا یہ بحر محیط ہے جسے بنوریؒ کہا جاتا ہے اپنے شیخ ؒ کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا' اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد کی علمی دنیا سید بنوریؒ کے مقابلے میں صفر نظر آئے گی۔ الا ماشاء اللہ۔ اور یہ وہی حقیقت ہے جسے صحیح بخاری شریف کی حدیث: ولکن یقبضہ بقبض العلماء میں بیان فرمایا گیا ہے۔

۱۹۷۴ء میں تحریک ختم نبوت کی کامیابی کے بعد سے حضرت قدس سرہ' نے سفر آخرت کی تیاری شروع کردی تھی اور بار بار فرماتے تھے کہ "میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا مشن پورا ہوچکا ہے اب مجھے جانا چاہیے"۔ درمیان میں کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ حضرت کی یہ آرزو جلدی پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی' فرماتے تھے "ہمارا خیال تھا کہ بس اب ہم جائیں گے لیکن شاید اللہ تعالیٰ کوئی اور خدمت لینا چاہتے ہیں"۔ گذشتہ سال ربیع الثانی

کے اواخر میں مدرسہ کے بارے میں وصیت نامہ تحریر فرماکر اساتذہ سے اس پر دستخط لئے' جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "مدرسہ کا انتظام وانصرام جس شخص کے سپرد ہو اس میں فلاں فلاں اوصاف وشرائط کا پایا جانا ضروری ہے' اور موجودہ حالات میں مولانا مفتی احمد الرّحمٰن صاحب سے بہتر اور کوئی نظر نہیں آیا۔ اس لئے استخارہ ومشورہ کے بعد توکلاً علی اللہ اس خدمت کے لئے موصوف کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ میری غیر موجودگی میں حیًا یا میتاً میرے تمام تصرفات واختیارات ان کو حاصل ہوں گے"۔

گزشتہ رجب میں حضرت قدس سرہٗ کے صاحبزادے میاں محمد بنوری سلمہٗ کی شادی کی تقریب پر فیصل آباد سے مولانا تاج محمود اور ملتان سے مولانا محمد شریف جالندھری ناظم اعلیٰ مجلس تحفظ ختم نبوت تشریف لائے۔ حضرت نے ان سے فرمایا' "میں شوال تک تمہارا امیر ہوں اس کے بعد اپنا امیر کسی اور کو بنالینا"۔

"بینات" کے "بصائر وعبر" کے لئے حضرت رحمہ اللہ کو زحمت دی جاتی تھی اور ہجوم مشاغل کی بناء پر حضرت کو اس کے لئے وقت نکالنا مشکل ہوتا تھا اس صبر آزما انتظار میں "بینات" کی اشاعت میں تاخیر پر تاخیر ہوجاتی۔ آخری "بصائر وعبر" (جو گزشتہ ماہ شائع ہوئے) کے لئے کئی دن سے تقاضا تھا' بدھ (۲۷ر شوال ۱۲ اکتوبر) کی صبح کو نماز فجر کے بعد راقم الحروف نے عرض کیا کہ حضرت کل اسلام آباد تشریف لے جارہے ہیں' ادھر پرچہ پہلے ہی کافی مؤخر ہوچکا ہے۔ اگر چند سطریں تحریر فرمادی جائیں تو پرچہ پریس بھیج دیا جاتا' فرمایا "بہت اچھا"۔ چنانچہ نماز عصر کے بعد "بصائر وعبر" کا مسودہ راقم الحروف کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا' "بس اب آپ خود ہی لکھ لیا کریں"۔ آہ! مجھے خیال تک نہیں تھا کہ یہ ارشاد بینات کے حق میں آخری وصیت ہے اور آئندہ "بس اب آپ خود ہی لکھ لیا کریں" پر عمل کرنا ہوگا۔

جمعرات (۲۸ شوال۔ ۱۳ اکتوبر) کو صبح ۷ بجے کی پرواز سے اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے اسلام آباد تشریف لے گئے' دو دن اجلاس میں ۸۔۸ گھنٹے تک مصروف رہے' ہفتہ (یکم ذیقعدہ ۱۵ اکتوبر) کی صبح کو ۷ بجے دل کی تکلیف ہوئی مگر اسے معمولی سمجھ کر کچھ زیادہ خیال نہ کیا گیا' ۲ بجے دل کا دورہ پڑا' اور ضعف ونقاہت سے نیم جان ہوگئے۔ کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں لے جایا گیا' دو دن امید وبیم کی کیفیت رہی' دوشنبہ کی رات کو عشاء کے وقت طبیعت اچھی نظر آرہی تھی' غالباً رات میں کسی وقت پھر حملہ

ہوا' سنا گیا ہے کہ رات کے تین بجے کمپاؤنڈر دوائی دینے آیا تو اس سے فرمایا "بس دوائی کی ضرورت نہیں' بلاوا آچکا ہے"۔ چنانچہ صبح ۵ بجے بلاوے پر لبیک کہی اور رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ رحمہ اللہ

حضرت قدس سرہٗ کی وفات حسرت آیات کا صدمہ ملت اسلامیہ کا مشترک غم ہے' مدرسہ عربیہ اسلامیہ اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں تعزیت کے لئے آنے والے حضرات کا تانتا بندھا رہا اور بے شمار حضرات نے تعزیتی جلسے کیے' تار اور خطوط بھیجے' ادارہ بینات حضرتؒ کے پسماندگان' اعزہ واقارب مدرسہ عربیہ اسلامیہ' مجلس تحفظ ختم نبوت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان' حضرتؒ کے احباب ومخلصین اور حضرت کے غم میں شریک تمام افراد ملت سے تعزیت کا اظہار کرتا ہے اور ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے خود تشریف لاکر یا خطوط کے ذریعے حضرت کے سوگوار متعلقین کو پرسا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر جزیل عطا فرمائے اور ہم سب کو دین قیم کی خدمت کے لئے قبول فرمائے' جس کے لئے حضرتؒ نے اپنی ساری زندگی صرف کردی۔

ہم لوگوں کے ذمہ حضرت اقدسؒ کے بہت سے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا لازم ہے' سب سے پہلا حق تو یہ ہے کہ جس قدر ممکن ہو حضرت کے لئے ایصال ثواب کیا جائے اور رفع درجات کی دعا کی جائے۔ الحمد للہ میں نے آپ کے ایصال ثواب کے لئے اس قدر قرآن کریم ختم کئے کہ بہت کم لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے۔ میں قارئین "بینات" سے بطور خاص اس کی استدعا کرتا ہوں کہ روزانہ بلاناغہ درود شریف سورہ اخلاص اور سورہ فاتحہ (جس قدر ہوسکے) پڑھ کر اس کا ثواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت بنوری قدس سرہٗ تک تمام اکابر امت کی ارواح طیبہ کو بخش دیا کریں۔ اس عمل کے ذریعہ ان شاءاللہ اکابر سے ہمارا تعلق مستحکم ہوگا' اور یہ ہماری روحانی ترقی دنیا وآخرت کی سعادت اور ان اکابر کی شفاعت کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔

دوسرا حق یہ ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کے حالات زندگی محفوظ ومرتب کئے جائیں' چنانچہ مخلصین کے اصرار اور اکابر کے تقاضے پر خدام نے فیصلہ کیا ہے کہ حضرت کی شخصیت پر ماہنامہ "بینات" کا ایک ضخیم "خصوصی نمبر" شائع کیا جائے جو حضرت کی زندگی کے بیشتر پہلوؤں پر حاوی ہو۔ چونکہ حضرتؒ کے مخلصین اور احباب کی ایک بڑی تعداد عرب ممالک سے تعلق رکھتی ہے اس لئے یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ "خاص نمبر" اردو

اور عربی میں الگ الگ شائع کیا جائے۔ تخمینہ ہے کہ اردو حصہ پانچ سو صفحات پر اور عربی حصہ تین سو صفحات پر محیط ہوگا۔ اس سلسلہ میں پاکستان' ہندوستان اور عرب کے اکابر اہل قلم سے مقالات کی درخواست کی گئی ہے۔ یہ "خاص نمبر" ان شاء اللہ تعالیٰ نئے سال ۱۳۹۸ھ کے محرم وصفر کا مشترکہ شمارہ ہوگا' اور توقع ہے کہ ماہ صفر کے اواخر تک قارئین کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس سلسلہ میں "بینات" کے توسط سے حضرتؒ کے تمام متعلقین اور مخلصین سے دو گذارشیں کرنا چاہتا ہوں' ایک یہ کہ حضرت کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ کسی صاحب کے علم میں ہو یا حضرتؒ کا کوئی ارشاد کسی کو ٹھیک ٹھیک یاد ہو وہ ہمیں لکھ بھیجیں' تاکہ اس سے حضرتؒ کی سوانح مرتب کرنے میں مدد لی جائے۔ دوسرے یہ کہ حضرتؒ کی کوئی تحریر یا خط کسی صاحب کے پاس ہو اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہمیں بھیج دیں' یا اصل تحریر بھیج دیں ہم اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لے کر اصل انہیں واپس کردیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ حضرتؒ کے تمام تبرکات محفوظ کرکے انہیں مرتب کیا جائے۔

حضرت قدس سرہٗ کا ایک اہم حق ہم سب پر یہ ہے کہ حضرتؒ کے صدقات جاریہ (جن میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ' مجلس دعوت و تحقیق اسلامی' مجلس تحفظ ختم نبوت' وفاق المدارس وغیرہ شامل ہیں) کی بقاء وحفاظت اور غور وپرداخت سے غفلت نہ برتی جائے بلکہ ان کو مزید ترقی دینے اور ان کے برگ وبار میں اضافہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ ماہنامہ "بینات" بھی حضرت کا صدقہ جاریہ ہے۔ اور اس سے ہر ممکن تعاون ہم سب کا فرض ہے۔

حضرتؒ ایک مدت سے ماہنامہ "بینات" میں "بصائر و عبر" کے عنوان سے اداریے تحریر فرماتے تھے۔ جن سے لوگ بہت محظوظ و مستفید ہوتے تھے۔ مخلصین کی رائے ہے کہ ان تمام تحریروں کو الگ کتابی شکل میں مرتب کردیا جائے اس کے لئے بھی کام شروع کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو جلد ہی "بصائر و عبر" کتابی شکل میں الگ شائع ہوجائیں گے۔ اور حضرتؒ نے مرحومین کی وفات پر جو تعزیتی نوٹ تحریر فرمائے تھے "عبرات" کے نام سے انہیں بھی الگ شائع کیا جائے گا۔ نیز حضرتؒ کے جو مقالات مطبوعہ یا غیر مطبوعہ "بصائر و عبر" میں نہ سما سکے انہیں "مقالات بنوریؒ" کے نام سے جدا شائع کیا جائے گا

حق تعالیٰ شانہٗ حضرت شیخ کو جنت الفردوس میں بلند درجات عطا فرمائے' اور ہمیں تمام

فتنوں سے بچا کر اپنی رضا کے موافق زندگی گذارنے کی توفیق فرمائے

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ صفوۃ البریۃ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین

سوگوار
محمد یوسف عفا اللہ عنہ

۱۹ ر ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ

(اشاعت خاص بینات محرم الحرام ۱۳۹۸ھ مطابق جنوری ۱۹۷۸ء)

حضرت شیخ رحؒ اور طحاوی شریف

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہٗ کو حق تعالیٰ شانہ نے جن خصوصی انعامات سے نوازا ان میں سے ایک خاص الخاص انعام علوم حدیث اور انفاس نبویہ کی خدمت ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد حق تعالیٰ شانہٗ آپ سے کسی نہ کسی طرح حدیث کی خدمت لیتے رہے، قریباً نصف صدی تو حدیث شریف کی تدریس میں گزری، اس کے علاوہ آپ نے علم حدیث پر جو علمی مآثر چھوڑے ہیں ان کی مختصر سی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ بخاری شریف کی مشہور شرح "فیض الباری" جو آپ کے شیخ انورؒ کے افادات کا مجموعہ ہے، اسے مرتب تو حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی ثم مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، لیکن اس کی تالیف میں بھی حضرت بنوری نور اللہ مرقدہٗ کے مشورے اور علمی افادات شریک رہے، اس سلسلہ میں حضرتؒ بعض عجیب لطائف بھی سنایا کرتے تھے، اور پھر اس کی طباعت اور تقدیم کا سارا کام حضرتؒ نے خود کیا اور قریباً ایک سال تک اس میں منہمک رہے۔

۲۔ جامع ترمذی کی شرح "معارف السنن" تالیف فرمائی، یہ حضرت مفتی ولی حسن صاحب مدظلہٗ کے مقالہ کا مستقل موضوع ہے۔

۳۔ اپنے ادارہ میں "تخصص فی الحدیث" کا شعبہ قائم فرمایا جو اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے شاید پورے عالم میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ تخصص فی الحدیث کے شرکاء سے حدیث کے انتہائی اہم موضوعات پر مقالات لکھوائے، جن کی اہمیت وافادیت کا صحیح اندازہ اشاعت کے بعد ہی امت لگا سکے گی۔

۴۔ جامع ترمذی کی تقریر "العرف الشذی" کی تصحیح بھی فرمائی جس کا نسخہ محفوظ ہے۔

۵۔ جامع ترمذی کے "وفی الباب" کا کام شروع فرمایا' جس کی تکمیل آپ کے تلمیذ رشید مولانا حبیب اللہ صاحب مختار فرمارہے ہیں (اس پر "لب اللباب" کے نام سے مستقل مقالہ ملاحظہ فرمائیے)

۶۔ سنن ابی داؤد کے مشکل مقامات پر تعلیقات وحواشی بھی تحریر فرمائے۔ یہ غیر مطبوعہ شکل میں محفوظ ہیں۔

۷۔ نصب الرایہ کی طباعت' تقدیم اور تحشیہ کی خدمت۔

۸۔ امام طحاویؒ کی شرح "معانی الآثار" کی خدمت کا آغاز فرمایا' ذیل میں اسی کا تعارف مقصود ہے۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ امام طحاویؒ کی عبقریت اور فقہ وحدیث میں ان کی مہارت وحذاقت کے بڑے مداح تھے' فرماتے تھے کہ ان کے معاصرین میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہیں تھا اور بعد کے محدثین میں سے بھی کسی کو ان کے مقام رفیع تک رسائی نصیب نہیں ہوئی' حضرتؒ نے تخصص فی الحدیث کے بعض شرکاء کو مقالہ نویسی کے لئے یہ موضوع دیا تھا "الامام الطحاوی ومیزانہ بین معاصریہ" یعنی امثال ونظائر سے یہ ثابت کیا جائے کہ امام طحاویؒ کو ابن جریرؒ' ابن خزیمہؒ' محمد بن نصرؒ وغیرہ معاصرین پر کن کن امور میں فوقیت حاصل ہے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ دارقطنیؒ' بیہقیؒ اور خطیبؒ تینوں مل کر حدیث میں طحاویؒ کے ہم سنگ ہوتے ہیں مگر تفقہ اور عقلیت میں طحاویؒ کا پلہ پھر بھی بھاری رہتا ہے۔

امام طحاویؒ کی تالیفات میں شرح "معانی الآثار" امت کے سامنے موجود ہے جو فقہ وحدیث کا "مجمع البحرین" ہے' مگر افسوس ہے کہ اب تک دیگر کتب حدیث کی طرح اس کی خدمت نہیں ہوسکی اور اگر ہوئی ہو تو امت کے سامنے نہیں۔ حافظ بدر الدین عینیؒ نے مدۃ العمر اس کا درس دیا اور اس کی تین شرحیں لکھیں لیکن حیرت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حلیۂ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی' اور بھی کئی نامور اہل علم نے اس پر کام کیا مگر کسی کی محنت منظر عام پر نہیں آئی۔ حضرتؒ محسوس فرماتے تھے کہ اس پر مندرجہ ذیل پہلوؤں سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

الف: رجال سند کی تحقیق۔ جس کی روشنی میں حدیث کا مرتبہ متعین ہوسکے۔

ب : متون کی تخریج۔ جس سے ایک طرف تو امام طحاویؒ کی ہر روایت کے متابعات وشواہد سامنے آجائیں اور طحاویؒ کی احادیث کے قبول کرنے میں بعض لوگوں کو جو کھٹکا ہوتا ہے وہ دور ہوجائے' دوسرے حدیث کے متعدد طرق میں وارد شدہ الفاظ بیک نظر سامنے آنے سے حدیث کی مراد بھی واضح ہوجائے' اسی کے ساتھ دیگر کتب حدیث میں اس حدیث کی نشاندہی کرنے سے ان کتابوں کی شروح کی طرف مراجعت آسان ہوجائے۔

ج : امام طحاویؒ ائمہ احناف کے مسلک کی تصریح کرجاتے ہیں اور دیگر مجتہدین کے مذاہب کی طرف اجمالاً اشارہ کرجاتے ہیں' مگر ہر مذہب کے قائلین کی تصریح نہیں فرماتے' ضرورت ہے کہ اس اجمال کو رفع کیا جائے۔

د : امام طحاویؒ نے قریباً ہر مسئلہ میں احادیث و آثار کے علاوہ "وجہ النظر" کے ذیل میں عقلی دلیل کا التزام فرمایا ہے جو خاصی دقیق اور مشکل ہوتی ہے' اس کی تہذیب وتنقیح کرکے مقصد کی توضیح کی جائے۔

ھ : حضرات متقدمین کے کلام میں اکثر طوالت ہوتی ہے جس سے بعض دفعہ مبتدی کو فہم مطالب میں دقت پیش آتی ہے' اس لئے ضرورت ہے کہ طحاوی کے ہر باب کے مقاصد کی تلخیص کی جائے' یہ کام متقدمین میں سے حافظ زیلعیؒ کرچکے ہیں لیکن ان کی یہ تالیف دستیاب نہیں اور ماضی قریب میں حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ نے بھی اس کی تلخیص کی مگر بہت زیادہ اختصار کی وجہ سے مفید عام نہ ہوسکی۔

و : یہ بھی ضرورت ہے کہ ہر باب کی احادیث و آثار کی فہرست مرتب کردی جائے کہ اتنی مرفوع ہیں اتنی مراسیل' اتنی موقوف اور اتنی مکرر۔

ز : اور سب سے اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ شرح معانی الآثار کے متن کی تصحیح کی جائے' کیوں کہ اس میں بکثرت اغلاط ہیں' بعض اغلاط تو ایسے ہیں جن سے عبارت ناقابل فہم بن گئی ہے یا مفہوم بالکل مسخ ہوچکا ہے اور تعجب ہے کہ حافظ جمال الدین زیلعیؒ اور ان جیسے دوسرے اکابر بھی بعض جگہ ان غلطیوں سمیت نقل کرتے ہیں' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے جو نسخہ تھا اس میں بھی یہ اغلاط موجود تھے۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ مندرجہ بالا امور کو پیش نظر رکھ کر طحاوی

شریف پر کام کیا جائے چنانچہ آپ نے اپنے تلمیذ سعید مولانا محمد امین صاحب زید مجدہٗ کو اس کام پر مامور فرمایا' شروع میں رجال کی تحقیق پر بھی کام ہوتا رہا' چنانچہ کتاب الطہارۃ تک کوئی ہزار کے قریب رجال کی چھان بین ہوئی' لیکن چونکہ طحاویؒ کے رجال عموماً صحاح ستہ کے رجال ہیں اور ان پر کافی کام ہوچکا ہے اس لئے تحقیق رجال کا کام فی الحال رکوادیا۔

اب مولانا موصوف طحاوی شریف پر جو کام کررہے ہیں اس کا انداز یہ ہے:

اولاً: ہرباب کی تلخیص۔

ثانیاً: اسی تلخیص کے ضمن میں مذاہب ائمہ کا بیان۔

ثالثاً: ائمہ اربعہ کے مذاہب ان کی کتب فقہ سے بقید حوالہ نقل کرنا۔

رابعاً: زیر بحث باب کے آثار کی تعداد اور تفصیل۔

خامساً: نمبروار باب کی ہرحدیث کی تخریج۔

سادساً: اصل کتاب کی حتی المقدور تصحیح۔

سابعاً: حضرت اقدس نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کے آخری ایام زندگی میں خواہش کے مطابق ہر باب کے آخر میں اس بحث سے متعلق حنفیہ کی مؤید احادیث اور آثار کا اضافہ کیا جو "شرح معانی الآثار" میں نہیں۔

مناسب ہوگا کہ مولانا موصوف کی تلخیص کا ایک نمونہ یہاں نقل کردیا جائے۔ طحاوی شریف میں تین طلاق بیک وقت دینے کی بحث کئی صفحات پر محیط ہے اس کی تلخیص صرف ایک صفحہ میں کی گئی ہے جس میں ائمہ کے مذاہب ودلائل بھی آگئے ہیں' حدیثی وفقہی ابحاث کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے اور اس باب کی احادیث کی تعداد کے ساتھ مذاہب کی کتابوں کے حوالے بھی دے دیئے گئے ہیں' تلخیص کا نمونہ حسب ذیل ہے:

باب الرجل یطلق امرأته ثلثا معًا

زعم اهل الظاهر والزیدیه ان من طلق امرأته ثلاثا فی طهر لاجماع فیه فهی واحدة ویحکی ذالک عن طاؤس' وعطاء' وعمرو بن دینار' وابی الشعثاء' وابن جبیر' وابن اسحٰق' وابن ارطاة' وابن مقاتل' و غیرهم۔ واحتجوا بحدیث ابن عباسؓ: "کان الثلاث تجعل واحدة علی عهد النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وابی بکرؓ وثلاثا من امارة عمرؓ" ولان التطلیق ثلاثا خلاف ما امر اللّٰه

تعالیٰ بہ فلاینفذ، کما اذا امر رجل رجلا ان یطلق امراتہ کذا علی صفۃ کذا فخالف امرہ وعند الجمہور تقع الثلث وبہ قالت الاربعۃ والاوزاعی، والثوری، واسحق، وعامۃ فقہاء الامصار، وانعقد علیہ اجماع الصحابۃ فی عہد عمر، وصح عن غیر واحد من الصحابۃ، منہم ابن عباس راوی حدیثہم ذالک۔ ثم فی حدیثہ: "فلما کان زمان عمر قال: ایہا الناس قد کان لکم اناءۃ وانہ من تعجل اناءۃ اللہ فی الطلاق الزمناہ"۔ فخاطب بذالک الناس جمیعا وفیہم من علم ماثبت فی ذالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ولم ینکر علیہ منکر، فکان ذالک اکبر حجۃ علی نسخ ماکان، لان اجماعہم علی فعل کما یکون حجۃ فکذالک اجماعہم علی القول، وکما ان اجماعہم فی النقل معصوم عن الخطاء فکذالک اجماعہم علی رأی محفوظ عن الزلۃ۔ ونظائر ذالک کثیرۃ، منہا، تدوین الدواوین، والمنع عن بیع ام الولد، والتوقیت فی حد الخمر۔ وفی ذالک لم یکن فی اول الامر، ثم اجمعوا علیہا لسنوح دلیل یرشدہم الی ذالک۔ وقد اجیب عن حدیثہم باجوبۃ اخریٰ، منہا: ضعفہ من حیث الاسناد ومنہا: انہ فی طلاق البتۃ فجعلہا بعض الرواۃ ثلثا حسب رایہ۔ والجواب عن نظرہم ان الواجب بالمخالفۃ انما ہو التاثم، وہذا لاینافی ان نلزمہم ما التزموہ لانہم فعلوا ما فعلوہ لانفسہم، بخلاف الوکیل فانہ یفعل ما یفعل عن المؤکل ویحل فی افعالہ محلہ فاذا فعل خلاف ما امرہ لم ینفذ۔ وقد رأینا اشیاء نہی اللہ سبحانہ عنہا ثم اوجب علی من ارتکبہا احکاما، کالظہار، فانہ منکر من القول وزور، ومع ذالک تحرم بہ المراۃ وتجب الکفارۃ۔ ونہی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عن طلاق الحائض ثم امر ابن عمر بالرجوع لما طلقہا۔ والرجوع لایکون الا بعد الوقوع، وہذا بخلاف اُمر النکاح، فانہ لاینعقد اذا کان علی خلاف ما امر اللہ تعالیٰ کالنکاح فی العدۃ، لان النکاح وکذا سائر العقود لایمکن الدخول فیہا الا کما امر، واما الخروج عنہا فیمکن بغیر ما اُمر ایضًا کالصلاۃ لا یدخل فیہا الا کما اُمرہ، ویخرج منہا باکل وشرب وکلام وغیر ذالک مما ینافی الصلاۃ، فمن فعلہا خرج من صلاتہ وان کان اثما للمخالفۃ ہذا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

وجمیع ما فی الباب (۲۰) اثرًا، المرفوع منہا خمسۃ والثلثۃ منہا معلقۃ وغیرہا موقوفۃ وراجع للمذاہب المعالم ۳/۲۳۸-۲۳۹۔ والمبسوط للسرخسی ۶/۵۷ وبدایۃ المجتہد ۲/۶۰۔ والمغنی ۷/۱۰۴۔ ثم اعلم ان فی المسئلۃ مذہبًا ثالثًا وہو مذہب الامامیۃ فانہم قالوا: لایقع شیئی۔

اس تلخیص کے بعد باب کی ایک ایک حدیث کی تخریج شروع ہوتی ہے اور اس

ضمن میں حدیث کے طرق صحیحہ، ضعیفہ اور معللہ پر بھی تنبیہہ کردی گئی ہے۔ تخریج کے سلسلہ میں یہ بتانا بھی ضروری ہوگا کہ مرفوع احادیث تو اکثر وبیشتر صحاح، سنن، مسانید اور معاجم میں مل جاتی ہیں اور ان کی تخریج کی جاسکتی ہے مگر طحاوی شریف میں آثار صحابہ بھی بکثرت ہیں اور کتب حدیث سے ان کے ماخذ تلاش کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے، اس لئے کہ کتب احادیث میں آثار کی تخریج بہت کم ہوئی ہے۔ مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن سعید بن منصور وغیرہ میں آثار صحابہ و تابعین کا اچھا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، لیکن مؤخر الذکر دونوں اہم مراجع مکمل صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ مؤلف نے آثار کے تتبع میں ایک طرف تو ان کتابوں کی مراجعت کی دوسری طرف سنن بیہقی، سنن دارقطنی، المحلی لابن حزم، جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبریؒ وغیرہ سے فائدہ اٹھایا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل دفاتر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔

۱۔ تاریخ بغداد	خطیب بغدادی	۱۴ مجلدات
۲۔ حلیتہ الاولیاء	ابو نعیم اصفہانی	۱۰ مجلدات
۳۔ طبقات	ابن سعد	۸ مجلدات
۴۔ تاریخ کبیر	امام بخاریؒ	۸ مجلدات
۵۔ الکنیٰ	ابوبشر دولابی	۲ مجلدات
۶۔ معجم صغیر	طبرانی	۱ جلد
۷۔ تاریخ جرجان	حمزہ سہمی	۱ جلد

اور پھر ان سات کتابوں کی تمام احادیث و آثار کو کتب حدیث وفقہ کی ترتیب پر مرتب کیا، مولانا موصوف نے تو صرف اپنی تخریج کے لئے یہ کام کیا تھا مگر یہ بجائے خود ایک ایسا علمی کارنامہ ہے جس پر علمی دنیا کو ممنون ہونا چاہئے، اور اگر یہ محنت مطبوعہ شکل میں سامنے آجائے تو اہل علم کے لئے گرانقدر تحفہ ہوگا۔

حافظ بدر الدین عینیؒ کی شرح طحاوی کا نسخہ مصر میں موجود تھا اور حضرتؒ ایک مدت سے اس کے حصول کے لئے کوشاں تھے، الحمد للہ کچھ عرصہ پہلے اس کی میکرو فلم پہنچ گئی ہے، اور اب مولانا محترم اپنی تخریج کا حافظ بدر الدین کی تخریج سے مقابلہ کر رہے ہیں،

تاکہ اگر اپنے کام میں نقص ہو تو اس سے اس کا تدارک کر لیا جائے۔ مناسب ہوگا کہ اس مقابلے کا بھی ایک نمونہ قارئین کے سامنے آجائے۔

باب "سؤر الہر" میں حدیث ابی قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے حافظ عینیؒ نے ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' صحیح ابن حبان' مستدرک حاکم' ابن خزیمہ اور ابن مندہ کا حوالہ دیا ہے' جب کہ ہمارے مولانا محمد امین صاحب زید مجدہ مندرجہ ذیل حوالوں سے اس حدیث کی تخریج کر چکے تھے۔

۱۔ مؤطا امام مالک	ص۸	۱۰۔ ابن خزیمہ	ج۱' ص۵۵
۲۔ مؤطا محمد	ص۸۳	۱۱۔ ابن سعد	ج۸' ص۴۷۸
۳۔ شافعی (کتاب الام)	ج۱' ص۶	۱۲۔ ابن ابی شیبہ	ج۱' ص۳۱
۴۔ عبدالرزاق	ج۱۰' ۱۰۱	۱۳۔ ابن حبان بحوالہ موارد الظمان ص۴۱	
۵۔ مسند احمد	ج۵' ص۳۰۳٫۳۰۹	۱۴۔ ابن جارود	ص۳۰
۶۔ ابوداؤد	ج۱' ص۱۱٫۱۲	۱۵۔ بیہقی	ج۱' ص۲۴۵٫۲۴۶
۷۔ نسائی	ج۱' ص۳۶	۱۶۔ بغوی	ج۲' ص۶۹
۸۔ ابن ماجہ	ص۳۰	۱۷۔ ابن مندہ بحوالہ نصب الرایہ ج۱' ص۱۳۷	
۹۔ مسند حمیدی	ص۴۳۰	۱۸۔ داری	ص۱۰

اور ہر حوالہ کی تخریج کے ساتھ اس کے طرق اور متن کے الفاظ کی طرف بھی مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس باب کی اٹھارہ احادیث میں سے صرف ایک حدیث کی تخریج کی مثال ہے' اس سے مؤلف کی محنت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے' بحمد اللہ تعالیٰ اب تک یہ کام کتاب المناسک تک ہوچکا ہے' حق تعالیٰ اس کی تکمیل فرمادے اور یہ امت کے سامنے آجائے تو یہ ایک عظیم علمی و فقہی اور حدیثی خدمت ہوگی' اور یہ حضرت الشیخ بنوری نور اللہ مرقدہٗ کے مآثر کا صرف ایک گوشہ ہے۔

(اشاعت خاص بینات محرم الحرام ۱۳۹۸ھ مطابق جنوری ۱۹۷۸ء)

الامام المجاہد فی سبیل اللہ

حق تعالیٰ کا نظام قدرت وحکمت بھی عجیب ہے۔ بعض حضرات بزم جہاں میں دیر سے آتے ہیں، مگر ان کو نشست "صدیقین اولین" کے پہلو میں دی جاتی ہے، امام بیہقیؒ نے "دلائل النبوۃ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

انہ سیکون فی اخر ھذہ الامۃ قوم لھم مثل اجر اولھم یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقاتلون اھل الفتن (مشکوٰۃ ص ۵۸۴)

"اس امت کے آخر میں کچھ لوگ ہوں گے جن کو اجر، امت کے پہلوں کا سا دیا جائے گا یہ لوگ "معروف" کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور اہل فتنہ سے لڑیں گے"۔

یعنی "المعروف" کا حکم کرنا، "المنکر" سے روکتے رہنا، اور فتنہ پردازوں سے برسرپیکار رہنا، یہی تین وصف ایسے ہیں جو پچھلوں کو پہلوں سے ملادیتے ہیں۔ بلاشبہ علم وفضل، طہارت وتقویٰ، زہد وتقدس وغیرہ ایمانی وانسانی اوصاف بھی نہایت گرانقدر ہیں، مگر ان سارے اوصاف سے آدمی مقبولیت عنداللہ میں اپنے ہم عصروں سے آگے نکل سکتا ہے، اور اپنے زمانہ کا مقتداء بن سکتا ہے، تاہم شمار اس کا اسی زمانے میں ہوگا جس میں وہ پیدا ہوا اور اس کے اجر وثواب اور درجات کا پیمانہ بھی اسی دور کے لحاظ سے متعین ہوگا۔ لیکن جو چیز قرون متأخرہ کے افراد کو قرون اولیٰ کی شخصیت بنادیتی ہے، وہ صرف امر بالمعروف نہی عن المنکر اور اہل فتن سے جہاد ہے۔

المجاہد فی سبیل اللہ الشیخ الامام السید مولانا محمد یوسف البنوری الحسینی بھی انہی "الآخرون السابقون" میں تھے جنہیں ارشاد نبویؐ "لھم مثل اولھم" کے شرف وافتخار سے

نوازا گیا اور جن کی پوری زندگی "اہل فتن" سے جہاد وپیکار میں گزری۔

"فتنہ" لغت میں سونے کو کٹھالی میں پگھلا کر پرکھنے کو کہتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں "فتنہ" ان آزمائشوں کا نام ہے جن میں ایمان کا "زر خالص" پرکھا جاتا ہے' اسی ضمن میں وہ بدعتیں' گمراہیاں اور جدّت طرازیاں بھی آتی ہیں جن کو اپنے دماغ سے گھڑ گھڑ کر کج رو لوگ دین کے نام سے پیش کرتے ہیں' ایسے لوگوں کو "اہل فتنہ" کہا جاتا ہے اور انھی "اہل فتنہ" سے جہاد کی وہ فضیلت بیان فرمائی گئی جسے اوپر نقل کرچکا ہوں۔

حق تعالیٰ نے زائغین کے برپا کردہ فتنوں کو ایمان کے جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی بنایا ہے' یعنی اسے ان فتنوں سے تنفر ہے یا ان کی طرف کشش؟ جس شخص کے دل میں ایمان جتنا قوی' جتنا مضبوط اور جتنا صحت مند ہوگا اسے فتنوں سے اسی قدر نفرت اور بغض وعداوت ہوگی۔ اس کے برعکس جس کا ایمان جس قدر کمزور' زیغ آلود اور مریض ہوگا اسے فتنوں کی طرف اسی نسبت سے کشش ہوگی۔ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

> **تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عودا عودا' فای قلب اشربها نکتت فیه نکتة سوداء' وای قلب انکرها نکتت فیه نکتة بیضاء' حتی تصیر علی قلبین' ابیض مثل الصفا فلا تضره فتنة مادامت السموت والارض۔ والاخر اسود مربادا کالکوز مجخیا' لایعرف معروفا ولاینکر منکرا الا ما اشرب من هواه۔** (مشکوٰۃ ص ۴۶۱)

> "فتنے قلوب کے سامنے اس طرح آئیں گے جیسے چٹائی میں ایک تنکا بنا جاتا ہے' سو جس دل نے ان کو جذب کرلیا اس پر سیاہ داغ اور جس دل نے ان سے تنفر کیا' اس پر سفید نشان لگتا جائے گا' یہاں تک کہ دلوں کی دو قسمیں ہوجائیں گی' ایک سفید' سنگ سفید کی طرح صاف' ستھرا اور چکنا' کہ رہتی دنیا تک اسے کوئی فتنہ نقصان نہیں دے گا' دوسرا کالا بھجنگ' کوزہ کی مانند الٹا' یہ سوائے اپنی خواہش کے' جو اس میں رچ بس گئی ہے' نہ کسی بھلائی کو بھلائی سمجھے گا نہ بدی کو بدی"۔

اس حدیث سے واضح ہوجاتا ہے کہ فتنے ایمان کی صحت و مرض کے لئے مقیاس اور کسوٹی ہیں، جن قلوب میں فتنوں سے مقابلہ کی تب و تاب ہو وہ "صحتمند" کہلائیں گے اور جن میں فتنوں سے مصالحت کی استعداد ہو وہ "مریض الایمان" ہوں گے اور مرض بڑھ جانے کی صورت میں یہ لوگ ایمان سے محروم ہوجائیں گے۔

اہل فتنہ سے قتال "ایمان" کا بلند ترین مرتبہ ہے اور اس جہاد و قتال کے لئے چند اوصاف اور صلاحیتیں درکار ہیں:

اول: سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے میں اس کا نام "ایمانی حس" رکھوں گا، اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف اوپر کی حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جس طرح ہم آنکھ سے دیکھنے کا، کانوں سے سننے کا، زبان سے چکھنے کا کام لیتے ہیں اسی طرح مومن کے دل میں ایک "ایمانی حاسہ" ہونا چاہئے جو فتنے کی بو سونگھنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور ہر فتنہ کے رنگ و روغن کی تہ میں چھپی ہوئی اصل حقیقت کو پہچان سکتا ہو، اگر یہ "ایمانی حس" موجود نہیں اور اس کے گرد و پیش فتنے منڈلاتے ہیں مگر اسے کوئی احساس نہیں تو سمجھنا چاہئے اس کا ایمان تندرست نہیں، بیمار ہے۔

دوسری چیز "ایمانی غیرت" ہے جس کے لئے فتنہ کی ناپاک بدبو ناقابل برداشت ہو اور وہ بے قرار ہو کر پکار اٹھے:

اینقص فی الدین وانا حیٌّ۔

"کیا میرے جیتے جی دین میں قطع و برید کی جائے گی"۔

(یہ امت کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے صدیق کا جملہ ہے جو ان سے بے تابی کی اس حالت میں صادر ہوا تھا جب فاروق اعظمؓ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں ان سے نرم روی کی فرمائش کی تھی۔ رضی اللہ عنہما) مومن میں اتنی غیرت ضرور ہونی چاہئے کہ وہ دین کو بگڑتا ہوا دیکھ کر بے تاب ہوجائے اور فتنہ کی سرکوبی کے لئے جو کچھ اس سے بن پڑتا ہو اسے کر گزرنے کے لئے آمادہ ہوجائے۔

تیسری چیز بسالت و شجاعت ہے جو ایمانی غیرت کا مرکب بن کر آتش نمرود میں کود پڑے اور وہ وقت کے کسی بڑے سے بڑے فرعون و شدّاد کو خاطر میں نہ لائے۔

چوتھی چیز علم و فضل کا سازو سامان اور اسلحہ ہے، جس کے بغیر کوئی جنگ نہیں لڑی جاسکتی، امام ربانی مجدّد الف ثانی ؒ کی عبقریت سے کون ناواقف ہے؟ مگر یہ کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس دور کے ابوالفضل اور فیضی بھی آپ کے علم و فضل کا لوہا مانتے تھے۔

پانچویں اور آخری چیز حق تعالیٰ شانہٗ سے قلبی تعلق، اپنے ضعف و ناتوانی پر نظر اور بارگاہ خداوندی سے پیہم التجا ہے۔ بہت سے لوگ صرف قلمی گھوڑے دوڑانے اور بازاروں میں نعرے لگانے کو فتح و کامیابی کا نشان سمجھتے ہیں جب کہ ان کا رشتۂ قلب بارگاہ صمدیت سے پیوستہ نہیں ہوتا اور قرآن کریم کا اعلان بے نیازی:

ان ینصرکم اللّٰہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ وعلی اللّٰہ فلیتوکل المؤمنون۔

"اگر اللہ تم کو مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور جو وہ چھوڑ دے گا پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد؟ اور اللہ پر بھروسہ چاہیے مسلمانوں کو"۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

ان کی نظر سے اوجھل رہتا ہے، نتیجہ یہ کہ وہ بزعم خود فتنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے خود فتنوں کا شکار ہوجاتے ہیں، اور ان کی تمام مساعی شہرت و نمود کے گرد چکر لگاتی ہیں۔

حضرت قدس سرہ کو حق تعالیٰ نے ان تمام اوصاف سے مزین فرمایا تھا، جو فتنوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے لئے درکار ہیں۔ ان کی "ایمانی حس" اتنی تیز تھی کہ نہ صرف دور سے فتنہ کو محسوس کرلیتی بلکہ اس کی باریک سے باریک رگوں کو بھی ٹٹول لیتی، "ایمانی غیرت" ایسی پرجوش تھی کہ انہیں ہمہ دم فتنوں کے خلاف بے قرار اور آتش زیر پا رکھتی تھی، شجاعت و جرأت ایسی تھی کہ بڑے بڑے فراعنہ سے ٹکرادیتی، علم و فضل، فہم و فراست، عقل و تدبر اور سیادت و وجاہت میں آپ کی برتری عرب و عجم میں مسلم تھی اور حق تعالیٰ شانہ سے رشتۂ قلب ایسا قوی، مضبوط اور استوار تھا کہ آسمان سے رحمت الٰہی کو کھینچ لاتا تھا، وہ ہر کام سے پہلے خدا تعالیٰ سے اتنی دعائیں، اتنی التجائیں، اتنے استخارے کرتے اور نالہائے نیم شبی میں اتنی سسکیاں بھرتے کہ مالک رؤف رحیم کو ان پر

ترس آجاتا' وہ جب بھی میدان جہاد میں اترتے تو اسی کی رضا کے لئے اور اسی کے بھروسے پر۔ پھر ان کا قلبی تعلق مرکز تجلیات الٰہی' کعبہ مشرفہ اور معدن انوار نبوت' روضۂ مطہرہ سے ہمیشہ پیوستہ رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام ارباب قلوب سے جو ان کے علم میں تھے' ہمیشہ ربط و تعلق رہتا اور ان سے بھی دعاؤں اور التجاؤں کی مسلسل استدعائیں ہوتی رہتیں۔

آیئے اب ذرا دیکھیں کہ مسلسل نصف صدی تک یہ مردِ مجاہد فی سبیل اللہ' کن کن فتنوں سے نبرد آزما رہا۔

فتنہ قادیاں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اور فتنوں کے ظہور کی پیشگوئی فرمائی وہاں جھوٹے مدعیان نبوت کے خروج کی بھی اطلاع دی تھی' جھوٹے مدعیان نبوت سے مقابلہ سب سے پہلے حضرت صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) نے کیا اور "حدیقۃ الموت" میں مسیلمہ کذاب کو اس کی نبوت وامت سمیت دفن کیا۔ اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ پیشگوئی سب سے پہلے حضرت صدیقؓ اور ان کی جماعت پر صادق آئی:

> یا ایھا الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ واسع علیم۔
>
> "اے ایمان والو! جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ آگے لاویگا ایک قوم کہ ان کو چاہتا ہے' وہ اس کو چاہتے ہیں' نرم دل ہیں مسلمانوں پر' زبردست ہیں کافروں پر' لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے' یہ فضل ہے اللہ کا' دیگا جس کو چاہے اور اللہ کشائش والا ہے خبردار"۔
>
> (شاہ عبدالقادرؒ)

دور مابعد میں جب بھی امت میں نبوّت کاذبہ کا دجالی فتنہ اٹھا' حق تعالیٰ شانہ' نے اس کی سرکوبی کے لئے ایسے رجال کار کو کھڑا کیا جن میں یہی "صدیقی نسبت" کارفرما تھی اور

جو یحبہم ویحبونہ الخ کے مصداق تھے۔ اسی سنت الٰہیہ کے مطابق جب مرزا غلام احمد قادیانی (اللعین بن اللعین) کی نبوت کاذبہ کا فتنہ اٹھا (جو اس صدی کا سب سے منحوس وملعون فتنہ تھا) تو اس شجرہ خبیثہ کے استیصال کے لئے حق تعالیٰ شانہ علماء ومشائخ کی ایک جماعت کو آگے لائے۔

اس فتنہ کا ادراک سب سے پہلے سید الطائفہ قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو ہوا اور منکرین ختم نبوت کے خلاف کفر کا فتویٰ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند نے "تحذیر الناس" میں دیا۔

حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ "ہر عارف کو اس کے علوم ومعارف کی ترجمانی کے لئے ایک لسان عطا کی جاتی ہے جیسا کہ حضرت شمس تبریزؒ کی لسان مولانا رومیؒ تھے اور پھر فرماتے تھے کہ "میری لسان مولانا محمد قاسم ہیں" جو علوم میرے قلب پر وارد ہوتے ہیں، مولانا محمد قاسم ان کو کھول کھول کر بیان فرمادیتے ہیں" اس لئے کہنا چاہئے کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ فتویٰ حضرت حاجی صاحبؒ کے قلب صافی کا پرتو تھا۔ اس طرح "فتنۂ قادیانیت" کی تردید کی تحریک کا آغاز حضرت حاجی صاحبؒ اور ان کی "لسان علوم ومعارف" حضرت نانوتویؒ کے مبارک ہاتھوں سے ہوا اور ان کے بعد ان کے جانشینوں نے اس تحریک کو مسلسل جاری رکھا، اس فتنہ کے استیصال کے لئے یوں تو بہت سے اکابر نے زریں خدمات انجام دیں (جن کی تفصیل کے لئے دوسری فرصت درکار ہے) لیکن جس شخصیت کو اس دور کی قیادت وامامت تفویض ہوئی اور جسے حضرت بنوریؒ کے الفاظ میں "واسطۃ العقد" کہنا چاہئے، وہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی ذات گرامی تھی، حضرت شاہ صاحبؒ کو قادیانی فتنہ نے کس قدر بے قرار کر رکھا تھا؟ بہتر ہوگا کہ ہم یہ روئداد غم حضرت بنوریؒ سے سنیں:

> "امت کے جن اکابر نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے محنتیں کیں ہیں ان میں سب سے امتیازی شان حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی رحمہ اللہ کو حاصل تھی اور دار العلوم دیوبند کا پورا اسلامی اور دینی مرکز انہی کی انفاس مبارکہ نے اس شجرۂ خبیثہ کی جڑوں کو کاٹنے میں مصروف رہا، قادیانیوں کے شیطانی وساوس اور زندیقانہ

وسائنس کا امام العصرؒ نے جس طرح تجزیہ کرکے ان پر تنقید کی' اس کی نظیر عالم اسلام میں نہیں ملتی' حضرت مرحوم نے خود بھی گرانقدر علوم وحقائق سے لبریز تصانیف رقم فرمائیں اور اپنے تلامذہ مدرسین دیوبند سے بھی کتابیں لکھوائیں اور ان کی پوری نگرانی واعانت فرماتے رہے۔

میں نے خود حضرت رحمہ اللہ سے سنا ہے کہ "جب یہ فتنہ کھڑا ہوا تو چھ ماہ تک مجھے نیند نہیں آئی اور یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ کہیں دین محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے زوال کا باعث یہ فتنہ نہ بن جائے"۔ فرمایا: "چھ ماہ کے بعد دل مطمئن ہوگیا کہ انشاء اللہ دین باقی رہے گا اور یہ فتنہ مضمحل ہوجائے گا"۔

میں نے اپنی زندگی میں کسی بزرگ اور عالم کو اتنا درد مند نہیں دیکھا جتنا کہ امام العصر کو' ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میں ایک زخم ہوگیا ہے جس سے ہر وقت خون ٹپکتا رہتا ہے۔ جب مرزا کا نام لیتے تو فرمایا کرتے تھے: "لعین بن اللعین لعین قادیاں" اور آواز میں ایک عجیب درد کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ فرماتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ گالیاں دیتا ہے' فرمایا کہ ہم اپنی نسل کے سامنے اپنے اندرونی درد دل کا اظہار کیسے کریں؟ ہم اس طرح قلبی نفرت اور غیظ وغضب کے اظہار پر مجبور ہیں"

قادیانیت کے خلاف یہی درد وسوز' یہی بے چینی وبے قراری اور یہی غیظ وغضب حضرت بنوریؒ کو اپنے شیخ انورؒ سے وراثت میں ملا تھا۔ اس شعلہ افشاں نفرت وبیزاری کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے' "نفحۃ العنبر" میں لکھتے ہیں:

"فبدت لی هذه الایام لفتنة کبری تدع الارض بلاقع' الا وهی الفتنة الکافرة التی تسمی بالفتنة القادیانیة والطائفة المرزائیة تعزی الی زعیمها الضال المضل المرزا غلام احمد القادیانی الهندی' وقد وصل الی امه الهاویه' نار حامیه' فکان عتلا زنیما' معتدیا اثیما' اخرا وقاحا'

اناع فی اثنائہ کفرا بواحا وضلالا صراحا' لم یغادر شیئا من شعائر الاسلام الا ازعجہ وابطلہ ونحن نذکر نبذا من احوال ھذہ الفتنۃ المارقۃ من الدین الباغیۃ علی اللّٰہ ورسولہ وسائر المسلمین" الخ

(ص۱۹۵ طبع جدید)

حضرتؒ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن پشاور تشریف لائے تو وہاں کے سرکاری حلقوں اور انگریزی خواں نوجوانوں میں قادیانیت کا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ وہ کھلم کھلا قادیانیت کی تبلیغ کرتے اور "یوم النبی" کے نام پر جلسہ عام بھی کرتے۔ مرزائیوں کی یہ کھلے عام مرتدانہ سرگرمیاں حضرتؒ کی "ایمانی غیرت" کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کا انسداد ضروری تھا۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ قادیانیوں نے حسب عادت "یوم النبی" کا اعلان کیا اور اس کے اشتہارات لگائے' میں نے اور میرے رفیق مولانا لطف اللہ نے باہم مشورہ کیا کہ قادیانیوں کی اس جرأت کا سدباب ہونا چاہئے' چنانچہ ہم نے طے کرلیا کہ یہ جلسہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جلسہ کی تاریخ آئی اور قادیانیوں نے مقررہ جگہ پر جلسہ کے انتظامات کے بعد کاروائی شروع کی تو ہم لوگ بھی اسٹیج پر پہنچ گئے۔ قادیانیوں کی طرف سے جلسہ کے صدر کا نام تجویز ہوا تو میں نے فوراً اٹھ کر اعلان کردیا کہ یہاں جلسہ مسلمانوں کا ہوگا اور میں جلسہ کی صدارت کے لئے فلاں صاحب کا نام پیش کرتا ہوں' اس اعلان کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا' وہی ہوا' ایک ہنگامہ مچ گیا' ہماری اور قادیانیوں کی ہاتھا پائی ہوئی' بالآخر حریف پسپا ہونے پر مجبور ہوگیا' ہنگامہ کا سن کر پورا شہر ٹوٹ پڑا' میں نے ختم نبوت پر تقریر کی' قادیانیوں کی مکاریوں سے لوگوں کو آگاہ کیا' قادیانی ذلت و رسوائی کے ساتھ بھاگ گئے اور آئندہ ان کو کبھی کھلے بندوں جلسے کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

یہ حضرتؒ کا قادیانیت سے پہلا معرکہ تھا' جس میں آپ کو کامیابی اور قادیانیوں کو ذلت و شکست ہوئی' دیکھنے میں یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن جس بھیانک دور میں آپ نے ایمانی غیرت وحمیت اور جرأت وعزیمت کا یہ مظاہرہ کیا' اگر وہ پیش نظر ہو تو اسے مافوق العادت کارنامہ تصور کیا جائے گا اور پھر آپ کے اس عملی اقدام کے جو نتائج سامنے آئے وہ شاید ہزاروں روپے کا لٹریچر تقسیم کرنے پر بھی رونما نہ ہوتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات (۳ رصفر ۱۳۵۲ھ) کے بعد آپ "جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" سے منسلک ہوگئے' جو آپ کے شیخؒ کی یادگار تھی اور وہاں شیخؒ کے علوم وانفاس کی تشریح واشاعت میں مشغول ہوگئے۔ سب سے پہلے عربی میں اپنے شیخؒ کی ایک بلند پایہ سوانح "نفحة العنبر فی هدی الشیخ الانور" مرتب کی' تذکرۂ شیخ انورؒ کا ہو اور قلم ان کے جانشین بنوریؒ کا۔ ؏

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"

یہ کیسے ممکن تھا کہ شیخ انورؒ کا ذکر ردّ مرزائیت کے بغیر رہ جائے' چنانچہ اس میں ایک اہم باب "الشیخ والفتنة المرزائیة" کے عنوان سے تحریر فرمایا جس میں قادیانیت کے دجل و تلبیس کا تذکرہ فرمایا اور اس کے رد وابطال میں علمائے امت خصوصاً شیخ انورؒ کے کارناموں کی وضاحت فرمائی۔ قادیانی فتنہ کے خلاف شیخ انورؒ کی صدائے اسرافیل نے بحر محیط کے ساحل سے افغانستان تک مردہ دلوں کو کس طرح جگایا؟ اور اس کی گونج عراق' شام' مصر' حجاز وغیرہ عالم اسلامی میں کس طرح سنی گئی؟ اس کا تذکرہ کرنے کے بعد شیخ بنوریؒ لکھتے ہیں:

"وهذا الذی تری الیوم فی ارجاء الهند من تاسیس لجنات وانعقاد اجتماعات حافلة' واجراء الجرائد والمجلات لحسم عروق هذه الفتنة المتاصلة' لاسیما مساعی "جمعیة الاحرار" ورئیس شعبة تبلیغها المجاهد الباسل غشمشم الامة' خطیب القوم' مولانا عطاء الله شاه البخاری اطال الله بقائه' وزاد همته واخلاصه کل ذالک من مآثره السنیة الباقیة علی صفحات الدهر وسنته الحسنة السائرة بین المسلمین۔

ترجمہ:

"اور آج جو تم دیکھ رہے ہو کہ اس فتنہ کی جڑیں کھودنے کے لئے ہندوستان کے گوشے گوشے میں جماعتیں بن رہی ہیں' جلسے ہو رہے ہیں' اخبارات ورسائل نکل رہے ہیں' خصوصاً "مجلس احرار" اور اس کے شعبہ تبلیغ کے صدر مجاہد بہادر' شیرامت' خطیب قوم مولانا سید

عطاء اللہ شاہ بخاری' اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے اور ان کی ہمت واخلاص میں ترقی فرمائے' کی مساعی یہ سب آپ کے (شیخ انورؒ کے) تابناک آثر ہیں جن کا نقش دوام صفحات زمانہ پر باقی رہے گا' اور یہ آپ کی سنت حسنہ ہے جو مسلمانوں میں جاری وساری ہے۔"

۱۹۳۷ء میں آپ "مجلس علمی ڈابھیل" کی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں مصر تشریف لے گئے' وہاں کے اکابر علماء سے تعلقات استوار کیے' علمائے دیوبند کے تعارف پر وہاں کے مجلات میں گرانقدر مقالے شائع کئے مگر اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنے شیخ انورؒ کے مشن "ردّ قادیانیت" کو وہاں بھی فراموش نہیں کیا' وہاں کے تمام علماء ومشائخ کو قادیانیت کے خلاف جہاد کے لئے تیار کیا' ان سے قادیانیت پر رسالے اور مقالے لکھوائے اور انہیں اس موضوع پر حضرت شاہ صاحبؒ کے لعل وجواہر سے آگاہ کیا۔ علامہ محمد زاہد الکوثری جنہیں مصر کی علمی فضا میں وہی بلند پروازی حاصل تھی جو حضرت شاہ صاحبؒ کو ہندوستان میں' انہوں نے ایک مقالہ "حیات عیسیٰ علیہ السلام" پر رقم فرمایا جو "مقالات کوثری" میں شامل ہے۔ وہ اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب "عقیدۃ الاسلام" کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

"وفی عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام لمولانا الحبر الکشمیری بسط القول فی وجوہ دلالۃ الکتاب علی ما علیہ اصل الحق' فلیراجعھا من شاء الاستزادۃ"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بل لمولانا المحدث الکشمیری "کتاب التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" یسوق فیہ سبعین حدیثا تدل علی نزولہ علیہ السلام"

(مقالات کوثری ص۳۵۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اعلی اللہ سبحانہ منزلۃ العلامۃ فقید الاسلام المحدث المحجاج الشیخ محمد انور الکشمیری فی غرف الجنان' و کافاہ مکافاۃ الذابین عن حریم دین الاسلام' فانہ قمع القادیانیۃ بحججہ الدامغۃ' وحال دون

استفحال شر معتنليهم ومتطرفيهم بالهند كتب ممتعة في الرد عليهم بلغات شتى، وحقق في كتابه "اكفار الملحدين" امر اكفار هولاء وامثالهم" (ص ۳۵۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کوثریؒ نے قادیانیت پر حضرت شاہ صاحبؒ کی تینوں تصانیف ("عقیدۃ الاسلام" "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" اور "اکفار الملحدین") مطالعہ کی تھیں، نیز یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت بنوریؒ نے مصر میں اس سلسلہ میں کن کن حضرات سے ملاقات کی ہوگی اور انہیں فتنۂ قادیانیت سے آگاہ کیا ہوگا۔

بلاشبہ یہ حضرت بنوری قدس سرہٗ کی قادیانیت کے خلاف عظیم الشان مہم تھی جس میں انہیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

حضرت اقدسؒ ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے آئے اور دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں حدیث و تفسیر کی تدریس کے فرائض انجام دینے لگے، اسی دوران ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت چلی تو یہ شیخ وقت فوراً میدان عمل میں آگیا اور ظفراللہ قادیانی کی وزارت خارجہ کے خلاف احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کی قیادت کرنے لگا۔ یہ تحریک اگر چہ اپنے تمام مطالبات میں کامیاب نہیں ہوئی، تاہم کون نہیں جانتا کہ یہی تحریک ظفراللہ خاں کی وزارت خارجہ کے ساتھ خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کو بھی بہا کر لے گئی۔ تحریک ختم نبوت میں آپ کی شمولیت کا یہ تجربہ دراصل مستقبل کی تیاری کا پیش خیمہ تھا۔

۱۹۵۴ء میں حضرتؒ مستقل طور پر کراچی میں آگئے، کراچی میں آپکے قیام میں حق تعالیٰ کی جوجو تکوینی مصلحتیں تھیں انکی تفصیلات کا احاطہ کون کرسکتا ہے؟ مگر خیال ہوتا ہے کہ قدرت آپکو کراچی کے مرکز میں لاکر "تحریک ختم نبوت" کی قیادت آپ کے سپرد کررہی تھی۔ آپ یہاں تشریف لائے تو رفتہ رفتہ آپ کی سیادت و محبوبیت کا نقش دلوں پر ثبت ہونے لگا اور اندرون و بیرون ملک ہر طبقہ کے لوگوں سے آپ کے تعلقات وسیع ہوتے گئے اور آپ کو ہر بڑے چھوٹے سے ملنے، ہر ایک کو پڑھنے اور سمجھنے اور ہر ایک کی صلاحیت کے مطابق اس سے کام لینے کا موقع ملا، ظاہر ہے کہ یہ کام نہ ڈابھیل کے دور افتادہ خطے میں میسر آسکتا تھا نہ ٹنڈو الہ یار کے قصبے میں اور نہ "لال جیوہ" کے ویرانے میں۔ کراچی لاکر گویا

قدرت نے ولقد مکنا لیوسف فی الارض کا نقشہ لوگوں کو ایک بار پھر دکھایا اور حدیث نبوی ثم یوضع لہ القبول فی الارض کا سماں پھر آنکھوں کے سامنے آگیا۔

میں سوچتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ یہ بوریہ نشین مرد درویش جس کی نہ کوئی پارٹی ہے نہ تنظیم' نہ تحریک' نہ نعرہ' نہ اخبار' نہ رسالہ' نہ اشتہار' نہ دربار' نہ اسباب نہ وسائل' شہرت و نمود کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہیں مگر اس کی مقناطیسی کشش کا یہ عالم ہے کہ ہر سطح اور ہر طبقہ کے لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں' سیکریٹریٹ سے لے کر عام لوگوں تک سے اس کا گہرا رابطہ ہے۔ یہ عرب وعجم کے دل کی دھڑکن بنا ہوا ہے اور اپنی آتش دروں اور حرارت قلب سے بے شمار قلوب کو گرما رہا ہے اور جدھر کو نکلتا ہے سیادت ووجاہت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ شیخ آدم بنوری الحسینیؒ کے فرزند کو قدرت یہ ساری دولتیں اسباب ووسائل کے بغیر عطا کررہی تھی' کیوں؟ اس لئے کہ اس صدی کے سب سے بڑے فتنہ' فتنۂ قادیانیت کے استیصال کا وہ عظیم الشان کام اس سے لیا جانا ہے جو مجدّدین اور صدّیقین سے لیا جاتا ہے۔ یہ ساری وہبی نوازشیں اسی کی تمہید ہیں۔

یاد آیا کہ ایک بار راقم الحروف نے حضرت سے عرض کیا کہ "حضرت! جس طرح امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے "اکبری فتنہ" کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لئے حکومت کے اعلیٰ ترین اہل مناصب کو رام کیا تھا' آج بھی اسی نہج پر کام کرنے کی ضرورت ہے"۔ یہ سن کر حضرتؒ نے فرمایا: "جی ہاں! بالکل صحیح ہے' حضرت مجددؒ صرف دین کے مجدد نہیں تھے بلکہ طریقۂ تجدید کے بھی مجدد تھے"۔ اس وقت اس ناکارہ کو یہ احساس نہیں تھا کہ اس دور کے فتنۂ عظیمہ کے خلاف' جس کی جڑیں حکومت میں اکبری دور کے ابو الفضل اور فیضی سے زیادہ گہری تھیں' حضرتؒ کو بھی قدرت امام ربانی کے نقش قدم پر چلارہی ہے اور حق تعالیٰ اس ملک کے صالح قلوب کو آپ کی طرف از خود متوجہ فرمارہے ہیں۔

بہرحال اس دور میں حضرتؒ نے "عقیدہ ختم نبوت" کی حفاظت کے لئے خاموشی سے کام شروع کردیا' اور اس کے لئے تین میدان منتخب فرمائے:

اول: اندورن ملک ہر طبقہ کے وہ سعید قلوب' جو اس مقصد کے لئے موثر اور

کار آمد ہوسکتے تھے' آپ نے انہیں تلاش کر کے جوڑنا اور قادیانیت کے خلاف انہیں منظم اور بیدار کرنا شروع کیا۔ ان میں علماء بھی تھے' وکلاء بھی' کاروباری بھی تھے اور سرکاری ملازمین بھی۔

حضرتؒ کو معلوم تھا کہ ملک میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" اس فتنہ کے خلاف منظم طور پر پوری یکسوئی' تندہی اور جانفشانی سے کام کررہی ہے' حضرتؒ نے اس کی بھی سرپرستی شروع کردی اور ہر ممکن طریقہ سے اس کی اعانت ونصرت فرمائی' مجھے یاد ہے کہ ان دنوں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے زعیم حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ (جو امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید اور خطیب العصر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے دست راست اور جانشین تھے) حضرتؒ کی خدمت میں کراچی حاضر ہوتے' کئی کئی دن قیام رہتا' گھنٹوں حضرت سے تنہائی میں مشورے کرتے۔ راقم الحروف ایک بار کراچی سے پنجاب گیا' مولانا محمد علی جالندھریؒ کی زیارت وملاقات میسر آئی' موصوف نے علیک سلیک کے بعد پہلا سوال اپنے مخصوص پنجابی انداز میں یہ فرمایا: "سنا پھیر میرے شیخ دا کی حال اے" اور "میرے شیخ" کا لفظ جس عظمت ومحبت کے لہجے میں ادا فرمایا اس کی حلاوت وشیرنی کا لطف کاغذ پر کیسے منتقل کردیا جائے؟

الغرض حضرت بنوریؒ نے خاموشی سے ان تمام حضرات کو اپنے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا جو اس فتنہ کی سرکوبی میں کوئی موثر کردار ادا کرسکتے تھے اور کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ مرد مجاہد ختم نبوت کا قلعہ تعمیر کرنے کے لئے کہاں کہاں سے اینٹ مصالحہ ڈھونڈ کر لا رہا ہے۔

دوم: قادیانی مسئلہ صرف پاکستان کا نہیں بلکہ خود اسلام کا مسئلہ تھا' اس لئے حضرتؒ نے عالم اسلام کے تمام اکابر علماء سے بھی رابطہ رکھا۔ انہیں قادیانی سازشوں کی تفصیلات سے مسلسل آگاہ کرتے رہے' ان کے گھناؤنے عقائد ونظریات کے علاوہ ان کی مسلم کش پالیسیوں سے انہیں چوکنا کرتے رہے اور اس رابطہ کے تین ذرائع تھے' اول یہ کہ باہر سے علماء کے جو وفود پاکستان آتے نیو ٹاؤن میں ان کی تشریف آوری ہوتی' دوسرے حضرت بھی بین الاسلامی کانفرنسوں میں شرکت کے لئے تشریف لے جاتے' تیسرے' سال میں کم از کم دو بار حرمین شریفین میں حاضری ہوتی' جہاں عالم اسلام کا دل

ودماغ سٹ آتا ہے۔ ان تمام مواقع میں جہاں حضرتؒ کی عظمت و محبت کا نقش عالم اسلام کے قلب پر مرتسم ہوتا' وہاں قادیانیت سے نفرت وبیزاری کی تحریک کو بھی انگیخت ہوتی۔ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں مکہ مکرمہ میں "رابطہ عالم اسلامی" کی کانفرنس میں دنیا بھر کی ۱۴۴ تنظیموں کے نمائندوں نے جو قرارداد متفقہ طور پر منظور کی تھی' کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کسی جانشین مجدد الف ثانیؒ کی محنتوں کے بغیر یہ سب کچھ ہوگیا تھا؟

حضرت اقدسؒ جہاں دنیا بھر کے علماء ومشائخ اور اعیان واکابر سے رابطہ قائم کیئے ہوئے انہیں قادیانی فتنہ کی سنگینی سے مسلسل آگاہ کررہے تھے' وہاں ارباب قلوب اور اصحاب باطن سے بھی رابطہ استوار تھا' اور انہیں بھی اس سلسلہ میں "صرف ہمت" اور دعا والتجاء کی طرف متوجہ رکھتے تھے۔

سوم: تیسرا اور آخری کام جو آپ نے کیا وہ عالم اسلام کے ارباب اقتدار (جن میں ملکوں کے سربراہ اور وزراء وسفراء سبھی شامل تھے) سے رابطہ قائم کرنا اور انہیں قادیانی فتنہ سے باخبر رکھنا تھا۔ عرب ممالک کے جو سفراء ہمارے ملک میں وقتاً فوقتاً تعینات ہوتے رہے' ان میں سے اکثر وبیشتر حضرتؒ کے شناسا بلکہ قدردان محب تھے۔ اسلامی ممالک کے امراء وزراء سے بھی اچھا تعارف تھا' خصوصاً پاسبان حرم شاہ فیصل شہیدؒ تو آپ کے بہت ہی قدر شناس تھے۔ شہید مرحوم سے آپ نے متعدد بار ملاقات بھی کی' اور انہیں بالمشافہ قادیانی فتنہ کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا۔ ایک ملاقات کا حال مولانا عبدالرحیم اشرف نے حضرتؒ کی زبانی قلمبند کیا ہے:

> "حضرت مولانا محمد یوسف بنوری متعنا اللہ بطول حیاتہ نے ایک ملاقات میں فرمایا کہ: "مرکزی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی تحریک سے کچھ پہلے آپ حرمین حاضر ہوئے' تو ایک دوست نے از خود یہ کوشش کی کہ جلالۃ الملک سے ملاقات ہو۔ ملاقات طے ہوگئی' مولانا شاہ کے ہاں تشریف لے گئے' ملک محترم نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا' اپنی کرسی سے بہت قدم آگے بڑھاکر مصافحہ فرمایا' گفتگو کامل التفات سے سنی (یہ گفتگو تمام تر قادیانیت پر تھی۔ ناقل) اور اکثر وبیشتر امور میں

پرزور تائید اور گرم جوشانہ حمایت کا وعدہ فرمایا' ملاقات ختم ہوگئی تو آرام سے مولانا کو الوداع کہنے دروازے تک تشریف لائے' مولانا اپنے رفیق کے ہمراہ شاہی محل سے نکل رہے تھے کہ شاہ شہید علیہ الرحمۃ بھی تشریف لائے' مولانا کو احساس ہوا تو راستہ سے ایک کنارے پر کھڑے ہوگئے۔ شاہ وہاں پہنچے تو مولانا سے حسب سابق آگے چلنے کو فرمایا' مولانا نے اس سے انکار فرمایا' اور شاہ سے درخواست کی کہ آپ ہی آگے چلیں' اس پر جلالۃ الملک نے مولانا کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں آگے چلنے پر مجبور کردیا' اور خود پیچھے پیچھے چلتے رہے اور جب شاہی محل کے دروازے تک پہنچے تو دوسری بار مولانا کو گرمجوشی سے الوداع کہا"۔

جہاں عالم اسلام کے ارباب حل وعقد کو اپنی نجی ملاقاتوں میں اس مسئلہ کی طرف متوجہ فرماتے' وہاں خطوط کے ذریعہ بھی توجہ دلاتے۔ افسوس ہے کہ حضرتؒ نے ان مکاتیب کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں فرمایا۔ ورنہ یہ ہماری تاریخ کا قیمتی' علمی واصلاحی ذخیرہ ہوتا' تاہم یہاں حضرتؒ کے دو خطوں کا خلاصہ درج کرتا ہوں' جو رفیق محترم جناب قاری سعید الرحمٰن کی وساطت سے راقم الحروف کو میسر آئے۔ ان میں پہلا خط شاہ فیصل شہیدؒ کے نام ہے اور دوسرا لیبیا کے صدر جناب کرنل معمر قذافی کے نام۔ یہ دونوں خط اس وقت لکھے گئے تھے جب ہمارے ہاں خدا کا قہر مسٹر بھٹو کے صدر اور عوامی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہونے کی شکل میں نازل ہورہا تھا۔ جب مسٹر ایم ایم احمد قادیانی کا طوطی بولتا تھا' جب قادیانی مسٹر بھٹو کے زیر سایہ پاکستان پر داد حکمرانی دے رہے تھے' اور جب ہمارے ملک کے سب سے نازک طبقہ .... فوج .... کو آغوش قادیانیت کے حوالے کردیا گیا تھا۔ ان دنوں حضرتؒ پر بے چینی کی جو کیفیت طاری رہتی تھی وہ ان کے خطوط کے بین السطور میں صاف پڑھی جاتی ہے۔

شاہ شہیدؒ کے نام تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیدی ومولائی! ہر شخص اپنی طاقت وقدرت کے بقدر اللہ تعالیٰ کے ہاں

جوابدہ ہے' آنجناب کو اللہ تعالیٰ نے وہ تمام وسائل عطا کر رکھے ہیں جن کے ذریعہ آپ ساری روئے زمین میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکتے ہیں۔

سیدی ومولائی! ہمیں علم ہے کہ جب ہمارے وطن عزیز پاکستان اور ظالم ہندوستان کے درمیان جنگ برپا ہوئی تو آنجناب نے پاکستان کی ہر ممکن مادی واخلاقی مدد فرمائی' جو سربراہان اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک قابل فخر نمونہ ہے' مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ آپ کے اس کارنامہ پر دل کی گہرائیوں سے شکریہ بجالائیں۔

سیدی ومولائی! آج پاکستان قادیانیت کی جانب سے عظیم خطرہ میں ہے۔ بحریہ کا سربراہ حفیظ قادیانی ہے' فضائیہ کا سربراہ چودھری ظفر قادیانی ہے' اور بری افواج میں ٹکا خان کے بعد سترہ جرنیل لگاتار قادیانی ہیں۔ حکومت یا تو اس مہیب خطرہ سے غافل اور جاہل ہے' یا پھر استعماری قوتوں' برطانیہ وامریکہ کے ہاتھ کا کھلونا بنی ہوئی ہے۔ وہ مسلمانوں کو فوجی مناصب سے برطرف کر رہی ہے اور قادیانیوں کو بھرتی کر رہی ہے۔ لاریب کہ قادیانی اور ان کا امام متنبئی کذاب۔ قبحہ اللہ۔ برطانیہ کا خود کاشتہ پودا اور برطانوی استعمار کا ساختہ دپرداختہ تھا' قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ حکومت برطانیہ "ظل اللہ فی الارض" ہے۔ جہاد منسوخ ہے اور یہ کہ تمام مسلمانوں پر برطانیہ کی نصرت وحمایت فرض ہے۔ وغیر ذالک من الکفر والہذیان۔

ان لوگوں کی کوشش ہے کہ کسی طرح برطانیہ کا عہد رفتہ واپس لوٹ آئے' اور پاکستان ان قادیانیوں کے ہاتھ میں آکر اس کا آلہ کار بنے اور برطانیہ کو از سرنو بحر احمر پر تسلط حاصل ہوجائے۔ اس بدترین سازش کے ہولناک نتائج آنجناب سے مخفی نہیں ہیں۔ آنجناب سے توقع رکھتا ہوں کہ پاکستان کو قادیانیوں کے چنگل سے چھڑانے میں اس کی مدد کریں۔ صدر بھٹو کو ان ہولناک نتائج سے متنبہ فرمائیں اور اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں کہ وہ ان لوگوں کو کلیدی مناصب سے

الگ کردیں، تاکہ یہ لوگ اسلام کے لئے اور اسلام سے پہلے خود بھٹو کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ الغرض آپ اس نہایت خطرناک مصیبت کبریٰ سے پاکستان کو بچانے اور بھٹو کی کج روی کی اصلاح کے لئے ہر ممکن جہد بلیغ فرمائیں اور محض اللہ کی رضا کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا فرمودہ طاقت وقوت اور وسائل کے ذریعہ آپ وہ کردار ادا کریں جو واقعی ایک خلیفہ اور امام المسلمین کو فہم وبصیرت اور قوت کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔

ہم جناب والا کے حق میں ہر خیر وسعادت کے متمنی ہیں اور آرزو رکھتے ہیں کہ آپ کے مبارک ہاتھوں کے ذریعہ اسلامی ممالک کو ان ریشہ دوانیوں اور ملعون سازشوں سے نجات ملے۔ اللہ تعالیٰ آنجناب کی ذات کو اسلام کے لئے ذخیرہ اور مسلمانوں کی پناہ گاہ کی حیثیت سے باقی رکھے اور ربانی سائے تلے، جس کے جھنڈے آپ کے ملک پر لہراتے ہیں، آپ کی سلطنت کو بقائے دوام بخشے۔ آخر میں میری طرف سے آنجناب کی ذات اور مملکت کے حق میں بہترین دعائیں اور گہری تمنائیں قبول فرمائیں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اور لیبیا کے صدر کرنل قذافی کے نام تحریر فرمایا:

"بعد از سلام مسنون گذارش ہے کہ مجھے آنجناب کی زیارت کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب کہ طرابلس کی پہلی "دعوت اسلامی کانفرنس" میں مندوب کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔ آنجناب کی شخصیت میں اخلاص، قوت ایمان اور سلامتی فطرت کے آثار دیکھ کر اول وہلہ میں آپ کی محبت میرے دل میں جاگزین ہوئی۔ بعد ازاں آپ کی خیر وسعادت کی خبریں ہم تک پہنچیں جن کی وجہ سے آپ بلاشبہہ داد وتحسین کے مستحق اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے مایۂ فخر ہیں، حق تعالیٰ آپ کو اسلام کے لئے ذخیرہ اور مسلمانوں کی پناہ گاہ کی حیثیت سے

سلامت رکھے' اور آپ کے وجود گرامی سے اسلام اور عرب کی عزت و مجد کے علم بلند ہوں۔ آمین

برادر گرامی قدر! آپ نے پاکستان کے موقف کی تائید کرکے اور ہر ممکن مادی مدد مہیا فرما کر جو احسان فرمایا ہے اس کا ہمیں اجمالی علم ہوا' حق تعالیٰ آپ کو اس حسن سلوک کا بدلہ عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت میں آپ پر انعامات فرمائیں۔ آمین

اور اب میں آنجناب کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک عظیم خطرہ میں گھرا ہوا ہے اور وہ ہے فتنہ قادیاں یا قادیانی تحریک۔ بحریہ کا قائد ایک بڑا قادیانی ہے' فضائیہ کا سربراہ قادیانی ہے' اور بری فوج میں ٹکا خان کے بعد سترہ جرنیل ہیں جو سب قادیانی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ٹکا خان بھی ریٹائر ہوجائیں گے۔ حکومت مسلمان افسروں کو فوجی مناصب سے معزول کررہی ہے۔ صدر کا اقتصادی مشیر ایم ایم احمد قادیانی ہے اور سر ظفر اللہ خان کے' جو بڑا خبیث سازشی قادیانی ہے صدر سے خصوصی روابط ہیں اور صدر اس کے مشوروں کی تعمیل کرتا ہے۔

غالباً آنجناب کو علم ہوگا کہ اس گروہ کا ضال و مضل مقتدا مرزا غلام احمد قادیانی مدعی نبوت تھا' اس نے پہلے مجدد' مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ بعد ازاں نبوت کا دعویٰ کردیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ برطانوی حکومت روئے زمین پر خدا کا سایہ ہے' جہاد منسوخ ہے اور یہ کہ برطانیہ کی نصرت وحمایت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ وغیر ذالک من کفر وھرا۔

"قادیان" کے بعد (جو ہندوستان میں رہ گیا) انہوں نے مغربی پاکستان میں "ربوہ" آباد کیا' جس کی حیثیت ان کے دارالخلافہ کی ہے۔ وہاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑی سرگرمی سے سازشیں تیار ہوتی ہیں۔ اور یہ عجلت میں تحریر کردہ عریضہ ان تفصیلات کا متحمل نہیں۔ میں آنجناب سے اس وقت دو گذارشیں کرنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ صدر بھٹو کو اس خطرۂ عظیمہ سے آگاہ کیجئے۔ یعنی قادیانی بغاوت، ملک کا قادیانی حکومت کے تحت آجانا، بحر احمر میں برطانیہ کی عزت رفتہ کا دوبارہ لوٹ آنا، اور بیک وقت تمام عربی واسلامی ممالک کا ناک میں دم آجانا۔ پس آنجناب سے درخواست ہے کہ آج حکومت پاکستان کو قادیانیوں کے، یا بلفظ صحیح برطانیہ کے چنگل سے چھڑا کر اس پر احسان کیجئے، جیسا کہ قبل ازیں آپ اس کی اخلاقی ومادی امداد کر کے اس پر احسان کر چکے ہیں۔اور محض اللہ تعالیٰ کی، اس کے رسول کی، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے لئے ہر قسم کی تدبیر و حکمت اور عزم وحزم کے ساتھ "صدر بھٹو" کی کج روی کی اصلاح کیجئے۔ بلاشبہ اسلام کی یہ عظیم الشان خدمت اللہ ورسول کی رضامندی کا موجب ہوگی۔ اسی کے ذریعہ اس رخنہ کو بند کیا جاسکتا اور اس شگاف کو پر کیا جاسکتا ہے کیونکہ فتنہ کا سیلاب خطرہ کے نشان سے اوپر گزر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت ومدد فرمائے۔ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا"۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ جمہوریہ لیبیا میں جو قادیانی ڈاکٹر یا انجینئر کی حیثیت سے آئے ہیں انہیں نکالیے۔ سنا گیا ہے کہ آپ کے ملک میں قادیانیوں کی ایک بڑی تعداد آئی ہے۔ ان میں ایک ڈاکٹر خلیل الرحمٰن طرابلس میں ہے۔ جو شعاؤں کے ذریعہ سرطان کے علاج کا خصوصی ماہر ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا سراغ لگایا جائے اور محض اللہ کی، اس کے رسول کی، اس کی کتاب کی اور مسلمانوں کے قائدین کی خیر خواہی کی غرض سے آپ کو ان کی اطلاع دی جائے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت اسلام اور مسلمانوں کی مدد میں ثابت قدم رکھے، آپ کو اپنی رضا اور اپنے دین کی خدمت کی مزید توفیق عطا فرمائے اور آپ کے ہاتھ سے خیر وسعادت کے وہ کام لے جن

کے ذریعے مشرق و مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کی عزت و مجد میں اضافہ ہو۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مخلص

محمد یوسف البنوری

خادم الحدیث النبوی الکریم فی کراتشی

مندوب موتمر الدعوۃ الاسلامیہ الاول من باکستان

الغرض یہ تین میدان تھے جن میں حضرتؒ نے قادیانیت کے مقابلہ میں کام کیا اور جن کا دھندلا سا خاکہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ قادیانیت سے آخری جنگ لڑنے کے لئے حضرتؒ نے اپنی بساط کی حد تک اسباب و وسائل مہیا کرلئے تھے۔ اندرون وبیرون ملک اس کے لئے زمین تیار کی جاچکی تھی اور حضرتؒ کے سوزدروں اور آتش جگر نے اس فتنہ کے خلاف ملت اسلامیہ کو آتش فشاں میں تبدیل کردیا تھا۔ تا آنکہ ادھر قدرت آپ کو "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی قیادت کے لئے کھینچ لائی اور ادھر خود قادیانیوں کے ہاتھ سے ربوہ اسٹیشن کے سانحہ کا دھماکہ کرادیا۔ جس سے ملت اسلامیہ کا آتش فشاں شعلے اگلنے لگا اور قادیانیت کفر کے خاکستر میں ڈھیر ہوکر رہ گئی۔ [1]

قادیانیت کے خلاف حضرتؒ نے جو کارنامہ انجام دیا اس کے لئے دست قدرت نے آپ کو خود تیار کیا تھا، اور پیکر یوسفی میں لطیفۂ نصرت خداوندی کارفرما تھا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اور حضرتؒ کا یہ کارنامہ میرے نزدیک آپ کے "مقام صدیقیت" کا ظہور تھا، جس میں مجددانہ روح کارفرما تھی، اس لئے سید آدم بنوری کے فرزند گرامی کا یہ کارنامہ اس کے تمام اوصاف وکمالات اور فضائل ومناقب پر بھاری نظر آتا، اور بغیر کسی مبالغہ کے آپ کے حق میں وہی تاریخی الفاظ دہرائے جاسکتے ہیں جو آپ کے قلم عنبر رقم سے اپنے شیخ انورؒ کے حق میں نکلے تھے:

فهذه عندی میزة کبری اکبر من سائر مزایا الشیخ رحمه الله وتفوق سائر مآثره السامیه فلو لم یکن للشیخ حسنه غیر هذه الحسنه العظیمه ومنقبة غیر هذه المنقبه العالیه لکفاه شرفا وفضلا ولکفاه شهادة علی انه کان ربانی هذه الامة بعهده' فهذه منقبة زهراء من بین سائر مآثره الخالدة یبقی آثارها الجمیلة فی قلوب اهل الحق' وتتلألأ لامعة علی صفحات التاریخ الاسلامی علی انقراض الدهور وانقضا العصور۔

"میرے نزدیک یہ عظیم الشان کارنامہ شیخ رحمہ اللہ کے تمام کمالات سے بڑا اور ان کے تمام مآثر سامیہ سے فائق ہے اگر شیخ" کے نامۂ اعمال میں اس حسنہ عظیمہ کے علاوہ کوئی نیکی اور اس منقبت کے سوا کوئی فضیلت نہ ہوتی تب بھی آپ کے شرف وفضیلت کے لئے کافی تھی اور یہ اس امر کی کافی شہادت تھی کہ آپ اپنے دور کے ربانی ہیں۔ پس یہ آپ کے دائمی مآثر میں سے زیادہ روشن منقبت ہے۔ جس کے آثار جمیلہ اہل حق کے قلوب میں باقی رہیں گے' اور آپ کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک اسلامی تاریخ کے صفحات پر درخشاں رہے گا۔"

مشرقی فتنہ: آج سے قریباً نصف صدی پہلے پنجاب و سرحد میں عنایت اللہ خان مشرقی کا غلغلہ بلند تھا' ایک طرف ان کی بیلچہ دار "چپ وراست" کی گونج درودیوار سے ٹکرا رہی تھی تو دوسری طرف ان کے "عسکری اسلام" نے ذہنی فضا میں ایک ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔

دنیا کے بڑے بڑے ائمۂ ضلال اور دُعاۃ فتنہ کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو بعض چیزیں ان میں قدر مشترک نظر آئیں گی' مثلاً بلا کی ذہانت' غضب کی قائدانہ صلاحیت' بے پناہ کبر وغرور' انتہائی خودرائی وخودپسندی' سلف صالحین کی تحقیر' ہر بات میں نئی اختراع کا شوق' نمود ونمائش کا جذبہ اور تعمیر کے نام پر دین وایمان اور قوم ووطن کی تخریب۔

عنایت اللہ خان مشرقی بھی اس گروہ کے سرخیل تھے۔ وہ اپنے تئیں "علامہ" کہتے تھے۔ انہیں غلط فہمی تھی کہ قرآن کے مفہوم ومعانی عرش معلّٰی سے پہلی بار انہی کے دماغ پر نازل ہوئے ہیں۔ انہوں نے اسی غرہ میں قرآن کریم پر مشق شروع کردی۔ پہلے

"تذکرہ" نامی کتاب لکھی۔ یہ ان کے الحاد کا نقش اول تھا۔ پھر کچھ عرصہ خاموشی کے بعد "اشارات" لکھی، "خاکسار" تنظیم کی بنیاد ڈالی، ایک پرچہ جاری کیا اور بالآخر "مولوی کا مذہب غلط" نامی کتابچہ کے نمبر نکالنا شروع کر دیئے۔ یہ ان کی ساری ذہنی و فکری صلاحیتوں کا ماحصل تھا۔

چونکہ عنایت اللہ خان مشرقی پشاور کی انگریزی درس گاہ میں مدرس رہ چکے تھے اس لئے وہاں ان کا خاصہ حلقہ اثر تھا اور حضرت بنوریؒ جب فارغ التحصیل ہونے کے بعد پشاور پہنچے تو مشرقی نظریات اور علماء کے درمیان معرکہ کارزار برپا تھا۔ حضرتؒ آتے ہی اس میدان جہاد میں کود گئے، خاکساروں کو "ہل من مبارز" کا چیلنج کیا اور جلسوں اور تقریروں سے مشرقی فتنہ کا ناطقہ بند کر دیا، خاکساروں کا دعویٰ تھا کہ مشرقی صاحب کو علمائے مصر نے "علامہ" کا خطاب دیا ہے۔ علمائے ہند اس کے مقام و مرتبہ کو تو کیا پہنچتے اس کی باتیں سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے، حضرت بنوریؒ مشرقی کے اس منبع علامیت کو خشک کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ مجلس علمی ڈابھیل کے مندوب کی حیثیت سے نصب الرایہ اور فیض الباری چھپوانے کے لئے مصر گئے تو مشرقی کی کتاب "تذکرہ" علمائے مصر کو دکھائی اور اس کی تحریفات و کفریات سے انہیں آگاہ کیا۔ اس پر بعض علمائے مصر نے ایک استفتاء مرتب کیا اور علمائے ازہر کی جماعت کے ایک رکن اور "الازہر" کے مفتی شیخ یوسف دجوی نے اس کا جواب لکھا، جس میں مشرقی نظریات پر شدید تنقید کی گئی اور انہیں صریح کفر و الحاد قرار دیا گیا، غالباً مصر میں اس فتویٰ سے علمائے ہند کے بارے میں یہ تاثر لیا گیا کہ انہوں نے ایسے گمراہ شخص کا کیوں نوٹس نہیں لیا۔ اس پر حضرتؒ نے صورت حال کی وضاحت کے لئے ایک مختصر سا مضمون لکھا جو وہاں کے مجلّہ "الاسلام" جلد ۷، شمارہ ۴۱، ۲۴ شوال ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۶ دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ مقالہ کا عنوان تھا: "کلمۃ عن الالحاد وکتاب التذکرۃ لاحد ملاحدۃ المشرق وجهود علماء الهند فی هذا الصدد" حضرتؒ کا یہ تاریخی مقالہ ان کی دینی حمیت اور تب و تاب کا مرقع ہے، دین اسلام پر ملاحدہ کی دست درازیوں کا شکوہ کرتے ہوئے اسلام کی بے کسی کا نقشہ کس درد سے کھینچا ہے:

اصبح الدین کمثلہ غنم لا راعی لها، او مرتع خصب لا ذائد عن حماہ، او یتیم مات ابواہ فاصبح من لا یجد من یربیہ ویحنو علیہ او

مریض مدنف اشرف علی الموت لا یلقی طبیبا یداویہ بجرعۃ من دواء

-

"آج دین کی حالت اس ریوڑ کی سی ہے جس کا کوئی گلہ بان نہ ہو یا اس سرسبز چراگاہ کی سی ہے جس کا کوئی رکھوالا نہ ہو یا اس بے کس یتیم کی سی ہے جس کے ماں باپ مر چکے ہوں اور بھری دنیا میں اسے کوئی مربی اور شفیق میسر نہ آئے یا اس لاغر اور جاں بلب مریض کی سی ہے جسے کوئی طبیب نہ ملے جو اس کے منہ میں دوائی کا ایک گھونٹ ہی ڈال دے۔"

مولانا اس مقالہ میں بتاتے ہیں کہ دین ملاحدہ کے نرغہ میں ہے' اس پر چہار جانب سے یورش ہو رہی ہے مگر مسلمان ہیں کہ وہ خواب غفلت میں مست' دین سے بے فکر' معاشی دوڑ میں منہمک اور عیش پرستی میں مگن ہیں' اسلامی شعائر پامال ہو رہے اور خود مسلمان اسلام کے بجائے مغرب کے شعار کفر پر فخر کر رہے ہیں' اس گراوٹ کو دیکھ کر مولاناؒ بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں:

لمثل	ھذا	یذوب	القلب	من	کمد
ان	کان	فی	القلب	اسلام	وایمان

"اس حالت میں دل غم سے پگھل جاتے ہیں۔ اگر دل میں اسلام و ایمان ہو۔"

اور پھر مسلمانوں کو عموماً اور علمائے کرام کو خصوصاً غیرت دلاتے ہیں:

عار واللہ علی الذین یحملون لواء الدین وینوؤن بثقل اعبائہ علی اکتافھم ان یسکتوا عن مثل ھذہ الحالۃ المنکرۃ الفظیعۃ او یقصروا فی القیام للدفاع بالقدر الذی یستحقہ ھذا الفشل وتتطلبہ تلک الفوضی۔

"جو لوگ دین کے علمبردار اور اس کے بار کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں بخدا! ان کے لئے بڑے شرم کی بات ہے کہ وہ ایسی قبیح اور

گھناؤنی حالت دیکھ کر سکوت اختیار کریں' یا یہ طوفان اور لاقانونیت
جس قدر مقابلہ کی مستحق ہے اس کے ادا کرنے میں کوتاہی کریں۔"

اور پھر عنایت اللہ مشرقی کا تذکرہ شروع ہوتا ہے اور مولانا بتاتے ہیں کہ جب مشرقی کے کفر والحاد کا طور مار سامنے آیا تو علمائے ہند اس کے مقابلے کے لئے کھڑے ہوئے' اور دین کی پاسبانی کا حق ادا کردیا۔

ودعاه العلماء للبحث والمناظرة مرات وراقم هذه السطور من الذين دعوا هذا الرجل وحزبه للمناظرة لكنه جبن ولم يحضر۔

"اور علماء نے اس کو کئی بار بحث و مناظرہ کی دعوت بھی دی' خود ان سطور کا راقم ان لوگوں میں ہے جنہوں نے اس کو اور اس کی جماعت کو مناظرہ کا چیلنج کیا مگر اسے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔"

مشرقی کے مقابلے میں علمائے ہند کی کوششوں کے ضمن میں مولانا نے "مجلس احرار اسلام" اور اس کے جواں سال مجاہدین مولانا بہاء الحق قاسمی اور مولانا غلام غوث ہزاروی کا خصوصی تذکرہ فرمایا ہے:

"فللعلماء الهند فى هذا السبيل جهود تشكر دائما' فهم لم يغفلوا ولم يتغافلوا' ولم يحجموا ولم يقصروا۔ وعلى الاخص "جماعة احرار الاسلام" فى الهند' فان لها مجهودات كبيرة' ومن المبرزين فى هذه الجماعة السباقين الى الغايات الاستاذ الفاضل بهاء الحق قاسمى وصديقنا الفاضل الاستاذ غلام غوث الهزاروى فانهما قد القماه احجارا فى فيه' وسدا عليه كل حيلة يحتالها' وتركا فتنته بين انياب الاسد فنشكر لهما جليل خدمتهما ودفاعهما عن الدين والاسلام' وفقهما الله للخدمة الصحيحة وبارك الله فى مساعيهما المنجحة وجهودهما المثمرة"۔

اسی مقالہ کے آخر میں مولاناؒ نے یہ بھی بتایا ہے کہ شیخ یوسف دجویؒ "مفتی الازہر"

نے مشرقی کے کفر والحاد کا جو فتویٰ لکھا اس پر مولانا نے دیگر علمائے مصر کی تصدیقات بھی لی تھیں۔

وعلى الجواب توقيعات وعبارات عدة من الأكابر من اجلة العلماء بالقاهرة' محفوظة عندي۔

"اس فتویٰ پر قاہرہ کے بہت سے اکابر اور جلیل القدر علماء کی عبارتیں اور مہریں بھی ثبت ہیں جو میرے پاس محفوظ ہیں۔"

افسوس ہے کہ یہ فتویٰ مجھے نہیں ملا' ورنہ ایک تاریخی چیز ہوتی' بہرحال یہ فتویٰ لے کر حضرت مولانا مصر سے ہندوستان آئے اور یہاں اس کی اشاعت ہوئی تو .... یہ بات واضح ہوگئی کہ علمائے ازہر کی نظر میں عنایت اللہ مشرقی کی علمی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کے نظریات کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ مصر سے واپسی پر مولانا پشاور آئے تو خاکساروں سے پھر معرکے ہوئے اور مانسہرہ میں گرفتاری کی نوبت بھی آئی۔ بالآخر مشرقی فتنہ فرو ہوگیا اور حضرتؒ نے اپنے اس مقالہ میں جو آخری فقرہ لکھا تھا وہ پوری طرح صادق آیا: **اذا جاء نہر اللہ بطل نہر معقل۔**

حضرتؒ نے مصر جانے سے پہلے حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی کتاب "مشکلات القرآن" کا مقدمہ "يتيمة البيان" کے نام سے لکھا تھا (جسے حال ہی میں دوبارہ طبع کیا گیا) اس میں مشرقی کی کتاب "تذکرہ" پر بحث کرتے ہوئے اس کے افکار و نظریات کا بڑا اچھا خلاصہ نقل کردیا ہے' تطویل کے اندیشہ سے اسے چھوڑتا ہوں۔

مشرقی صاحب نے ایک اور فتنہ (جو شاید اپنی نوعیت کا سب سے سنگین فتنہ تھا) یہ اٹھایا کہ ہندوستان کی مساجد قبلہ رخ نہیں ہیں' اس لئے کسی کی نماز صحیح نہیں ہوتی۔ مشرقی صاحب کا یہ فتویٰ اگرچہ قواعد شرعیہ سے جہل وناواقفی اور کبر واعجاب کا نتیجہ تھا' مگر اس سے ہندوستان بھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور علمائے امت کے پاس بکثرت سوالات آنے لگے' چنانچہ ایک سوال حضرتؒ کے پاس بھی آیا اور آپ نے اس کے جواب میں "بغية الاريب في مسئلة القبلة والمحاريب" کے نام سے ایک ایسا رسالہ لکھا جسے اپنے موضوع پر حرف آخر کہنا چاہیئے' حضرتؒ بارہا ازراہ تشکر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت حکیم الامتؒ نے "بیان القرآن" میں میری اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔

پرویزی فتنہ: انگریز کے عہد نحوست مہد میں جو تحریکیں اسلام کو مسخ و محرف کرنے کے لئے اٹھیں ان میں سب سے پہلی تحریک نیچریت کی ہے، پھر ایک طرف "قادیانیت" نے نئی نبوت کے روپ میں جنم لیا اور دوسری طرف "چکڑالویت" نے انکار حدیث کا فتنہ برپا کیا، اس کے بعد "خاکسار تحریک" نے سر اٹھایا اور پھر ان سب تحریکوں کا سڑا ہوا ملغوبہ مسٹر پرویز کے حصہ میں آیا اور ان سب پر کمیونزم کا تعفن اور مستزاد ہوا، چنانچہ پرویزی لٹریچر میں کمیونزم کا پورا معاشی ڈھانچہ اور اس کی مذہب بیزاری، نیچریت کی مادہ پرستی، قادیانیت کا انکار وجود، چکڑالویت کا انکار سنت، خاکساروں کی تحریف و تاویل، سب خرابیاں یکجا موجود ہیں، اور مسٹر پرویز کے قلم کی روانی نے ان غلاظتوں میں اور اضافہ کردیا ہے۔ "فزادتهم رجسا الى رجسهم"

مسٹر غلام احمد پرویز بد قسمتی سے مرزا غلام احمد قادیانی کا ہم نام بھی ہے ہم وطن بھی، الحاد وزندقہ میں اس کا ہم مسلک بھی۔ وہ ایک زمانہ میں حدیث وسنت کا پرجوش حامی تھا اس موضوع پر موصوف کا ایک مقالہ جو "الفرقان لکھنؤ" میں چھپا تھا، راقم الحروف کی نظر سے گذرا ہے لیکن بد قسمتی سے انگریزی دور اقتدار نے دہلی کے سیکریٹریٹ میں پرویز صاحب کی ساخت وپرداخت کی، موصوف نے اپنے پیشرو داعیان ضلال کے افکار و نظریات کو جذب کیا اور انہیں نئے انداز میں اگلنا شروع کیا، اس کے لئے انجمن "طلوع اسلام" کی بنیاد ڈالی۔ موصوف کے ذہنی خیالات کا خاکہ ابھی غیر مرتب ہی تھا کہ ملک تقسیم ہوا اور پرویز صاحب کو دہلی سیکریٹریٹ کے بجائے کراچی سیکریٹریٹ میں پناہ ملی، یہاں کی لادین فسر شاہی کا آشیرباد سے موصوف نے "قرآنی نظام ربوبیت" کا خاکہ مرتب کیا، جس کے دستور اساسی کی پہلی دفعہ یہ تھی:

> "قرآن کریم میں جہاں اللہ ورسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد "مرکز نظام حکومت" ہے۔ (معارف القرآن ج ۴، ص ۶۲۳)

مرزا غلام احمد قادیانی مسکین کو "رسول اللہ" بننے کے لئے وحی والہام کا افسانہ تراشنا پڑا تھا، مگر چودھری غلام احمد پرویز کی "قرآنی بصیرت" نے غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان وغیرہ کو بیک جنبش قلم "خدا ورسول" بنادیا۔ اس قدر افزائی پر ارباب اقتدار کی

باچھیں کھل گئیں' پرویز صاحب کے افکار و نظریات کی اشاعت کے لئے سرکاری وسائل کے دہانے کھل گئے۔

پرویز صاحب نے "خدا و رسول" تو نئے تلاش کر لئے اب سوال ہوا کہ اس نئے "خدا و رسول" کی اطاعت کیسے کی جائے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا کیا کیا جائے؟ پرویز صاحب کی "بصیرت" نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس پورے دین کو ان کے نئے "خدا و رسول" یعنی ارباب اقتدار کے اپنے منشا کے مطابق بدلنے' ڈھالنے دیا جائے۔ وہ نماز کو بدلنا چاہیں تو بدل دیں' روزہ پر خط تنسیخ پھیرنا چاہیں تو پھیر دیں' نظام زکوٰۃ کو گڑبڑ کرنا چاہیں تو کریں۔ الغرض ارباب اقتدار (یا پرویز صاحب کے خدا و رسول) کا کام ہے دین کو مسخ کرنا اور مسلمانوں کا کام ہوگا اس نت نئے مسخ شدہ دین پر بغیر چون و چراں کے عمل کرنا۔۔۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"قرآن کے ساتھ انسان کو بصیرت عطا ہوئی ہے اس لئے جن امور کی تفصیل قرآن نے خود بیان نہیں کی ان کی تفصیل قرآنی اصولوں کی روشنی میں از روئے بصیرت متعین کی جائے' یہی رسول اللہ نے کیا اور ہمارے لئے بھی ایسا کرنا منشائے قرآنی اور سنت رسول اللہ کے عین مطابق ہے۔ اس باب میں اخلاق' معاملات اور عبادات میں کوئی تفریق و تخصیص نہیں' اگر تفریق مقصود ہوتی تو عبادت کی جزئیات قرآن خود ہی متعین کر دیتا ہے"۔

(مقام حدیث ج ۱ ص ۴۲۴)

"جس اصول کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ قانون اور عبادت دونوں پر منطبق ہوگا' یعنی اگر جانشین رسول اللہ (قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں' جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے ماتحت کچھ رد و بدل ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہے"۔

(قرآنی فیصلے ص ۱۴)

چلئے دونوں اصول طے ہو گئے' اول یہ کہ پاکستان میں "خدا و رسول" حکمران ٹولے کا نام ہے دوسرے یہ کہ پرویز صاحب کے یہ "خدا و رسول" اسلام کے عقائد و عبادات'

اخلاق و معاملات اور سیاست و معاشرت میں جو رد و بدل کرنا چاہیں اس کی انہیں کھلی چھٹی ہے گویا مسٹر پرویز کے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پورا دین تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اس ردوبدل کا خاکہ خود پرویز صاحب کو مرتب کرنا تھا اور وہ جن خطوط پر اس خاکہ میں رنگ بھرنا چاہتے تھے اس کی صرف دو مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) حلال و حرام کا قصہ یوں نمٹایا گیا کہ:

"سید محمد صبیح صاحب نے اس رسالہ (حلال و حرام کی تحقیق) میں بتایا ہے کہ قرآن کی رو سے صرف مردار' بہتا ہوا خون' لحم خنزیر اور غیر اللہ کے نام کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں (گویا پیشاب پاخانہ بھی حلال۔ناقل) یہ قرآن کا واضح فیصلہ ہے جس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ ہمارے مروجہ اسلام میں حلال و حرام کی جو طولانی فہرستیں ہیں وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں اور کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی شے کو حرام قرار دے دے۔ یہ حق صرف اللہ کو ہے"۔

(طلوع اسلام مئی ۵۲ء ص ۶۹)

(۲) اور پورے دین کے بارے میں یہ فلسفہ ارشاد ہوا کہ قرآنی احکام عبوری دور کے لئے ہیں' ورنہ اسلام کا اصل منشا مارکس ازم قائم کرنا ہے:

"اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن میں وراثت وغیرہ کے احکام کس لئے دیئے گئے ہیں؟ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے اس لئے وہ جہاں اس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے عبوری دور کے لئے بھی ساتھ کے ساتھ رہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت' قرضہ' لین دین' صدقہ و خیرات سے ------ متعلق احکام اسی عبوری دور سے متعلق

ہیں جس میں سے معاشرہ گزر کر انتہائی منزل تک پہنچتا ہے"۔(اور انتہائی منزل وہی مارکس ازم۔ناقل)

(نظام ربوبیت ص۲۵)

انہی دو اقتباسات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ پرویز صاحب نے اپنے "مرکز ملت" کو شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف صلوۃ وسلام) کے منسوخ کرنے کی سند مرحمت فرمادی تھی۔

مسٹر پرویز کو احساس تھا کہ علماء' موصوف کے اس خود تراشیدہ "بت" کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوں گے اور نہ "پرویز کے خدا ورسول" کو اسلام میں ترمیم و تنسیخ کی اجازت دیں گے' اس لئے پرویز صاحب نے اسلام کے تمام اصول وفروع کے ساتھ ساتھ اسلام کی سیکورٹی فورس "(علمائے امت") کی طرف اپنی الحادی توپوں کا رخ موڑ دیا' کبھی نماز کا مذاق اڑایا جارہا ہے' کبھی زکوۃ کا' کبھی روزے اور کبھی حج کا' کبھی جنت اور کبھی دوزخ کا' کبھی آخرت کا۔

اور ان سب سے پہلے اس "ملا" کو نشانہ بنایا گیا جو حریم اسلام کی پاسبانی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"جب تک دین کی باگ مولوی کے ہاتھ میں ہے' صدقات نکلتے رہیں گے' زکوۃ دی جاتی رہے گی' قربانیاں ہوتی رہیں گی' لوگ حج بھی کرتے رہیں گے اور قوم بدستور بے گھر' بے در' بھوکی ننگی اسلام کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کا موجب بنی رہے گی"۔

(قرآنی فیصلے ص۵۲)

پرویز صاحب "مرکز ملت" کی طاقت سے پورے دین کو تلپٹ کرنا چاہتے تھے' لیکن علمائے امت ان کے خاکوں کے رنگ میں بھنگ ڈال دیتے تھے' پرویز صاحب کے خدا ورسول (جن کو وہ مرکز ملت سے بھی تعبیر کرتے ہیں) نے اول تو "ملاؤں" کو سمندر پار بھجوانے کی دھمکی دی' مگر اس کی تعمیل ذرا مشکل نظر آئی تو دوسری تجویز سوجھی کہ باہر سے جید اہل علم کو بلوا کر ان کے سامنے پرویز صاحب اپنے سحر آفرین "نظام ربوبیت" کی توضیح فرمائیں تو شاید پاکستان کے علماء بھی مسحور ہوجائیں اور ساتھ کے ساتھ پرویز صاحب

نے دین میں رد و بدل کی جو سکیم تیار کر رکھی ہے اس کی پہلی قسط کی تصدیق ان بیرونی اہل علم سے ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء کے اواخر اور ۱۹۵۸ء کے اوائل میں لاہور میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی۔ جس کا اہتمام بڑے طمطراق سے پرویز کے "خدا و رسول" نے کیا تھا اور اس برات کے دولہا خود پرویز صاحب تھے' بحث کا موضوع "بینک کے سود کی حلت" اور "بے پردگی کی اجازت" تھا' جس میں ساری دنیا مبتلا ہے' مصر سے خاص طور پر اہل علم کو مدعو کیا گیا' کیونکہ مصر ایک مدت سے "آزاد خیالی" میں پیشرو تصور کیا جاتا ہے۔ پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کو دعوت دی گئی۔ ہندوستان سے مولانا سید ابو الحسن ندوی لکھنوی اور "صدق جدید" کے ایڈیٹر کو بلایا گیا۔

عرب ممالک سے جو مندوبین تشریف لائے حضرت بنوریؒ کا ان سے تعارف تھا وہ کراچی اتر کر نیو ٹاؤن تشریف لائے تو حضرت بنوریؒ نے نوکر شاہی کی سازش' پرویز صاحب کی اسکیم اور اس مجلس مذاکرہ کے اغراض و مقاصد ان کے سامنے تفصیل سے بیان کیے۔ دنیا بھر کے مسلمان خواہ کتنے ہی گئے گزرے ہوں ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ پرویز کے "مرکز ملت" کو خدا و رسول ہونے کی سند عطا کریں گے یا اسلامی احکام و قوانین میں کسی بدمست مۓ اقتدار کو تراش خراش کی اجازت دے دیں گے کھلا جنون ہے اور اس کی توقع سکندر مرزا کے سائے میں پرویز صاحب ہی سے کی جا سکتی تھی' کسی عالم دین سے اس کی امید کب ہو سکتی تھی۔

چنانچہ جب مندوبین نے مجلس مذاکرہ میں پرویز صاحب کا مقالہ سنا تو مجلس کی بیشتر کاروائی اس کی تنقید پر صرف ہوئی' اور پرویز صاحب اور ان کے "خدا و رسول" کو وہ ذلت دیکھنا پڑی جس کا گھاؤ آج تک ان کے جگر میں ہو گا۔

اقتدار کے سائے میں پرویز صاحب کے نظریات کی نشر و اشاعت ہو رہی تھی۔ علمائے امت اور ارباب قلم اس کی تحریفات کا توڑ کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے بحث و جدال کا معرکہ برپا تھا' حضرتؒ نے محسوس کیا کہ یہ "سنار کی کھٹ کھٹ" اس فتنہ کے قلع قمع کے لئے کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس شجرۂ خبیثہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے پرویزی لٹریچر جمع کرایا' اور پرویزی کفریات کو ایک استفتاء کی شکل میں مرتب کر کے جناب مفتی ولی حسن ٹونکی مفتی مدرسہ عربیہ اسلامیہ سے اس کا جواب لکھوایا' اور پھر فتویٰ کو علمائے پاک و ہند کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان

کے تمام دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ علماء نے متفقہ طور پر تصدیق کی کہ جو شخص ان نظریات کا پرچارک ہو جو پرویز صاحب کی کتابوں سے مرتب کیے گئے ہیں، اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس طرح چودھری غلام احمد پرویز کو اس کے ہم نام، ہم وطن اور ہم مسلک مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ وادی کفر میں دفن کردیا گیا۔

اس فتویٰ کو قریباً ایک ہزار علماء کی تصدیقات کے ساتھ ایک رسالہ کی شکل میں شائع فرمایا، اس کے بعد ایک سوال نامہ عربی میں خود مرتب فرمایا اور عرب ممالک کے اہل علم سے اس کی تصدیق چاہی۔ حرمین شریفین، شام اور مصر کے علماء نے بھی پرویز کے ملحد وزندیق ہونے کا فتویٰ دیا تو اسے "پرویز کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ مع اضافات جدیدہ" کے نام سے دوبارہ شائع فرمایا۔

یہ تھا حضرت بنوریؒ کا پرویزی فتنہ کے خلاف اہم ترین کارنامہ جس سے اس فتنہ کی کمر ٹوٹ گئی اور پرویز صاحب کے "خدا ورسول" اور "مرکز ملت" کو بھی پرویز صاحب کی قدر وقیمت معلوم ہوگئی۔ خسر الدنیا والاخرہ۔ ذالک هو الخسران المبین۔

اس فتنہ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے حضرت کو جو بے حد محنت کرنا پڑی، سفر کی جو صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، اور اس کے لئے جو اوقات عزیز صرف کرنا پڑے اس کا صحیح اندازہ آج نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا فتنہ: مسٹر پرویز کے خلاف حضرتؒ نے جو اقدام کیا اس کا پس منظر یہ تھا کہ صدر ایوب خان "فیلڈ مارشل" بن جانے کے بعد "مسند اجتہاد" پر بھی قابض ہوچکے تھے، اور وہ رفتہ رفتہ اسی راستے پر گامزن تھے جس پر مغل بادشاہ اکبر اعظم چل نکلا تھا۔ چونکہ پرویز نے انہیں "مرکز ملت" کی حیثیت سے نہ صرف دین میں تغیر وتبدل کے اختیارات سونپ دیئے تھے، بلکہ دور جدید کے "خدا ورسول" کا منصب بھی عطا کردیا تھا۔ اس لئے صدر ایوب خان ان دنوں ایک "سرکاری دارالافتاء" قائم کرنے کی فکر میں تھے جس کا "مفتی اعظم" مسٹر پرویز کو بنایا جانا تجویز ہوچکا تھا۔ مولانا شبیر علی تھانوی مرحوم نے حضرت بنوریؒ کے سامنے صورت حال کا یہ سارا نقشہ رکھا اور اس شر کے سدباب کے لئے کسی مؤثر اقدام کی اپیل کی، حضرتؒ نے "علماء کا متفقہ فتویٰ، پرویز کافر ہے" مرتب کرکے اس عظیم ترین سازش کو خاک میں ملادیا، عام پبلک پر مسٹر پرویز کی

حقیقت واضح ہوگئی۔ اور ارباب اقتدار اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئے۔ اب انہوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا' کراچی میں ایک "مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی" قائم کیا۔ اس میں اسلام پر "تحقیقات" کرنے کے لئے چن چن کر ایسے افراد بھرتی کئے گئے جن میں اکثریت کجرو اور کج ذہن ملاحدہ کی تھی اور پھر اس ادارہ کی سربراہی کے لئے میکگل یونیورسٹی کے ایک مستشرق کو امریکہ سے درآمد کیا گیا۔ یہ شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے ذریعہ کیا کام تفویض کیا گیا تھا؟ اس کو سمجھنے کے لئے میں جناب مولانا منظور نعمانی کے ایک مکتوب کا (جو انہوں نے ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۶۴ھ کو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمت میں ارسال کیا تھا) ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔ موصوف لکھتے ہیں:

> "کئی سال ہوئے ایک بہت بڑے مسلمان سرکاری عہدے دار نے (جو غالباً "سر" کا خطاب بھی رکھتے ہیں) مجھ سے دوران گفتگو میں کہا تھا کہ آپ لوگ اور آپ کے یہ مذہبی گھروندے (مدرسے اور خانقاہیں) صرف اس لئے ہندوستان (متحدہ ہندوستان) میں باقی ہیں کہ انگریزی حکومت کی پالیسی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے جس دن یہ پالیسی ہمارے ہاتھ میں آجائے گی ہم آپ لوگوں اور آپ کے ان اڈوں کو ختم کردیں گے اور "مداخلت فی الدین" کے نعروں سے آپ عوام میں جو ہیجان انگریز یا ہندو کے خلاف پیدا کردیتے ہیں ہمارے خلاف پیدا نہیں کر سکیں گے' ہم جو کچھ کریں گے مسلمان قوم کو ساتھ لے کر کریں گے' اور رائے عامہ کو اتنا زیادہ تیار کریں گے کہ وہ آپ لوگوں کو اپنے مفاد کا دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں گے' جیسا کہ ٹرکی میں ہو چکا ہے"۔
>
> (انوار عثمانی ص ۱۵۲)

یہ تھی دراصل "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے قیام اور ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کے پاکستان میں تشریف لانے کی اصل غرض وغایت۔۔ یعنی اسلام اور حاملان اسلام کے خلاف مسلمانوں کے ذہن تیار کرنا' عوام کی ذہنیت کو اس سطح پر لے آنا کہ وہ اسلام اور

نمائے اسلام کو اپنے مفاد کا دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں۔

ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے سب سے پہلے تو یہ کوشش کی علمائے کرام کو مطمئن کیا جائے کہ وہ جو کچھ کررہے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس میں کسی بدنیتی یا کجروی کا شائبہ نہیں ہے بلکہ وہ سرکاری وسائل سے اسلام کی خدمت کرنا اور اسلامی معاشرے کی جڑوں میں اسلام کو پیوست کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت بنوریؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور آپ سے تعاون کی درخواست کی۔ آپ نے اس کارخیر میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا' اور ایک بار "ادارہ تحقیقات اسلامی" میں ڈاکٹر صاحب کی درخواست پر تشریف لے گئے اور وہاں ان خطوط کی نشاندہی فرمائی جن پر اس ادارہ کو کام کرنا چاہئے (یہ تقریر ماہنامہ بینات میں چھپ گئی تھی) ادھر ڈاکٹر صاحب علماء کے اطمینان کی کوششیں فرمارہے تھے مگر دوسری جانب انہوں نے اور ان کے ادارہ کے دیگر اہل قلم نے اسلام کی تحریف کے طومار تیار کرنے شروع کردیے۔ مسلمانوں کے اسلام کے لئے "روایتی اسلام" "فرسودہ اسلام" "جامد اسلام" جیسی اصطلاحات استعمال کرنا شروع کردیں' ذخیرہ احادیث کو قرون وسطی کی پیداوار بتایا گیا۔ اسلامی شریعت کا ماخذ رومن قانون کو بتایا گیا۔ قرآن کریم کو پیغمبر کے اندرونی احساسات کی آواز ٹھہرایا گیا۔ سود اور شراب کی حلت کے فتوے صادر کئے گئے۔ وغیرذالک من الکفریات۔

خلاصہ یہ کہ "فیلڈ مارشل" صاحب جو کام مسٹر پرویز صاحب سے لینا چاہتے تھے اس کے لئے ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان کے "ادارہ تحقیقات اسلامی" کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نشۂ اقتدار کی بدمستی' سرکاری ذرائع کی فراوانی اور دین اور اہل دین سے عناد نے جب ڈاکٹر فضل الرحمان کے الحاد وکج روی سے عقد کیا تو دین اور اہل دین پر قیامت ٹوٹ گئی اور صاف نظر آنے لگا کہ یہاں بھی دین کا وہی حشر ہونے والا ہے جو مصطفیٰ کمال کے دور میں ترکی میں ہوچکا تھا۔ صورت حال اتنی بھیانک اور ایسی حوصلہ شکن تھی کہ مجھے خوب یاد ہے کہ نماز کے بعد اسلام کی زبوں حالی کو دیکھ کر ہم لوگ رو پڑتے تھے۔ وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ ظنونا میں قرآن کریم نے جس حالت کا نقشہ کھینچا ہے بلامبالغہ ٹھیک وہی کیفیت ہم پر طاری تھی۔

حق تعالیٰ حضرت بنوریؒ کی قبر پر رحمت کی بارشیں برسائے' انہوں نے بے خوف وخطر اس آتش نمرود میں کود جانے کا فیصلہ کرلیا اور اپنی ساری توانائیاں اس فتنہ کا سر کچلنے پر صرف کردیں۔ انہوں نے جس جذب و سرمستی' جس عزم و عزیمت اور جس دلیری وشجاعت کے ساتھ اس فتنہ کے خلاف آواز اٹھائی وہ "خاصان حق" ہی کا خاصہ ہے۔ انہوں نے اس شدت سے حق وصداقت کا صور پھونکا کہ اس کی آواز سے پورا ملک لرز اٹھا' ادھر "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے آرگن "فکر و نظر" میں الحاد وزندقہ کی نئی نئی صورتیں ڈھل کر سامنے آتیں۔ ادھر "بینات" میں ان پر "ضرب حیدری" لگائی جاتی۔

نوا را تلخ تری زن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تری خواں چوں محمل را گراں بینی

"فیلڈ مارشل" صاحب کے مطلق العنان اجتہاد اور ڈاکٹر فضل الرحمان کی ملحدانہ تحریفات کے خلاف حضرت بنوری قدس سرہ کی یہ جنگ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۸ء تک مسلسل چھ سال تک جاری رہی ہے' اس میں کیا کیا مسائل زیر بحث آئے اور حضرتؒ کے شعلہ فشاں قلم نے الحاد وزندقہ کے ایوانوں کو کس کس طرح خاکستر کیا؟ یہ ساری روئداد "بینات" کے فائلوں میں محفوظ ہے۔ اس کا صرف ایک نمونہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر فضل الرحمان کی ملحدانہ چیرہ دستیوں نے بڑھتے بڑھتے صحیفۂ مقدس اور وحی الٰہی پہ جو ہاتھ ڈالا تھا اور اپنے اساتذۂ مغرب کی تقلید میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قرآن کا کوئی خارجی وجود نہیں تھا' نہ کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا تھا۔ یہ سب نعوذ باللہ۔ افسانے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدان اور ضمیر سے جو آواز اٹھتی تھی وہی وحی تھی اور وہی قرآن کہلاتا تھا۔

حضرتؒ نے جب یہ تحریر پڑھی تو بے چین ہوگئے۔ رجب ۱۳۸۸ھ کے "بصائر و عبر" میں وحی الٰہی کی حقیقت پر قلم اٹھایا' اس کی تمہید یہ اٹھائی:

"انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں تمام اسلامی حقائق کو مسخ کیا جارہا ہے اور باطنیت والحاد کا جو

فتنہ ہزار برس پہلے ظہور پذیر ہوچکا تھا' آج تمام عالم اسلام میں پھیل گیا ہے... ملاحدہ نے آج میدان کو خالی دیکھ کر اور فضا کو سازگار سمجھ کر وہ شگوفے کھلانے شروع کردیئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ تحریف دین کا نام "تحقیق اسلام" ہے' الحاد فی الدین کا نام "اظہار حقیقت" ہے' حقائق دین کو اس طرح پامال ہوتا دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ کیا کیا جائے؟

"ازما است کہ برما است"

اسلام کی غربت وبے چارگی کا یہ دور انتہائی حسرت ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

اس تمہید کے بعد قرآن کریم کی آیات سے "وحی" کی تشریح فرماتے ہیں' وحی کے اوصاف و خصوصیات تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں:

"سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ سب کچھ ایمانی بصیرت اور ایمانی نور سے محرومی کا نتیجہ ہے' یا پھر ان حقائق الہیہ سے جہل عظیم کا ثمرہ ہے' خدارا انصاف کیجئے کہ تمام قرآن اور تمام وحی کو پیغمبر کا اخلاقی تجربہ اور توسیع ذات بتلایا جائے کیا یہ صریح گمراہی نہیں؟..... حقائق بین نگاہیں محسوس کرتی ہیں کہ (یہ لوگ) اللہ کے دین اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات کی جڑیں کاٹ رہے ہیں اور اپنے سلف مستشرقین کی دلی آرزوؤں کو پورا کرکے وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ان سے نہ ہوسکا"۔

یہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف حضرتؒ کا آخری اداریہ تھا۔ جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں۔ چھ سال تک مسلسل حضرتؒ اس فتنہ کے قلع قمع کے لئے سرگرم رہے' اور اس تندی' تلخی اور تیزی سے اس پر پے درپے ضربیں لگاتے رہے کہ پورے ملک میں اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور "فیلڈ مارشل" کا مطلق العنان اقتدار اور ڈاکٹر فضل الرحمان کا "جدت پسند اسلام" اس طوفان کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھانے لگا۔

بالاخر ڈاکٹر صاحب "اسلامی تحقیقات" کے منصب سے معزول ہو گئے' حضرت اسی آخری اداریے میں' جس کا اقتباس اوپر نقل کر چکا ہوں' لکھتے ہیں:

"یہ سطریں زیر قلم تھیں کہ معلوم ہوا "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے ڈائریکٹر جو ان لغویات کے علمبردار تھے' عوام کے احتجاج پر اپنے منصب سے برطرف کردیے گئے' لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس وقت تک ان کی رہنمائی میں ماہنامہ "فکر و نظر" اور "اسلام" وغیرہ کتابوں کے ذریعہ جو بیج ڈالا گیا ہے اس کا کیا کیا جائے گا؟

اب تک جتنا لٹریچر ظہور میں آچکا ہے وہ "غرق مے ناب اولیٰ" کا مصداق ہے جب تک اس کو دریا برد نہ کیا جائے اس وقت تک کیا اطمینان ہے کہ آئندہ پھر کچھ نہیں ہوگا۔ اور ان تحریفات والحاد پر اس وقت تک پاکستان کے خزانے کا جو لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا اس کا کیا تدارک کیا جائے گا؟ اور جو ہم خیال اسٹاف اپنے ارد گرد جمع کیا تھا اس کا کیا حشر ہوگا؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارہ "امین" ہاتھوں میں دیا جائے' اور ان کی علمی و دینی معاونت کے لئے علمائے امت میں سے معتمد ترین افراد کا انتخاب کیا جائے' جن کے علم و تقویٰ پر امت کو اعتماد ہے اور وہ شرعی مسائل معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ان تحقیقات کے لئے دائرہ عمل متعین کیا جائے اور دین کے مسلمات کو زیر بحث لانے کی اجازت نہ دی جائے۔ جب تک یہ روک تھام نہ ہوگی اس وقت تک قابل اطمینان صورت ملک میں پیدا نہ ہوگی"۔

لیکن افسوس ہے کہ اقتدار نے اس مخلصانہ نصیحت کو گوش ہوش سے سننا گوارہ نہ کیا' نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے مربی و محافظ "فیلڈ مارشل" کی بساط اقتدار بھی الٹ گئی۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

فتنۂ مودودیت: سب سے آخر میں جس فتنہ کے خلاف آپ نے علم جہاد بلند کیا وہ دور جدید کا "فتنۂ مودودیت" ہے جو کبھی "تجدید واحیائے دین" کے نام سے ابھرا' اور کبھی "اقامت دین" اور حکومت صالحہ کے نعرے سے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جن اکابر علماء ومشائخ اور ارباب قلوب کے زمانہ میں یہ فتنہ برپا ہوا وہ سب اس کے خلاف متفق' اس کے اثرات ونتائج سے بے چین اور اس کی اصلاح کی طرف متوجہ رہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے ابتداء ہی میں فرمادیا تھا کہ "میرا دل اس تحریک کو قبول نہیں کرتا"۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ اس فتنہ سے کس قدر بیزار تھے؟ وہ ان کے مکتوبات ورسائل سے واضح ہے۔ قطب العالم حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری' حضرت مولانا احمد علی لاہوری' امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر اکابر سب کے لئے یہ فتنہ ناقابل برداشت رہا۔ اور وہ مقدور بھر اس کی اصلاح کے لئے کوشاں رہے۔ بعض اکابر کو ابتداء میں اس تحریک سے کچھ حسن ظن تھا۔ لیکن بہت جلد ان پر اصل حقیقت منکشف ہوگئی چنانچہ حضرت سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی ابتداء میں اس تحریک کے خیر خواہ تھے' لیکن بہت جلد اس سے بیزار ہوگئے۔

حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ کو اس بارے میں خاصا نرم سمجھا جاتا تھا' لیکن جن لوگوں کو ان حضرات کے آخری دور کے مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ گواہی دیں گے کہ ان پر اس فتنہ کی حقیقت کس قدر عیاں ہوگئی تھی۔ حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے جب اپنا رسالہ "مقام صحابہ" تالیف فرمایا تو راقم الحروف نے انہیں مبارک باد پیش کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ مودودی صاحب کی آخری دور کی تصنیف "خلافت وملوکیت" ہے جس میں اکابر صحابہ اور خلفائے راشدین تک پر کیچڑ اچالی گئی ہے' اس کے برعکس آنجناب کو خدا تعالیٰ نے آخری عمر میں "مقام صحابہ" لکھنے اور صحابہ کی عظمت کا نقش اجاگر کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

الغرض ہمارے دور کے وہ تمام اکابر جن کے خلوص وتقویٰ' جن کی دیانت وامانت اور جن کی سلامتی علم وفہم کی قسم کھائی جاسکتی ہے اور جن کی مقبولیت عند اللہ ان کے اوراق زندگی سے عیاں اور ان کی پیشانی کے آثار وانوار سے واضح ہے' مودودی تحریک

کو ایک "عظیم فتنہ" قرار دینے پر ان سب کا اتفاق رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسوخ علم، حذاقت و تجربہ اور صفائے باطن کی بدولت ان اکابر کے لئے دینی حقائق گویا چشم دید مشاہدہ کی حیثیت اختیار کرجاتے ہیں اور پھر جب دنیا سے انقطاع کا زمانہ قریب آجاتا ہے تو ان پر انقطاع الی اللہ کی کیفیت غالب آجاتی ہے حب فی اللہ کے ساتھ ساتھ بغض فی اللہ ان کے رگ وپے میں سرایت کرجاتا ہے۔ ان پر انبیاء کرام کے مقام رفیع کا انکشاف ہوجاتا ہے اور یہ کہ وہاں تک انبیاء کرام کے سوا کسی فرد بشر کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ ہمارے دین کا مدار ہیں وہ امت کے معلم اول ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور امت کے درمیان وہی رابطہ اور واسطہ ہیں۔ ان ہی کی ذات پر دین کی نقل وروایت کی ساری عمارت کھڑی ہے، اور پھر ان کے بعد وہ تمام اکابر امت بھی ہمارے محسن ہیں جن کی راہنمائی کے طفیل ہمیں دین قیم کے چشمہ صافی تک رسائی نصیب ہوئی۔ - - یہ تمام حقائق ان حضرات کے سامنے بالکل کھل جاتے ہیں اس بناء پر انہیں انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ اور اسلاف امتؒ سے تعلق خاطر بڑھ جاتا ہے اور ان کی عظمت ومحبت کا نقش ان کے مقدس نفوس پر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

برعکس اس کے مودودی تحریک کی خاصیت یہ ہے کہ جو شخص اس سے جس قدر زیادہ وابستہ ہوگا اسی قدر اس کی لوح قلب پر صحابہ کرامؓ اور اسلاف امتؒ بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی کمزوریوں کا نقش ثبت ہوتا جائے گا۔ اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر جب آدمی "فنا فی المودودی" ہوجاتا ہے تو اسے صحابہ کرامؓ کا مقام جناب مودودی صاحب سے بلکہ خود اپنی ذات سے بھی فروتر نظر آنے لگتا ہے، وہ خود تو اس چودھویں صدی میں "اقامت دین" کے داعی اور علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ "ٹھیٹھ اسلامی نظام" کو برپا نہیں کرسکے۔ وہ "ٹھیک منہاج نبوت" پر قائم نہیں رہ سکے۔ ان کے دور میں جاہلیت کے فلاں فلاں جراثیم در آئے تھے۔ حضرت عثمانؓ سے فلاں فلاں غلطیاں ہوئی تھیں۔ حضرت معاویہؓ کی سیرت وکردار پر جاہلیت کے فلاں فلاں داغ دھبے تھے۔ ابو موسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن عاصؓ نے اقامت دین کے بجائے ڈپلومیسی (سیاسی چالوں) سے کام لیا۔ وغیر ذالک من الخرافات۔ اعاذنا اللہ منہا۔

گویا یہ دو الگ الگ راستے ہیں' ایک طرف اکابر اولیاء اللہ کا راستہ۔ اور دوسری طرف مودودی تحریک کا راستہ۔ یہ دونوں نہ صرف مختلف ہیں بلکہ بالکل متضاد سمتوں کو نکلتے ہیں۔ ایک کا رخ کعبہ کی طرف ہے تو دوسرے کا ترکستان کی طرف۔ ایک انبیاء کرام کی عصمت' صحابہ کی عظمت اور اسلاف امت کی محبت پر ختم ہوتا ہے تو دوسرا ان کی حقارت و نفرت پر۔ ایک صحابہ کرامؓ کے ذریعہ امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت وشفاعت سے وابستہ کرتا ہے اور دوسرا صحابہ کرام سے متنفر کرکے "رسول خدا کے سوا کسی کو معیار حق نہ سمجھنے" کی وادیوں میں بھٹکا دیتا ہے۔

اکابر اہل اللہ پر جو مودودیت سے نفرت وبیزاری کا ایک خاص حال طاری ہوتا ہے اور وہ کبھی کبھی ایک طوفان کی شکل میں بہ پڑتا ہے اس کی توجیہ میرے ناقص خیال میں یہی ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کو "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کا تاج کرامت پہنے ہوئے صدر نشین مقام قرب ورضا دیکھتے ہیں اور یہ حقیقت ان پر کھل جاتی ہے کہ امت اسی وقت امت ہے جب کہ وہ صحابہ کرامؓ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رسالت سے وابستہ ہو۔ جن لوگوں کو وہ دیکھتے ہیں کہ وہ صحابہ کرامؓ کے احسان نافراموش ہیں وہ ان حضرات کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کٹے ہوئے ہیں۔ انہیں ان کے سلب ایمان کا خطرہ بے چین کردیتا ہے۔۔۔ یہ راز ہے ان کی مودودیت سے نفرت وبیزاری کا۔۔۔ عام سطح کا آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ یہ بزرگ خوامخواہ ایک "داعی حق" اور "مفکر اسلام" کے پیچھے پڑ گئے ہیں' مگر انہیں کون بتائے کہ یہ حضرات لوگوں کو "داعی حق" سے نہیں ہٹاتے بلکہ "داعی برحق" صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں اور جس سراب میں یہ لوگ بھٹک رہے ہیں اس سے انہیں نکالنا چاہتے ہیں۔

حضرت بنوری قدس سرہ ہمیشہ مودودی تحریک کے مخالف رہے اور وہ ایک عرصہ سے اس پر فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے مودودی لٹریچر اور ضروری مواد بھی فراہم کرلیا تھا' مگر اس خیال سے رک رک جاتے تھے کہ کہیں موجودہ احوال وظروف میں یہ خلاف مصلحت نہ ہو۔ تاآنکہ وہ وقت آپہنچا کہ انہیں اپنا پیمانہ عمر لبریز ہوتا نظر آیا' اور انہوں نے آخری وقت میں اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کرہی لیا۔ خود حضرتؒ فرماتے ہیں:

وكنت برهة من الدهر تعوقني طبيعتي عن الكتابة في الموضوع ....
حتى قرب الرحيل الى ديار الاخرة وكان الامر كما قيل:

قرب الرحيل الى ديار الاخره
فاجعل الهي خير عمري اخره

....بقمت بعد الاستخارات وتفكير طويل الى الانتقاد' ذبا عن حريم الدين ابتغاء لوجه الله الكريم۔ دون اى جنوح الى مطامح الدنيا ومطامعها' وكفى بالمرء شقاوة جاوز سنه سبعين عاما ولايزعه وازع عن سخط الله۔ (الاستاذ المودودی ص۲' ج۲)

"ایک زمانے سے میری طبیعت مجھے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے روکتی رہی.... تا آنکہ دیار آخرت کی طرف کوچ کا وقت قریب آپہنچا' اور وہی حالت ہوگئی جو ایک شعر میں ذکر کی گئی ہے کہ:
"آخرت کی طرف کوچ کا وقت قریب آلگا ہے الٰہی میری عمر کا بہتر حصہ آخری حصہ کو بنا"..... پس میں بہت سے استخاروں اور طویل غور و فکر کے بعد مودودی افکار پر تنقید کے لئے کھڑا ہوا۔ مقصود محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے حریم دین کی پاسبانی ہے۔ کوئی دنیوی مفاد قطعاً پیش نظر نہیں۔ آدمی کی شقاوت قلبی کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کی عمر ستر سے اوپر ہوجائے لیکن اس کے باوجود اسے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے نہ روک سکے۔"

اور اس کی ظاہری تقریب یہ ہوئی کہ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مدظلہ العالی کا رسالہ "فتنہ مودودیت" چھپ کر آیا تو حضرت بنوریؒ سے فرمائش ہوئی کہ اس کا عربی ترجمہ کرادیا جائے اور اس پر ایک مقدمہ تحریر فرمادیا جائے۔ حضرتؒ نے ترجمہ کا کام جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کے سپرد فرمایا' اور خود اس پر مقدمہ لکھنے بیٹھے تو وہ مستقل رسالہ بن گیا۔ "افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شد"۔ یہ رسالہ "الاستاذ المودودی و شئی من حیاتہ وافکارہ" کے نام سے شائع ہوا۔ حضرت کا ارادہ تھا کہ

اس سلسلہ کے دس حصے رقم فرمائیں گے' دو شائع ہو چکے تھے اور تیسرا زیر قلم تھا کہ خاتمہ بالخیر کا پیغام آپہنچا اور حصہ دوم کا یہ شعر الہامی ثابت ہوا:

قرب	الرحیل	الیٰ	دیار	الآخرہ
فاجعل	الٰہی	خیر	عمری	آخرہ

اگر حق تعالیٰ نے کسی کو نور ایمان اور چشم بصیرت عطا کی ہو تو ان دو حصوں میں حضرت نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ موعظت و عبرت کے لئے کافی ہے۔ حصہ اول میں سب سے پہلے مودودی صاحب کا مرقع زندگی پیش کرتے ہوئے ان کے زیغ و ضلال کے منبع کی نشاندہی فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ موصوف کو کسی باخدا عالم محقق کے جوتے سیدھے کرنے کی سعادت میسر نہیں آئی' ان کی ذہنی و قلبی تربیت کسی استاذ کے یہاں نہیں ہوئی' بلکہ دیگر کجرووں کی طرح ان کی معلومات کا سارا سرمایہ خود ان کے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے' ان کے ذہن میں اسلام کا جو خاکہ ہے وہ بھی ان کا خود اپنا مرتب کردہ ہے اور ان کے نزدیک حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار بھی خود ان کی اپنی پسند و ناپسند ہے۔ ان کا علم قلب کا نہیں بلکہ قلم کا ہے۔ اس لئے ان کا طرز فکر علماء راسخین کا نہیں بلکہ زائغین کا ہے۔

بدقسمتی سے مودودی صاحب کو ناپختہ عمری میں نیاز فتح پوری جیسے ملحد کی دوستانہ صحبت میسر آئی جس نے غیر شعوری طور پر ان کی قلمی صلاحیت کو بھی زیغ آلود کردیا' اور ذاتی مطالعہ میں جو سلامتی فکر کی توقع کی جاسکتی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اسی حالت میں مودودی صاحب نے "قلم کو ذریعہ معاش" بنانے کی ٹھان لی' اور اس دن سے آج تک وہ یہی شغل فرما رہے ہیں۔ مودودی صاحب کا یہ اقتباس ان کی شخصیت کا شفاف آئینہ ہے۔

> "چھ سال کے تجربات نے یہ سبق دیا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور معاشی استقلال کے لئے جدوجہد کے بغیر چارہ کار نہیں۔ فطرت نے تحریر و انشاء کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا' عام مطالعہ سے اس کو اور تحریک ہوئی۔ اسی زمانے میں جناب نیاز فتح پوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے' اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی' غرض ان تمام وجوہ سے یہ فیصلہ کیا

کہ قلم ہی کو وسیلہ معاش قرار دینا چاہئے"۔

(الاستاذ المودودی حصہ اول ص ۷۔ بحوالہ مولانا مودودی: اسعد گیلانی ص ۷۲)

الغرض ان کی ذہنی ساخت میں بنیادی طور پر دو نقص تھے۔ ایک صحیح تربیت کا فقدان' دوسرے ناپختگی کے عالم میں ایک ملحد کی صحبت ورفاقت' ان دو باتوں کے ساتھ جب قلم کی سلاست ہم آہنگ ہوئی تو نتیجہ "انا ولاغیری" کی شکل میں نکلا۔ چنانچہ یہی شخص جو عنفوان شباب سے دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے مضطرب اور "معاشی استقلال کی جدوجہد" کے لئے فکر مند تھا اور جس نے نیاز فتح پوری سے دوستانہ تعلقات استوار کئے اور اس کی صحبت کیمیاء اثر سے متاثر ہوکر قلم کو وسیلہ معاش" بنانے کا فیصلہ کیا اس نے جب بدقسمتی سے اسلامی موضوعات پر "مشق ناز" شروع کی تو اپنے تئیں مجتہد سمجھ لیا' صحابہ کرامؓ سے لے کر مجدد الف ثانیؒ' شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور سید احمد شہید بریلوی ایسے اکابر اسے گرد راہ نظر آنے لگے اور اس کا "وسیلہ معاش" قلم نہ صرف ایک ایک کے نقائص اگلنے لگا بلکہ یہاں تک ارشاد ہوا کہ دین اسلام کے چار میں سے تین حصے زمانہ رسالت کے بعد لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آئے' گویا تین چوتھائی دین کا انکشاف پہلی مرتبہ نیاز فتح پوری کے رفیق وہم نشین پر ہوا۔ اس پر حضرت بنوریؒ کی حمیت دینی جوش میں آتی ہے' فرماتے ہیں:

هل يكون جهل فاضح من هذا؟ لم يعرفه احد من العرب ولا من العجم من اللغويين والمفسرين والمحدثين وارباب البلاغة وائمة العربية من اقدم العصور الى اليوم' وانما فهمها رجل عجمي لايجيد اللغة العربية لانطقا ولا كتابة' ولا يكاد يفهمها الا بشق النفس بمعونة التراجم الاردوية .... فهل رايت يا سبحان الله! كلاما ابعد عن العقول من هذه الدعوى۔ (ج ۱' ص ۱۹)

اس سے بڑھ کر بھی کوئی رسوا کن جہل ہوگا؟ قرن اول سے لے کر آج

تک تو ان اُمور کو کسی نے نہ جانا' نہ کسی عربی نے نہ عجمی نے' نہ اہل لغت نے' نہ مفسرین ومحدثین نے' نہ ارباب بلاغت اور ائمہ عربیت نے۔ ان کو سمجھا تو ایک ایسا عجمی سمجھا جو لغت عربی سے واقف نہیں' نہ عربی بول سکتا ہے نہ لکھ سکتا' بصد مشکل عربی سمجھ سکتا ہے اور وہ بھی اردو ترجموں کی مدد سے.....

انصاف کیجئے کہ اس دعویٰ سے بڑھ کر بھی آپ نے کوئی غیر معقول بات کبھی دیکھی سنی؟"

مودودی صاحب کی شخصیت کا جائزہ اور اس کی ذہنی وفکری سطح کا جو حدود اربعہ حضرتؒ نے پیش کیا ہے وہ مودودی تحریک کی حقیقت وماہیت کو سمجھنے کے لئے کافی وشافی ہے۔ اس کے بعد حضرتؒ نے رسالہ کے دونوں حصوں میں مودودی افکار کا جائزہ لیا ہے اور ان پر عالمانہ انداز میں بحث کی ہے۔ یہاں اگر ان مباحث کا خلاصہ پیش کیا جائے تو غیر ضروری تطویل کا موجب ہوگا۔ اس لئے قارئین کو اصل رسالہ کی طرف مراجعت کا مشورہ دیتے ہوئے یہاں چند اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔

مودودی صاحب کی شخصیت وافکار کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد حضرتؒ اپنی رائے ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں:

وقد دعت الحال الی ان انادی علی رُؤس الاشہاد ان الرجل زائغ' ضال مضل۔ فی کتبہ ورسائلہ طامات' منہا ما یوجب الفسق' ومنہا ما یوجب الابتداع فی الدین' ومنہا ما یوجب الالحاد' ومنہا یوجب ما اسکت عنہ' وفی بعضہا دلالۃ علی جہلہ بالدین' وغباوتہ علی الیقین' وتضارب وتہافت فی بیاناتہ وکتاباتہ وتجہیل للسلف الصالحین من القدم العصور الی یومنا ھذا۔ فہذا الحط عن جہود السلف الصالحین والمؤاخذۃ علیہم یدل علی اعجاب رأیہ مالایتحمل' وکبرلہ فی سجیتہ مالایتساع۔

"حالات کا تقاضا ہے کہ میں علی رؤس الاشہاد اعلان کردوں کہ یہ شخص کجرو' گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے اس کی کتب ورسائل میں طامات ہیں۔

ان میں سے بعض فسق کی موجب ہیں' بعض ابتداع فی الدین کی موجب ہیں' بعض الحاد کی موجب ہیں۔ اور بعض ایسی چیز کی موجب ہیں جس سے میں سکوت اختیار کرتا ہوں' اس کی بعض تحریریں اس کے جہل بالدین اور غباوت علی الیقین پر دلالت کرتی ہیں' اس کے بیانات اور تحریروں میں تضارب اور تہافت اور قدیم تر زمانہ سے لے کر آج تک کے تمام سلف صالحین کی تحمیق و تجہیل پائی جاتی ہے۔ پس سلف صالحین کی کوششوں کو گرانا اور ان اکابر پر مؤاخذہ کرنا دلالت کرتا ہے کہ اس کی رائے میں ناقابل برداشت خود پسندی ہے اور اس کی فطرت میں ایسا کبر ہے جو گوارا نہیں کیا جاسکتا۔" (حصہ اول ص۱۶)

ایک جگہ مودودی صاحب کی کجروی پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و کلامہ ھذا یدل علی انہ رجل مالہ صلہ بالاسلام او ھو حدیث عھد بالاسلام' لایعرف النبوۃ ولا النبی ولا الرسول ولا حقائق التعبیرات القرانیہ۔ (حصہ دوم ص۳۳)

"اور اس کا یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں' یا وہ نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہے' جو نہ نبوت کو جانتا ہے' نہ نبی کو' نہ رسول کو اور نہ قرآنی تعبیرات کے حقائق کو۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

وقلم فی ھذا المقام مقام رجل لیس فی قلبہ ایمان۔ ینتقم من الاسلام والمسلمین۔ (حصہ دوم ص۳۶)

"اس مقام میں مودودی ایک ایسے شخص کا کردار ادا کر رہا ہے جس کے دل میں ایمان نہ ہو اور جو اسلام اور مسلمانوں سے انتقام لے رہا ہو۔"

ایک اور جگہ حدیث نبوی کے مقابلہ میں مودودی کی گستاخی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثم هو يكذب الحديث الصحيح الصريح فی اصح الكتب بعد كتاب الله لاجل عدم قبول عقله اياه' فيلعب بعقله وجهله بامثال هذه الاحاديث الصحيحة الصريحة۔ فاف لمثل هذا العقل السخيف الذی يتعقب حديث رسول الله صلی الله عليه وسلم الصحيح۔

(ص ۴۲ حصہ دوم)

"پھر ان تمام بے ہودگیوں کے بعد وہ ایسی حدیث صحیح' صریح کی تکذیب کرتا ہے جو اصح الکتب میں موجود ہے۔ محض اس لئے کہ اس کی عقل اس حدیث کو قبول نہیں کرتی۔ پس وہ اس قسم کی احادیث صحیحہ' صریحہ کو اپنی عقل و جہل کا کھلونا بناتا ہے۔ تف ہے ایسی عقل سخیف پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث صحیح کی تردید کرے"

مودودی صاحب کے زہرافشاں قلم سے انبیاء کرام اور صحابہ عظام کے اخلاق اور سیرت و کردار پر جو چھینٹے پڑے ہیں۔ ان کی مثالیں ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ انبیاء و رسل کے حق میں اس کا کلام اس قدر گھناؤنا ہے کہ اسے گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حق میں بھی۔ یہ اس کی "تفہیم القرآن" سامنے موجود ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا اور نہ میرا خیال ہے کہ یہ معمہ میری سمجھ میں آسکے کہ مودودی کے معتقدین کی نظر سے یہ چیزیں کیوں مخفی ہیں"۔(ص ۴۳ حصہ دوم)

اور ان تمام مباحث کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"بہرحال یہ بات سپیدہ صبح کی مانند روشن ہو چکی ہے کہ مودودیؒ نے ۔۔۔ اللہ تعالیٰ اسے حق کی ہدایت دے ۔۔۔۔ بڑے بڑے انبیاء کرام کی توہین کی ہے۔ چنانچہ حضرت آدم' حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت یوسف' حضرت داؤد' حضرت یونس' حتی کہ خاتم النبیین حبیب رب العالمین سید ولد ادم' علیہ وعلیہم صلوات اللہ وسلامہ

وتحیاتہ الی یوم الدین کے حق میں ایسے قبیح الفاظ استعمال کئے ہیں جو نہایت خطرناک ہیں اور فقہائے امت اعیان اسلام اور بحور علم نے اس قسم کے لوگوں کے بارے میں جو حکم دیا ہے وہ سب کے سامنے ہے، چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں، قاضی عیاض نے "الشفاء" میں، حافظ ابن تیمیہؒ نے "الصارم المسلول" میں، تقی الدین سبکیؒ نے "السیف المسلول" میں، فقیہ شام ابن عابدینؒ نے "تنبیہ الولاۃ والحکام" میں اور امام العصر حضرت مولانا انور شاہ محدث کشمیریؒ نے "اکفار الملحدین" میں اس مسلمان کے بارے میں صاف لکھا ہے کہ جو رسول امت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بدگوئی کرے، یا آپؐ کی تکذیب کرے یا کوئی عیب لگائے یا تنقیص کرے، یا کسی نبی اور ولی کے حق میں بدگوئی یا عیب جوئی کرے

اور یہ حکم شرعی ایسا ہے کہ جس پر سب کا اتفاق واجماع ہے جو چاہے ان کتابوں میں دیکھ لے۔ کیونکہ سبکی کی کتاب کے علاوہ یہ سب مطبوعہ موجود ہیں"۔ (ص ۴۳ حصہ دوم ملخصا)

اور حضرتؒ نے مودودی صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا، وہ تو ان کے رسالہ "الاستاذ المودودی" میں محفوظ ہے مگر یہ بات شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی کہ جن دنوں حضرتؒ یہ رسالہ تصنیف فرمارہے تھے باقاعدگی سے مودودی صاحب کے حق میں طول حیات اور رجوع الی الحق کی دعائیں بھی فرماتے رہے، حضرتؒ نے اپنے رسالہ میں بھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

وکذالک صاحبنا لو سبقنا الی رحیل الاخرۃ ثم نقوم بالنقد علیہ بعد ان قضی نحبہ للنیل سکتوا فی حیاتہ عجزا او جھلا، ونطقوا بعد رحیلہ فقاموا نبشون علیہ جدثہ وعسی ان یکون النقد والمواخذۃ فی اخر حیاتہ انفع للتروی وکبح الشکیمۃ وربما یوفق الی الانابۃ الرجوع، حیث ان ادبار الدنیا واقبال الاخرۃ خیر وازع واحسن رادع وقرب الاجل حافز الی التوبۃ والانابۃ۔

"اور اسی طرح یہ خیال بھی تھا کہ اگر ان صاحب نے ہم سے پہلے آخرت کی طرف رخت سفر باندھ لیا اس کے بعد ہم نے تنقید کی تو کہا جائے گا کہ اس کی زندگی میں تو عجز یا جہل کی وجہ سے خاموش رہے اور اس کے جانے کے بعد زبانیں کھل گئیں، اور گڑے مردے اکھاڑنے لگے۔ نیز یہ توقع بھی تھی کہ ان صاحب کی آخری زندگی میں ان پر تنقید و مواخذہ ان کے غور و فکر اور رہوار قلم کی لگام کھینچنے میں زیادہ نافع ہے۔ بسا ممکن ہے کہ اس کو انابت اور رجوع کی توفیق ہوجائے۔ کیونکہ دنیا کا پشت پھیرنا اور آخرت کا سامنے آنا بہترین روکنے والی چیز ہے۔ اور قرب اجل توبہ وانابت پر آمادہ کرنے والی ہے۔" (ج ۲، ص ۲)

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ کی جلالت قدر اور علو مرتبت سے کون ناواقف ہے؟ علامہ اقبال کے الفاظ میں "علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد" جس کے سامنے بڑے بڑے جبال علم مورناتواں نظر آتے تھے۔ ان کی بے نفسی وتواضع، خلوص و للہیت اور محاسبہ آخرت کی فکر دیکھئے کہ وہ آخری عمر میں حضرت بنوریؒ سے فرماتے تھے:

"مجھ سے ابتدائی دور میں بعض قلمی لغزشیں ہوئی ہیں ان میں سے کچھ چیزوں پر تو مجھے تنبہ ہوا اور میں نے ان کی اصلاح کرلی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ (حضرت بنوریؒ) جیسے حضرات میری کتابیں غور سے پڑھیں اور ان میں کوئی لغزش نظر آئے تو مجھے متنبہ فرمائیں تاکہ میں ان سے رجوع کرلوں"۔

حضرت سید صاحب کا یہ ارشاد راقم الحروف نے حضرت بنوریؒ سے سنا تھا۔ حضرت بنوریؒ چاہتے تھے کہ جناب مودودی صاحب بھی مسلک اہل حق کے مطابق اپنی لغزشوں سے رجوع کرلیں اور ان کی تحریروں سے نوخیز طبقہ میں جو نظریاتی کجی پیدا ہوگئی ہے اس کی اصلاح ہوجائے۔

دنیا میں شاید سب سے آسان کام دوسروں کی غلطی نکالنا اور سب سے مشکل کام اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ہے، خصوصاً مودودی صاحب شہرت کی جس منزل میں ہیں اس میں ان کے لئے یہ کام اور بھی مشکل ہے، تاہم اگر وہ اپنی غلطیوں سے رجوع کرلیں تو

اس میں ان کی خفت نہیں بلکہ ان کے وقار میں اضافہ ہی ہوگا۔ اگر تفصیلاً نہیں تو کم از کم اجمالاً ہی اعلان کردیں کہ میری تحریروں اور کتابوں میں سلف صالحین اور مسلک اہل حق کے خلاف جو بات بھی ہو میں اس سے رجوع اور ایسے تمام امور سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ بہرحال جناب مودودی صاحب یا ان کی جماعت کے احباب حضرت بنوریؒ کے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں، مگر حضرتؒ نے جو کچھ لکھا پوری بصیرت، شرح صدر اور خلوص سے لکھا ہے، امت کی اور سب سے بڑھ کر خود مودودی صاحب کی خیرخواہی کے جذبے سے لکھا ہے۔ وہ بار بار درد اور سوز سے فرمایا کرتے تھے کہ صحابہ کرامؓ پر مودودی صاحب کے قلم نے جو چھینٹے اڑائے ہیں اگر موصوف نے ان سے رجوع نہ کیا تو مجھے اس کے حق میں سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے.....

"ایں ہماں دیداست کہ در آخر تجرید خوردی"

عباسی فتنہ: مودودی تحریک جسے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے "خارجیت جدیدہ" سے تعبیر کیا تھا (الاستاذ المودودی ص۹، حصہ اول) اس کے رد عمل میں ایک اور فتنہ اٹھا جسے "ناصبیت جدیدہ" کا عنوان دیا جانا مناسب ہے۔ یہ محمود احمد عباسی کی تحریک تھی۔ موصوف نے ان تمام خرافات کا جو مودودی صاحب کے قلم سے حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے حق میں سرزد ہوئی تھیں حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ اور دیگر اہل بیت کرام سے انتقام لینا چاہا۔ اس تحریک کے سارے لٹریچر میں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کو گرادیا جائے اور یزید کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پست ثابت کیا جائے۔

حضرتؒ کے لئے جس طرح مودودی فتنہ ناقابل برداشت تھا اسی طرح یہ عباسی فتنہ بھی ناقابل مسامحت تھا۔ چنانچہ ایک زمانہ میں ماہنامہ "بینات" کے صفحات اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے وقف رہے ہیں۔ یہاں ان تمام تفصیلات کو قلم انداز کرتے ہوئے صرف حضرتؒ کی ایک تحریر پر اکتفا کرتا ہوں، کسی شخص نے ایک ایسے شخص کے بارے میں جو محمود احمد عباسی کی کتاب کی تائید کرتا ہے حضرت سے دریافت کیا کہ کیا اس کی اقتداء میں نماز جائز ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں حضرتؒ نے تحریر فرمایا:

"علمائے حق کا اتفاقی فیصلہ ہے کہ محمود عباسی کی کتاب اہل حق کے مسلک کے مخالف ہے اور مولف شعوری یا غیر شعوری طور پر شدید اور خطرناک غلطیوں میں مبتلا ہے اس لئے اس کتاب کی تائید کرنے کا درجہ بھی یہی رہے گا' البتہ اگر جہالت سے تائید کرتا ہے تو اس کا جرم نسبتا ہلکا ہوگا اور اگر دانستہ زیغ کی وجہ سے تائید کرتا ہے تو یہ شخص ایک خطرناک گناہ میں مبتلا ہے' اور فاسق ہے' فاسق کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم یہ ہے کہ مکروہ تحریمی ہے اگر چہ فرض ادا ہوجائے گا۔ اس کا بھی حکم وہی ہے جو اہل ہویٰ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ واللہ اعلم"۔

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۲۷ محرم الحرام ۱۳۸۱ھ

(اشاعت خاص بینات محرم الحرام ۱۳۹۸ھ مطابق جنوری ۱۹۷۸ء)

تحریک ختم نبوت کے قافلہ سالار

متحدہ ہندوستان میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ اور "مجلس احرار اسلام" کے سرفروشوں نے اپنی شعلہ بار خطابت کے ذریعے انگریز کی ساختہ پرداختہ "قادیانی نبوت" کے خرمن امن کو پھونک ڈالا تھا' تا آنکہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار رخت سفر باندھ کر رخصت ہوا۔ برصغیر کی تقسیم ہوئی اور پاکستان منصۂ وجود پر جلوہ گر ہوا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں قادیانی نبوت کا منبع خشک ہو کر رہ گیا' اور قادیان کی منحوس بستی نہ صرف خود دارا لکفر ہندوستان کے حصہ میں آئی بلکہ اپنے ساتھ مشرقی پنجاب کے مسلم اکثریت کے صوبے کو بھی لے ڈوبی۔

مرزا محمود قادیانی اپنے "مکۃ المسیح" "ارض حرم" اور "مسجد اقصیٰ" سے برقعہ پہن کر فرار ہوا اور سیدھا لاہور آکر دم لیا۔ پاکستان میں دجل و تلبیس کا نیا دارالکفر "ربوہ" کے نام سے آباد کیا۔ قبر فروشی کی آبائی اسکیم کے لئے "بہشتی مقبرہ" کا یہاں ڈھونگ رچایا' اور قادیانی خلافت کے شاہوار کی ترکتازیاں دکھانے اور پورے ملک کو مرتد بنانے کے اعلان کرنے لگا۔

قادیانیوں کو غلط فہمی تھی کہ چونکہ پاکستان کے ارباب اقتدار پر ان کا تسلط ہے' فوج میں ان کا گہرا اثر و رسوخ ہے' ملک کے کلیدی مناصب پر ان کا قبضہ ہے' پاکستان کا وزیر خارجہ ظفراللہ خان قادیانی ہے' اس لئے پاکستان میں مرزا غلام احمد کی جھوٹی نبوت کا جعلی سکہ رائج کرنے میں انہیں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ان کی امید افزائی کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ "احرار اسلام" کا قافلہ تقسیم ملک کی بدولت لٹ چکا تھا۔ ان کے پاس تنظیم اور تنظیمی وسائل کا فقدان تھا' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "احرار اسلام" ناخدایان پاکستان کے دربار میں معتوب تھے۔ قادیانیوں کو یہ غرہ تھا کہ اب حریم نبوت کی پاسبانی اور قادیان کی جعلی قبائے نبوت کے بخیے ادھیڑنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوگی' جو

شخص بھی اس کی جرأت کرے گا اسے "شرپسند" اور "باغی" کہہ کر آسانی سے تختہ دار پر لٹکوا دیا جائے گا، یا کم از کم پس دیوار زنداں بھجوادیا جائے گا، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ حفاظت دین اور "تحفظ ختم نبوت" کا کام انسان نہیں کرتے خدا خود کرتا، اور جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے ارادے کو نہ حکومتیں روک سکتی ہیں نہ کوئی بڑی سے بڑی طاقت بدل سکتی ہے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ قادیانیوں کے عزائم سے بے خبر نہیں تھے مگر حالات کا تیز و تند دھارا ان کے خلاف بہ رہا تھا تاہم وہ شدید ترین ناموافق حالات میں بھی قادیانیت سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکے تھے گویا:ے

موج خوں سر سے ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

چنانچہ جدید حالات میں قادیانیت کے خلاف کام کرنے کے لئے امیر شریعتؒ نے ملکی سیاسیات سے دست کش ہونے کا اعلان کیا اور آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے ملتان کی ایک چھوٹی سی مسجد "مسجد سراجاں" میں ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ (مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۵۴ء) کو اپنے مخلص رفقاء کی مجلس مشاورت طلب فرمائی جس میں حضرت امیر شریعتؒ کے علاوہ مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھریؒ، خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا محمد شریف بہاول پوریؒ، مولانا شیخ احمدؒ (بورے والا) مولانا محمد عبداللہ رائے پوریؒ، مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ، مولانا تاج محمود لائل پوری (فیصل آبادی) مولانا محمد شریف جالندھریؒ، مولانا عبدالرحیم اشعرؒ، مولانا غلام محمد بہاول پوری وغیرہ شریک ہوئے۔ غور و فکر کے بعد "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے نام سے ایک غیر سیاسی تبلیغی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ تھا مجلس ختم نبوت کی تاسیس کا مختصر سا تعارف اور پس منظر۔

حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو اس قافلہ کا پہلا امیر و قائد منتخب کیا گیا۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو حضرت امیر شریعتؒ کا وصال ہوا اور جماعت کو طفولیت کے عالم میں یتیم کر گئے۔

شاہ جی کے بعد حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ المتوفی ۹ر شعبان ۱۳۸۶ھ بمطابق ۲۳ نومبر (۱۹۶۶) امیر دوم، حضرت مولانا محمد علی جالندھری (المتوفی ۲۴ر صفر ۱۳۹۱ھ

مطابق ۲۱ اپریل ۱۹۷۱) امیر سوم اور مناظر اسلام مولانا لال حسین اختر (المتوفی ۱۱ جولائی ۱۹۷۳ء) امیر چہارم منتخب ہوئے۔ مولانا لال حسین اختر کے بعد فاتح قادیان حضرت مولانا محمد حیات مدظلہ العالی کو نئے انتخاب تک مسند امارت عارضی طور پر تفویض ہوئی' خیال تھا کہ آئندہ جماعت کی زمام قیادت مستقل طور پر انہیں کے سپرد کردی جائے۔ مگر اپنے ضعف وعوارض کی بناء پر انہوں نے اس گراں باری سے معذرت کا اظہار فرمادیا اور جماعت خلا میں گھومنے لگی۔ یہ ایک ایسا بحران تھا کہ جس سے اس عظیم الشان پیش قدمی کے رک جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا لیکن حق تعالیٰ شانہ' کا وعدۂ حفاظت دین یکایک ایک لطیفۂ غیبی کی شکل میں رونما ہوا' اور وہ اس منصب عالی کے لئے اسلاف کے علوم وروایات کی حامل ایک ایسی ہستی کو کھینچ لایا جو اس منصب کی پوری طرح اہل تھی' جس سے ملت اسلامیہ کا سربلند ہوا۔ جس کے ذریعہ قدرت نے ختم نبوت کی پاسبانی کا وہ کام لیا جو اس دور کی تاریخ کا جلی عنوان بن گیا' اور وہ تھے شیخ الاسلام حضرت العلامہ مولانا السید محمد یوسف البنوری الحسینی نور اللہ مرقدہٗ۔

۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق ۹ اپریل ۱۹۷۴ء کو یہ عبقری شخصیت "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی مسند امارت پر رونق افروز ہوئی۔

کسی جماعت کی صدارت قبول کرنا حضرت کے مزاج ومشاغل کے قطعاً منافی تھا لیکن مخلصین کے اصرار پر آپ کو یہ منصب قبول کرنا پڑا' یہ تو ظاہری سبب تھا لیکن اس کے باطنی اسباب ودواعی متعدد تھے جن میں سے تین اسباب اہمیت رکھتے ہیں۔

اول: حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اپنے دور میں رد قادیانیت کے امام تھے۔ انہوں نے ہی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو "امیر شریعت" مقرر کرکے ایک جماعت کو مستقل اسی مہم پر لگادیا تھا۔ اور علمائے امت سے ان سے تعاون کرنے کی بیعت لی تھی۔ ادھر حضرت بنوری اپنے شیخ کے علوم وانفاس کے وارث تھے۔ تحفظ ختم نبوت اور رد قادیانیت ان کے شیخ انور کی وراثت وامانت تھی' ظاہر ہے کہ اس کا اہل علوم انوری کے وارث اور ان کے روحانی جانشین سے بہتر کون ہو سکتا تھا' اس لئے جب ایک فعال جماعت کی قیادت ان کے سپرد ہوئی تو آپ نے اسے عطیہ خداوندی سمجھ کر قبول کرلیا۔

دوم: حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے انجمن حمایت اسلام کے جس اجلاس میں

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت مقرر کر کے خود ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور دیگر علماء سے بھی بیعت کرائی اس میں حضرت سید بنوری بھی شریک تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے شیخ انور اور ان کے امیر شریعتؒ کی جماعت بے کسی و بے بسی کے جنگل میں بھٹک رہی ہے اور اس بے سہارا جماعت کے سارے اکابر اسے یتیم چھوڑ کر جاچکے ہیں تو آپ نے اپنی تمام تر معذوریوں کے باوجود اس یتیم جماعت کو اپنی آغوش شفقت میں اٹھالیا۔ گویا وہ بیعت جو آپ نے انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں "امیر شریعت" کے ہاتھ پر کی تھی وہی آپ کو امیر شریعتؒ کی خلافت و جانشینی تک کھینچ لائی۔ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ سے پہلے آپ "امیر شریعت" کی "پاسبان ختم نبوت فوج" کے سپاہی تھے اور اس تاریخ سے آپ کو اس فوج کا قائد و سپہ سالار بنادیا گیا۔

سوم: حضرت قدس سرہٗ پر حق تعالیٰ شانہٗ کے بے شمار انعامات تھے' آپ کے صحیفۂ زندگی میں قدرت ایک نئے باب ..... اور بالکل آخری باب ..... کا اضافہ کرنا چاہتی تھی' اور وہ تھا آپ کے مقام صدیقیت کا اظہار۔ مسیلمہ کذاب کی خبیث امت کا صفایا سب سے پہلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فوج نے کیا تھا اور مسیلمہ پنجاب کی امت کی سرکوبی "یوسف صدیق" کی فوج نے ..... اول با آخر نسبتے دارد" راقم الحروف کا خیال ہے کہ اسی صدیقی نسبت کی تکمیل کے لئے قدرت آپ کو آخری عمر میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی قیادت کے لئے کشاں کشاں کھینچ لائی تھی۔

یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ حضرت مولانا قاضی احسان احمدؒ کے وصال کے بعد حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ (قدس سرہ) نے حضرت کی خدمت میں جماعت کی قیادت کے لئے درخواست کی تھی مگر حضرت نے فرمایا کہ آپ کی موجودگی میں صرف آپ ہی اس کے لئے موزوں ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس وقت جماعت کی امارت تو قبول نہیں فرمائی البتہ جماعت کی سرپرستی اور مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول فرمالی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بڑے اہتمام سے شرکت فرماتے تھے اور مجلس کی کوئی کاروائی حضرت کے ایماء وارشاد کے بغیر نہیں ہوتی تھی۔ بظاہر حضرت جالندھری مجلس کے امیر خود تھے مگر اس کی حقیقی قیادت اس وقت بھی حضرت بنوری قدس سرہ کے ہاتھ میں تھی۔

حضرت بنوری قدس سرہ کا دور امارت اگرچہ بہت ہی مختصر رہا اور اس میں بھی

حضرت اپنے بے شمار مشاغل اور ضعف و پیرانہ سالی کی بناء پر جماعت کے امور پر خاطر خواہ توجہ نہیں فرماسکتے تھے' اس کے باوجود حق تعالیٰ شانہ نے آپ کی پرخلوص قیادت کی برکت سے جماعت کے کام کو ثریٰ سے ثریا تک پہنچادیا اور "بنوری دور میں" جماعت نے وہ خدمات انجام دیں جن کی اس سے پہلے صرف تمنا کی جاسکتی تھی۔ ان کا بہت ہی مختصر خاکہ درج ذیل ہے:

تاریخ ساز فیصلہ

آپ کو جماعت کی زمام قیادت سنبھالے ابھی دو مہینے نہیں گزرے تھے کہ ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو ربوہ اسٹیشن کا شہرہ آفاق سانحہ رونما ہوا' حضرت ان دنوں سوات کے دور دراز علاقے میں سفر پر تھے۔ وہیں آپ کو اس واقعہ کی کسی نے اطلاع دی۔ خبر سن کر چند لمحے توقف کے بعد فرمایا:

ع "عدو شرے برانگیزد کہ خیرما دراں باشد"

آپ سوات سے بعجلت واپس ہوئے اور تحریک ختم نبوت کی کامیابی کیلئے حضرت نے ایک طرف بارگاہ خداوندی میں تضرع اور ابتہال کا سلسلہ تیز کردیا۔ اور دوسری طرف امت مسلمہ کو متحد کرنے اور قوم کے منتشر ٹکڑوں کو جمع کرنے کے لئے رات دن ایک کردیا۔ ۲۹ مئی سے ۷ ستمبر تک کے سو دن برصغیر کی مذہبی تاریخ میں سو سال کے برابر ہیں ان سو دنوں کی مفصل تاریخ ایک مستقل تالیف کا موضوع ہے مگر یہاں حضرت اقدس ؒ کی ذات سے متعلق چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

۲۹ مئی کو ربوہ کا حادثہ پیش آیا۔ حالات نے نازک صورت اختیار کرلی' اور مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہوگئے۔ مگر حکومت نے بروقت صحیح قدم نہیں اٹھایا بلکہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کی طرح اس تحریک کو بھی کچلنا چاہا۔

۳/ جون ۱۹۷۴ء کو راولپنڈی میں علمائے کرام اور مختلف فرقوں کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا حکومت نے اسے ناکام بنانے کے لئے تین مندوبین ... مولانا مفتی زین العابدین' مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف' مولانا تاج محمود کو لالہ موسیٰ اسٹیشن پر ریل سے اتار لیا۔

۹ جون کو حضرت کی جانب سے ایک نمائندہ اجتماع لاہور میں رکھا گیا۔ جس میں مسلمانوں کے تمام فرقوں اور جماعتوں کے مندوب شریک ہوئے۔ یہ بئیس جماعتوں کا نمائندہ اجتماع تھا۔ سب سے پہلے حضرت نے مختصر سی افتتاحی تقریر میں اجتماع کے اغراض ومقاصد اور تحریک کے لائحہ عمل پر روشنی ڈالی۔ جس کا خلاصہ حضرت ہی کے الفاظ میں یہ تھا:

"ہمارا یہ اجتماع اس وقت صرف ایک دینی عقیدہ کی حفاظت کے لئے ہے۔ یہ اجتماع "ختم نبوت" کے مسئلہ پر ہے۔ اس کا دائرہ آخر تک محض دین رہے گا۔ سیاسی آمیزشوں سے اس کا دامن پاک رہنا چاہئے' جو سیاسی حضرات اس میں شامل ہیں ان کا مطمح نظر دین ہی ہوگا۔ اور حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی کشمکش سے بالاتر ہوگا۔ ختم نبوت کی تحریک کا طریق کار نہایت پرامن ہوگا۔ اور اسے تشدد سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ اگر کوئی مزاحمت ہوئی یا تکلیف پیش آئی تو دین کے لئے اس کو برداشت کرنا ہوگا۔ اور صبر کرنا ہوگا۔ مظلوم بن کر رہنا ہوگا۔ اور ہمارے مد مقابل صرف مرزائی امت ہوگی۔ ہم حکومت کو ہدف بنانا نہیں چاہتے۔ اگر حکومت نے ان کی حفاظت یا ان کی حمایت میں کوئی غلط قدم اٹھایا تو اس وقت مجلس عمل کوئی مناسب فیصلہ کرے گی۔ ابھی قبل از وقت کچھ کہنا درست نہیں۔"

(ماہنامہ بینات ۔ رمضان وشوال ۱۳۹۴ھ)

اس کے بعد مفتی محمود' نواب زادہ نصراللہ خان' اور دیگر نمائندوں کی تقریریں ہوئیں' تحریک کو نظم وضبط کے تحت رکھنے کے لئے ایک "مجلس عمل" کی تشکیل ہوئی۔ اور حضرت مولانا عبدالحق شیخ الحدیث اکوڑہ خٹک نے اس کی صدارت کے لئے حضرت کا نام پیش کیا' حضرت اس کے لئے آمادہ نہ تھے' اس لئے حضرت کو مجبور کیا گیا کہ فی الحال آپ عارضی حیثیت سے مجلس عمل کی قیادت قبول فرمالیں' مستقل صدر کے انتخاب پر آئندہ اجلاس میں غور کرلیا جائے گا.........

اسی اجلاس میں "مجلس عمل" کی جانب سے ۱۴ جون ۱۹۷۴ء کو ملک میں مکمل ہڑتال کے اعلان نیز مرزائی امت کے مکمل مقاطعہ (بائیکاٹ) کا فیصلہ کیا گیا۔

اس دوران وزیر اعظم نے "مجلس عمل" کے ارکان سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ حضرت نے نہایت صفائی اور سادگی سے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں وزیر اعظم کے سامنے مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کی' آپ نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ آپ ہی کے الفاظ میں یہ تھا۔

"قادیانی مسئلہ بلاشبہ پاکستان کے روز اول سے موجود ہے۔ پہلی غلطی اس وقت ہوئی جب ظفر اللہ قادیانی کو وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ شہید ملت (خان لیاقت علی خان مرحوم) کو اس خطرناک غلطی کا احساس ہوا۔ اور انہوں نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا عزم کرلیا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ شہید کردیئے گئے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ان کا یہ عزم ہی ان کی شہادت کا سبب ہوا ہو۔ اس وقت جو جرأت مرزائیوں کو ہوئی ہے اگر اس وقت اس کا تدارک نہ کیا گیا اور وہ غیر مسلم اقلیت قرار نہیں دیئے گئے تو مسلمانوں کے جذبات بھڑکیں گے' اور ان کی (قادیانیوں کی) جان ومال کی حفاظت حکومت کے لئے مشکل ہوگی۔ اقلیت قرار دیئے جانے کے بعد اس ملک میں ان کی حیثیت "ذمی" کی ہوگی اور ان کی جان ومال کی حفاظت شرعی قانون کی رو سے مسلمانوں پر ضروری ہوگی' اس طرح ملک میں امن قائم ہوجائے گا۔

میں مانتا ہوں کہ آپ پر خارجی غیر اسلامی حکومتوں کا دباؤ ہوگا لیکن اس کے بالمقابل ان اسلامی ممالک کا تقاضا بھی ہے کہ ان کو جلد غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ جن ممالک سے ہمارے اسلامی تعلقات بھی ہیں اور ہر قسم کے مفادات بھی وابستہ ہیں۔ خارجی دنیا میں غیر اسلامی حکومتوں کے بجائے اسلامی مملکتوں کو مطمئن اور خوش کرنا زیادہ ضروری ہے۔ نیز ایک معمولی سی اقلیت کو خوش کرنے کے لئے اتنی بڑی اکثریت کو غیر مطمئن کرنا دانش مندی نہیں' اگر آپ حق تعالیٰ پر توکل واعتماد کرکے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ فرمائیں تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کا بال بیکا نہیں کرسکتی' اور اس راستہ میں موت بھی سعادت ہے"۔ (حوالہ مذکور)

۱۳ر جون کو وزیر اعظم نے ایک طویل تقریر ریڈیو پر نشر کی' جس میں حادثہ ربوہ پر ایک حرف بھی نہیں کہا' البتہ ختم نبوت پر اپنا ایمان جتاتے ہوئے کہا کہ یہ مسئلہ نوے سال کا پرانا ہے' اتنی جلدی کیسے حل ہو سکتا ہے۔

۱۴ جون کو ملک میں درہ خیبر سے کراچی اور لاہور سے کوئٹہ تک ایسی مکمل ہڑتال ہوئی جو پاکستان میں اپنی نظیر آپ تھی۔

۱۶ر جون کو "مجلس عمل" کا لائل پور میں اجلاس ہوا جس میں وزیر اعظم کی ۱۳ جون کی تقریر پر غور کیا گیا...

"مجلس عمل" کی مستقل صدارت کے لئے حضرت کو مجبور کیا گیا۔ جسے آپ کو منظور کرنا پڑا۔ اسی اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ تحریک کو پرامن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ قادیانیوں کا بائیکاٹ جاری رکھا جائے اور تحریک کو سول نافرمانی سے بہرقیمت بچایا جائے۔

تحریک کو زندہ مگر پرامن رکھنے کے لئے حضرت نے کراچی سے پشاور تک دورے کئے' چھوٹے قصبوں تک تشریف لے گئے' ہر جگہ مسلمانوں کو صبر و سکون سے تحریک چلانے کا حکم فرمایا' لیکن اس کے برعکس حکومت نے جارحانہ رویہ اختیار کیا' حضرت فرماتے ہیں:

> "ادھر مجلس عمل کی پالیسی تو یہ تھی کہ حکومت سے تصادم سے بہرصورت گریز کیا جائے ادھر حکومت نے ملک کے چپے چپے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی' پریس پر پابندی عائد کردی۔ انتظامیہ نے اشتعال انگیز کارروائیوں سے کام لیا اور مسلمانوں کو گرفتار کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سینکڑوں اہل علم اور طلباء کو گرفتار کیا گیا۔ (بعد میں گرفتاریوں کا سلسلہ اور بڑھتا گیا۔ جیلوں میں "گرفتاران ختم نبوت" کو نہایت بے دردی سے اذیتیں دی گئیں اور پولیس اور جیل کے ہاتھوں انسانیت کی مٹی پلید کی گئی۔ قادیانیوں نے پہلے سے اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ انہوں نے "حربی کافروں" کی طرح جگہ جگہ مورچے لگائے' اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ حکومت اور پولیس بھی قادیانی امت کی حفاظت و حمایت کرتی رہی۔) انہیں ناروا ایذائیں دی گئیں' کبیر والا'

اوکاڑہ، سرگودہا، لائل پور، کھاریاں وغیرہ میں دردناک واقعات رونما ہوئے۔ جن کو مظلومانہ صبر کے ساتھ برداشت کیا گیا۔ صرف ایک شہر اوکاڑہ میں ان مظالم کے خلاف احتجاج کے طور پر بارہ دن مکمل اور مسلسل ہڑتال ہوئی۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ملک بھر میں مجموعی طور پر کتنا ظلم اور اس کے خلاف کتنا احتجاج ہوا؟ جگہ جگہ لاٹھی چارج کیا گیا۔ اشک ریز گیس کا استعمال بڑی فراخدلی سے کیا گیا۔ مجلس عمل کی تلقین تمام مسلمانوں کو یہی تھی کہ صبر کریں اور مظلوم بن کر حق تعالیٰ کی رحمت اور غیبی تائید الٰہی کے منتظر رہیں۔ قریباً پورے سو دن تک ان حالات کا مقابلہ کیا گیا اور تمام سختیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔" (بینات: رمضان و شوال ۱۳۹۴ھ)

جون کے اواخر میں بنگلہ دیش کے دورے پر جاتے ہوئے وزیر اعظم (بھٹو صاحب) نے اعلان کیا کہ قادیانی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے قومی اسمبلی کو ایک تحقیقاتی کمیٹی کی حیثیت دے دی جائے گی۔ بنگلہ دیش کے دورے سے واپس آئے تو یکم جولائی کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا، اور اس میں قومی اسمبلی کو "خصوصی کمیٹی" قرار دینے کا فیصلہ ہوا۔ اور یہ بھی طے ہوا کہ کمیٹی کے لئے چالیس ارکان کا کورم ہوگا جن میں تیس ارکان حزب اقتدار کے اور دس حزب اختلاف کے ہوں گے۔ اس خصوصی کمیٹی کے سامنے دو قراردادیں بحث و تمحیص کے لئے پیش کی گئیں، ایک حزب اقتدار کی جانب سے وزیر قانون (مسٹر حفیظ پیرزادہ) نے پیش کی اور دوسری حزب اختلاف کی جانب سے پیش کی گئی۔

۲۰ جولائی کو حضرت قدس سرہٗ کے خلاف ملک بھر کے اخبارات (نوائے وقت لاہور کے سوا) میں ایک فرضی انجمن کے نام سے ایک لچر پوچ اشتہار چھپنا شروع ہوا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس شرانگیزی کا منبع کہاں ہے اور اس کے لئے لاکھوں کا سرمایہ کہاں سے آتا ہے، لیکن حضرت قدس سرہ نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا نہ اس کے خلاف کوئی احتجاج کیا۔ تاہم "چاند کا تھوکا منہ پر آتا ہے" کے مصداق یہ اشتہار حضرت کے بجائے حکومت

اور مرزائیوں کے لئے مضر ثابت ہوا۔ ہر طرف سے ان کے خلاف صدائے نفرین بلند ہونا شروع ہوئی اور مسلمانوں کے مشتعل جذبات آتش فشاں بن گئے۔ نتیجۃً چند دن بعد یہ اشتہار بند ہوگیا۔

۳۱ جولائی کو وزیر اعظم نے مستونگ (بلوچستان) میں اعلان کیا کہ قادیانی مسئلہ کے فیصلہ کی تاریخ کا اعلان کل کردیا جائے گا۔ چنانچہ فیصلہ کے لئے ۷ ستمبر کی تاریخ کا اعلان ہوا۔

قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے قادیانی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لئے دو مہینے میں ۲۸ اجلاس کئے' اور ۹۶ گھنٹے نشستیں کیں' مسلمانوں کی طرف سے "ملت اسلامیہ کا موقف" نامی کتاب اسمبلی میں پیش کی گئی۔ قادیانیوں کی ربوائی اور لاہوری پارٹیوں کے سربراہوں نے اپنے اپنے موقف کی وضاحت کے لئے کتابچے پیش کئے' ربوہ جماعت کے سربراہ مرزا ناصر احمد پر گیارہ دن تک ۴۲ گھنٹے اور لاہوری پارٹی کے امیر مسٹر صدر الدین پر سات گھنٹے جرح ہوئی۔

وزیر اعظم (بھٹو) قادیانیوں کے حلیف رہ چکے تھے۔ وہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر رضامند نہیں تھے وہ قادیانیوں کو کسی نہ کسی طرح آئینی تلوار کی زد سے بچانا چاہتے تھے اور اس کے لئے اپنی طاقت اور ذہانت کا سارا سرمایہ صرف کردینا چاہتے تھے۔ چنانچہ حزب اختلاف کے ارکان سے جو "مجلس عمل" کے نمائندے تھے ان سے وزیر اعظم کی بار بار ملاقاتیں ہوئیں۔ کئی بار صورت حال نازک ہوگئی۔ آخری دن تو گویا ہنگامہ محشر تھا' امید و بیم کی کیفیت آخری حدوں کو چھو رہی تھی' وزیر اعظم کی "انا" نے تصادم کا خطرہ پیدا کردیا تھا' حکومت کی جانب سے پولیس اور انٹیلی جنس کو چوکنا کردیا تھا' بڑے شہروں میں فوج لگادی گئی تھی' جو لوگ گرفتار تھے وہ تو تھے ان کے علاوہ ہزاروں علماء اور سربرآوردہ افراد کی گرفتاری کی فہرستیں تیار ہوچکی تھیں۔ ادھر "مجلس عمل" کے نمائندے بھی سربکف کفن بدوش تھے۔ گویا

همہ آهوان صحرا سر خود نهاده برکف
بامید آنکہ روزے بشکار خواهی آمد

کا منظر تھا' مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس مہیب خطرے سے ملک کو

بچالیا جب وزیر اعظم کی "انا" میں لچک پیدا ہوتی نظر نہ آئی تو حضرت مفتی محمود نے (جو اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ مجلس عمل کے نمائندہ کی حیثیت سے وزیر اعظم سے مذاکرات کر رہے تھے) ان سے فرمایا "ہمیں بتایئے کہ آخر ہم کیا کریں؟ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ نہیں مانتے اور مجلس عمل والوں کے پاس جاتے ہیں تو وہ نہیں مانتے"۔ وزیر اعظم نے نشہ اقتدار کے جوش میں جواب دیا "میں نہیں جانتا مجلس عمل کون ہوتی ہے۔ میں تو آپ لوگوں کو جانتا ہوں' آپ اسمبلی کے معزز رکن ہیں"۔

حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:

> بھٹو صاحب! آپ کو قوم کے ایک حلقہ نے منتخب کر کے بھیجا ہے' اس لئے آپ اسمبلی کے معزز رکن ہیں۔ میں بھی ایک حلقہ انتخاب کا نمائندہ ہوں۔ اس لئے میں بھی اسمبلی کا رکن کہلاتا ہوں۔ مگر آنجناب کو بتانا چاہتا ہوں کہ "مجلس عمل" کسی ایک حلقہ انتخاب کی نمائندہ نہیں ہے بلکہ وہ اس وقت پاکستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے۔ کیسی عجیب منطق ہے کہ آپ ایک حلقہ کے نمائندے کو عزت واحترام کا مقام دینے کے لئے تیار ہیں مگر قوم کے سات کروڑ افراد کی نمائندہ جماعت "مجلس عمل" کو آپ پائے حقارت سے ٹھکرا رہے ہیں..... بہتر ہے میں ان سے جا کر کہہ دیتا ہوں کہ وزیر اعظم پاکستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی بات سننے کو تیار نہیں"۔

یہ بات سن کر وزیر اعظم کی "انا" سرنگوں ہو گئی' انہوں نے "مجلس عمل" کے نمائندوں کے مجوزہ فیصلہ پر دستخط کر دیئے اور اسطرح ۷/ ستمبر ۴ بجکر ۳۵ منٹ پر قادیانیوں کی دونوں شاخوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا۔ پھر اس مسودہ کو آئینی شکل دینے کے لئے پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اور آئینی طور پر قادیانی ناسور کو ملت اسلامیہ کے جسد سے الگ کر دیا گیا۔ اس خبر کا نشر ہونا تھا کہ نہ صرف پورے ملک میں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں میں فرحت و مسرت کی لہر دوڑ گئی' ایسی اجتماعی خوشی کسی نے نہ کبھی پہلے دیکھی تھی نہ شاید آئندہ دیکھنی نصیب ہو گی' یہ محض حق تعالیٰ شانہ کی رحمت وعنایت اور امت مسلمہ کے اتحاد اور صبر وعزیمت کا کرشمہ تھا' جسے

چودہویں صدی میں اسلام کا معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ چونکہ حضرت اقدس ہی اس تحریک کے روح رواں "مجلس عمل" کے صدر اور "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے قائد وامیر تھے اس لئے آپ کو جتنی خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ آپ نے بصائر وعبر میں پوری قوم کو مبارک باد دی اور حق تعالیٰ شانہ کے شکر وسپاس کے ساتھ ساتھ اس تحریک میں حصہ لینے والے تمام افراد اور جماعتوں کا شکریہ ادا کیا(دیکھئے بینات رمضان وشوال ۱۳۹۴ھ)

اس تحریک کی کامیابی پر بہت سے اکابر نے آپ کو تہنیت اور مبارک باد کے گرامی نامے لکھے' یہاں تبرک کے طور پر صرف دو خطوط کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ برکۃ العصر حضرت الشیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے تو جناب کی انتہائی کامیابی پر انتہائی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مژدہ سننے کے بعد سے آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں کہ اس کا اصل سہرا تو آپ کے سر ہے اگرچہ

"مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چین بستہ اند"

لوگ جو چاہیں لکھیں' یا جو چاہیں کہیں' میرے نزدیک تو آپ کی روحانی قوت اور بدنی جانفشانی کا ثمرہ ہے' اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ آپ نے جو دعائیہ کلمات نابکار کے حق میں لکھے ہیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور آپ کی دعا کی برکت سے اس نابکار کو بھی کار آمد بنادے۔"

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے تو آپ کو اس عظیم کامیابی پر آپ کے اسلاف کے ایک ادنیٰ نیاز مند کی حیثیت سے مخلصانہ مبارک باد پیش کرتا ہوں جس کے متعلق بدیع الزمان الہمدانی کے یہ الفاظ بالکل صادق ہیں: **فتح فاق الفتوح وأمنت علیہ الملائکۃ والروح** اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے اس کارنامے سے آپ کے جد امجد حضرت سید آدم بنوری اور ان کے شیخ حضرت امام ربانی اور آپ کے استاذ ومربی حضرت سید مولانا

سید انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی روح ضرور مسرور و مبتہج ہوئی ہوگی اور اس کی بھی امید ہے کہ روح مبارک نبوی علیہا الف الف سلام کو بھی مسرت ہوئی ہوگی" "**فھنیئًا لکم وطوبیٰ**" اگر میری ملاقات ہوئی تو میں آپ کے دست مبارک کو بوسہ دے کر اپنے جذبات کا اظہار ضرور کروں گا"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فتنۂ ضالہ کی بیخ کنی پر صرف زمین کے باشندوں ہی کو خوشی نہیں ہوئی بلکہ ملاء اعلیٰ میں جشن مسرت منایا گیا، اور عالم ارواح میں بھی.... حضرت اقدس کو اس فیصلہ کے بعد عجیب وغریب مبشرات سے نوازا گیا۔ ان میں دو مبشرات حضرت ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔

"قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جانا بہت ہی عظیم برکات کا کارنامہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے منکروں کا مسلمانوں سے خلا ملا نہ صرف مسلمانوں کے حق میں ناسور تھا بلکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک بھی بے تاب تھی، قادیانی مسئلہ کے حل پر جہاں تمام ممالک کی جانب سے تہنیت ومبارک باد کے پیغامات آئے وہاں منامات ومبشرات کے ذریعہ عالم ارواح میں اکابر امت اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسرت بھی محسوس ہوئی۔ آپ کے مبشرات کا ذکر کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تاہم اہل ایمان کی خوشخبری کے لئے اپنے دو بزرگوں سے متعلق بشارات منامیہ مخلصین کے اصرار پر ذکر کرتا ہوں"۔

جمعہ ۳ر رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ صبح کی نماز کے بعد خواب دیکھتا ہوں کہ حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری علیہ الرحمۃ گویا سفر سے تشریف لائے ہیں اور خیر مقدم کے طور پر لوگوں کا بہت ہجوم ہے لوگ مصافحے کررہے ہیں۔ جب ہجوم ختم ہوگیا اور تنہا حضرت شیخ رہ گئے تو دیکھتا ہوں کہ بہت وسیع چبوترہ ہے جیسے اسٹیج بنا ہوا ہو۔ اس پر فرش ہے اور اوپر جیسے شامیانہ ہو۔ بالکل درمیان میں حضرت شیخ تنہا تشریف فرما ہیں۔ دو تین سیڑھیوں پر چڑھ کر ملاقات کے

لئے پہنچا۔ حضرت شیخ اٹھے اور گلے لگالیا۔ میں ان کی ریش مبارک اور چہرہ مبارک کو بوسے دے رہا ہوں۔ حضرت میری داڑھی اور چہرے کو بوسے دے رہے ہیں۔ دیر تک یہ ہوتا رہا۔ چہرہ وبدن کی تندرستی زندگی کے آخری ایام سے بہت زیادہ ہے بے حد خوش اور مسرور ہیں۔ بعد ازاں میں دو زانو ہوکر فاصلہ سے باادب بیٹھ گیا اور آپ سے باتیں کررہا ہوں۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کیا کہ بھول گیا کہ "معارف السنن" حاضر کرتا فرمایا میں نے نہایت خوشی اور مسرت کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا ہے۔ اب چھٹی جلد کا مطالعہ کررہا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس تو علم نہیں جو کچھ آپ نے فرمایا تھا بس اس کی تشریح وتوضیح وخدمت کی ہے' بہت مسرت کے لہجے میں فرمایا: "بہت عمدہ ہے"۔

شوال ۱۳۹۴ھ میں لندن کے قیام کے دوران خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا وسیع میدان ہے گویا ختم نبوت کا دفتر ہے بہت سے لوگوں کا مجمع ہے میں ایک طرف جاکر سفید چادر جس طرح کہ احرام کی چادر ہو' باندھ رہا ہوں بدن کا اوپری حصہ برہنہ ہے کوئی چادر یا کپڑا نہیں اتنے میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اسی ہیئت میں کہ احرام والی سفید چادر کی لنگی بندھی ہوئی ہے اور اوپر کا بدن مبارک بغیر کپڑے کے ہے میرے داہنے کندھے کی جانب تشریف لائے اور آتے ہی مجھ سے چمٹ گئے۔ پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا: "واہ میرے پھول" پھر دیر تک معانقہ فرمایا میں خواب کی ہی حالت میں خیال کرتا ہوں کہ مبارک باد کے لئے تشریف لائے ہیں انتہی۔ منامات کی حیثیت مبشرات کی ہے اس سے زیادہ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ بہرحال قادیانی ناسور کے علاج سے نہ صرف زندہ بزرگوں کو مسرت ہوئی بلکہ جو حضرات دنیا سے تشریف لے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی اس سے بے حد وبے پایاں خوشی ہوئی۔ فالحمد للہ"۔

(بینات ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ۔ دسمبر ۱۹۷۴ء)

انہی مبشرات کے ضمن میں جی چاہتا ہے کہ اس خط کا اقتباس بھی درج کردیا جائے جو حضرت کے ایک گہرے دوست الشیخ محمود الحافظ مکی نے آپ کو ملک شام سے لکھا تھا۔ اصل خط عربی میں ہے یہاں اس کا متعلقہ حصہ اردو میں نقل کرتا ہوں۔

"میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ میں نے ۳ر شعبان ۱۳۹۴ھ رات کو آپ کے بارے میں بہت عمدہ اور مبارک خواب دیکھا ہے جس کی آپ کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں اور اس کو یہاں اختصار کے ساتھ نقل کرتا ہوں"۔

میں نے آپ کو ایسے شیوخ کی جماعت کے ساتھ دیکھا ہے جو سن رسیدہ تھے اور جن پر صلاح و تقویٰ کی علامات نمایاں تھیں۔ یہ سب حضرات اس قرآن کریم کے صفحات جمع کرنے میں مصروف تھے جو آنجناب نے اپنے قلم سے زاعفرانی رنگ کی روشنائی سے بدست خود تحریر فرمایا ہے اور آنجناب کا قصد ہے کہ اسے لوگوں کے فائدہ کے لئے شائع کیا جائے۔ آپ نے اپنے اس ارادے کا اظہار نہایت مسرت وشادمانی کے ساتھ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

صبح جب نماز فجر کے لئے اٹھا تو قلب فرحت سے لبریز تھا' اور میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ کے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی وکامرانی کا تاج پہنایا ہے۔ والحمدللہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات"۔

یہ مبارک خواب تحریک ختم نبوت کے زمانے کا ہے' سنہرے حروف سے قرآن کریم لکھنے کی تعبیر اہل فن ہی کرسکتے ہیں راقم الحروف کا قیاس ہے کہ اس فیصلہ کے ذریعہ آیت خاتم النبیین کو صفحات عالم پر سنہرے حروف سے رقم کرنے کی طرف اشارہ ہوا..... نیز قادیانی امت نے چونکہ قرآن کریم پر تحریف کی سیاہی ڈال دی ہے اور ان کے نزدیک مرزا قادیانی سے قبل قرآن کریم آسمان پر اٹھ گیا تھا۔ بقول ان کے مرزا قادیانی کی وحی قرآن کو دوبارہ لائی ہے اور یہ عقیدہ قرآن کریم کی عظمت کو مٹانے کے مترادف ہے۔ نیز قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ اب صرف محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت اور قرآن کریم کی تعلیمات مدار نجات نہیں بلکہ مدار نجات نعوذ باللہ مرزا قادیانی کی تعلیمات اور اس

کی مہمل اور شیطانی وحی ہے۔ یہ عقیدہ گویا انکار قرآن کے مراوف ہے۔ اس لئے سنہرے حروف سے قرآن کریم لکھنے اور اسے چار دانگ عالم میں پھیلانے کی تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی ابدیت' اس کی عظمت اور اس کے مدار نجات ہونے کے منکر ہیں ان کا کافر و مرتد ہونا ساری دنیا پر واضح کردیا جائے تاکہ جو غبار انہوں نے قرآن کریم کی تعلیمات پر ڈالا ہے وہ صاف ہوجائے اور قرآن کریم کی روشن و تابندہ ہدایت واضح ہوجائے..... الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام حضرت کے ہاتھوں سے لیا اور بہت سے ذی صلاح و تقویٰ شعار بزرگوں نے اس مقدس کام میں آپ کا ہاتھ بٹایا..... اس تحریک کی کامیابی کے لئے دعائیں کیں' ختمات کا اہتمام کیا۔

تحریک ختم نبوت کی کامیابی پر آپ کو ایک اور انعام ملا۔ حضرت فرماتے تھے کہ تحریک کے بعد غالباً رمضان المبارک میں میں نے خواب دیکھا کہ ایک چاندی کی تختی مجھے عطا کی گئی ہے اور اس پر سنہرے حروف سے یہ آیت لکھی ہے: **انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمان الرحیم۔** میں نے محسوس کیا کہ یہ تحریک ختم نبوت پر مجھے انعام دیا جارہا ہے' اور اس کی یہ تعبیر کی کہ مجھے حق تعالیٰ بیٹا عطا فرمائیں گے اور میں اس کا نام سلیمان رکھوں گا۔ چنانچہ اس خواب کے دو سال بعد حق تعالیٰ نے ستر برس کی عمر میں آپ کو صاحبزادہ عطا فرمایا اور آپ نے اس کا نام سلیمان تجویز فرمایا۔

عالمی تحریک:

۷ ستمبر کے فیصلہ کے بعد بھی حضرت چین سے نہیں بیٹھے' بلکہ اس فیصلہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ اس سلسلہ میں آپ کے پیش نظر تین چیزیں تھیں:

۱۔ اندرون ملک صرف قادیانیوں کے "غیر مسلم" ہونے پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بلکہ حکومتی سطح پر ان کے ساتھ معاملہ بھی وہی کیا جائے جس کے غیر مسلم مستحق ہیں۔ مثلاً شناختی کارڈ اور پاسپورٹ میں ایک خانہ مذہب کا تجویز کیا جائے اور اس میں قادیانیوں کے "غیر مسلم" ہونے کی تصریح کی جائے۔ قادیانیوں کو اسلام کے شعار اپنانے کی اجازت نہ دی جائے اور ان امور کے لئے مناسب قانون سازی کی جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ بیرون ملک جہاں جہاں قادیانی اثرات ہیں وہاں تحریک ختم نبوت کو ایک عالمی تحریک کی شکل دی جائے' پاکستان قومی اسمبلی کے فیصلہ کی دنیا بھر کی زبانوں میں اشاعت کی جائے' اور قادیانیوں نے اسلام اور مسلمانوں سے جو غداریاں کیں ہیں ان سے ساری دنیا کے مسلمانوں کو باخبر کیا جائے۔ آئندہ قادیانیوں کے جو منصوبے ہیں ان پر کڑی نظر رکھی جائے۔

۳۔ سب سے اہم یہ کہ جو لوگ غفلت یا جہالت کی بنا پر قادیانی چنگل میں گرفتار ہوئے ہیں' اور انہوں نے قادیانیت کو واقعی اسلام سمجھ کر قبول کیا ہے جہاں تک ممکن ہو موعظت وحکمت کے ساتھ انہیں اسلام کی دعوت دی جائے۔ اور اسلام اور قادیانیت کے درمیان جو مشرق ومغرب کا بعد ہے وہ ان پر واضح کیا جائے۔

حضرت اقدسؒ نے مولانا سمیع الحق مدیر ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک کے نام اپنے ایک گرامی نامہ میں ان نکات کی وضاحت فرمائی ہے جو درج ذیل ہے:

"برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب زادکم اللہ توفیقا الی الخیر السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ نہ معلوم نامۂ کرم کب آیا اور کہاں ہے لیکن عزیز محمد بنوری سلمہ سے یہ معلوم ہوا کہ جواب کا انتظار کررہے ہیں اور اشاعت رکی ہوئی ہے۔ اس لئے چند حروف لکھ رہا ہوں' تفصیل کی نہ حاجت' نہ فرصت' نہ ہمت۔ اختصار بلکہ ایجاز سے عرض ہے کہ آئینی فیصلہ نہایت صحیح اور باصواب ہے' اگر چہ بعد از وقت ہے اور بعد از خرابی بسیار۔ وزیر اعظم صاحب نے جو اخبارات میں یہ اعتراف فرمایا ہے کہ "قادیانی مسئلہ کے حل ہونے سے پاکستان کو سیاسی استحکام حاصل ہوگیا"۔ اور تمامی صاحب نے یہ اعلان فرمایا کہ "پاکستان آج صحیح معنوں میں پاکستان بنا"۔

دونوں سیاست دانوں کے اعلان سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ کام کتنے عرصے پہلے ہونا چاہئے تھا۔

ہماری ذمہ داری ختم نہیں ہوئی بلکہ آئینی نقوش کو جب تک عملی جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک مقصد ناتمام ہے۔ "اسلام در کتاب

مسلماناں درگور" والا معاملہ ہوگا' اندرون ملک قادیانیوں کا جو کچھ رد عمل ہے وہ تذبذب ہے' مایوسی ہے اور زیادہ سے زیادہ گیدڑ بھبکی ہے اور کچھ نہیں۔ باہر ممالک میں حتی کہ انگلستان میں بھی اس کے اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں' لیکن افریقہ کے ممالک میں اس آئینی فیصلہ کی اشاعت اور عام کرنے کی بڑی ضرورت باقی ہے۔ حکومت کو اپنا بین الاقوامی دامن بچانے کے لئے .... عربی انگریزی اور فرانسیسی زبان میں اس مقصد کی اشاعت اپنے سفیروں کے ذریعے تمام ممالک میں کرانی چاہئے۔ اس وقت جو کچھ حکومت کی پالیسی ہے اس میں تغافل' تذبذب بلکہ ایک گونہ نفاق ہے۔ اس لئے (حکومت نے) عملی صورت میں کوئی اقدام نہیں کیا' نہ ان قیدیوں کو رہا کیا (جو تحریک ختم نبوت کے دوران گرفتار کیے گئے) نہ ربوہ کو باقاعدہ تحصیل کی شکل دی ہے' نہ فارغ علاقہ ان سے واپس لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرکز سے زیادہ پنجاب گورنمنٹ کی دوغلی پالیسی یا طرف دارانہ پالیسی کا نتیجہ ہو۔ بہر حال حالات اگر مایوس کن نہیں تو زیادہ امید افزاء بھی نہیں۔ بس اس وقت زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ تفصیلات بہت کچھ ہیں والسلام"۔

یہ گرامی نامہ ۱۹۷۵ء کے آغاز میں (۱۴ جنوری کو) تحریر فرمایا' ان دنوں حضرت پر پوری دنیا میں اس تحریک کو عام کرنے کا جذبہ بڑی شدت سے غالب تھا۔ فرماتے تھے "کاش میں جوان ہوتا' قویٰ میں طاقت وہمت ہوتی تو دنیا بھر میں آگ لگادیتا"۔ چنانچہ ضعف وناتوانی اور پیرانہ سالی کے باوجود آپ نے فتنہ قادیان کے استیصال کے لئے بیرونی ممالک میں بھی کوششیں شروع کردیں' اور یورپ' افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں مسلمانوں کو قادیانیت کے مقابلہ میں منظم اور بیدار کرنے کے لئے خود دو مرتبہ طویل سفر فرمایا۔ پہلا سفر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں انگلستان کا کیا۔ جس کی ابتداء حرمین شریفین کی حاضری اور اعتکاف سے ہوئی۔ اس کا مختصر سا تذکرہ حضرتؒ نے ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ (دسمبر ۱۹۷۴ء) کے "بصائر وعبر" میں کیا ہے جس کا ابتدائی حصہ درج ذیل ہے:

"الحمد للہ ماہ رمضان المبارک میں کچھ لمحات حرمین شریفین میں نصیب

ہوئے۔ انگلستان کی دینی دعوت آئی تھی' اگرچہ صحت اچھی نہیں تھی اور ڈاکٹروں کی حتمی رائے سفر نہ کرنے کی تھی' اور خود مجھے بھی تردد ضرور تھا' لیکن استخارہ کرکے اللہ کا نام لے کر جدہ سے ۲۲ نومبر ۷۴ء کو روانہ ہوگیا' ہڈر شفیلڈ میں جاتے ہی ایک جدید حادثے سے دوچار ہوا' ڈاکٹروں نے تین روز سکوت اور ایک ہفتہ آرام کا مشورہ دیا۔ لیکن بیانات کا نظم بن چکا تھا اور اس کا اعلان ہوگیا تھا اس لئے بادل ناخواستہ ڈاکٹروں کے مشورے کے خلاف کرنا پڑا' الحمد للہ کہ تقریباً تمام پروگرام حق تعالیٰ شانہٗ نے پورا کرادیا۔ متعدد مقامات پر جانا ہوا۔ اور جن اہم دینی مسائل کی ضرورت سمجھی ان پر بیانات ہوئے۔ ہڈر شفیلڈ' بولٹن' ڈیوز بری' بلیک برن' پرسٹن' بریڈ فورڈ' گلسٹر' والسال' برمنگھم' ولور ہملٹن' کونٹری' لسٹر' نیٹی ٹن' اور خود لندن کے مختلف مقامات پر پروگرام بن چکے تھے' اللہ تعالیٰ نے باوجود صحت کی خرابی وطبیعت کی ناسازی کے توفیق محض اپنے فضل وکرم سے نصیب فرمائی۔ متعدد دینی موضوعات پر بیان ہوا۔ مثلاً:

۱۔ دین اسلام بڑی نعمت ہے. ۲۔ اسلام اور بقیہ مذاہب کا موازنہ. ۳۔ دنیا وآخرت کی نعمتوں کا موازنہ. ۴۔ دنیا کی زندگی کی حقیقت. ۵۔ طمانیت قلب دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور اس کا ذریعہ حقیقی اسلام ہے ۶۔ ذکر اللہ جس طرح حیات قلوب کا ذریعہ ہے ٹھیک اسی طرح بقاء عالم کا ذریعہ بھی ہے ۷۔ لندن وانگلستان میں مسلمانوں کی زندگی کا نقشہ ۸۔ دنیا کی زندگی میں انہماک اور آخرت سے دردناک غفلت ۹۔ انگلستان میں مسلمانوں نے اگر دینی انقلاب اختیار نہ کیا تو ان کا مستقبل نہایت تاریک ہے ۱۰۔ انگلستان کے پراز شہوت ماحول میں اصلاح نفوس کی تدبیر ۱۱۔ مخلوط تعلیم کے دردناک نتائج اور اس سے بچنے کا لائحہ عمل ۱۲۔ محبت رسول کی روشنی میں سنت وبدعت کا مقام ۱۳۔ حضرات انبیاء کرام کی عصمت اور صحابہ کرام کا مقام ۱۴۔ انگلستان میں عالم دین کی زندگی کیسی ہو؟ ۱۵۔ رؤیت ہلال وغیرہ بعض

مسائل میں علماء کا اختلاف اور اتحاد کے لئے لائحہ عمل ۱۶ - قادیانی مسئلہ اور اس کا متفقہ حل"۔

لوگ انگلستان جاتے ہیں تو بڑی "سوغاتیں" ساتھ لاتے ہیں' مگر حضرت کے اس سفر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ حضرت نے اس میں کوئی ہدیہ قبول نہیں کیا' فرماتے تھے کہ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے لئے ایک شخص نے باصرار پانچ پونڈ کا عطیہ دیا تھا' صرف وہی لایا ہوں اس کے سوا کچھ نہیں لایا۔

حضرتؒ نے اس سلسلہ میں دوسرا سفر تقریباً ایک درجن افریقی ممالک کا کیا جو حسب معمول حرمین شریفین سے شروع ہوا اور حرمین پہنچ کر ختم ہوا۔ اس سفر کی مفصل روئداد حضرت کے رفیق سفر جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق کے مقالہ میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے البتہ حضرت نے اس سفر کے بارے میں ایک گرامی نامہ نیروبی سے تحریر فرمایا تھا اس کا اقتباس یہاں دیا جاتا ہے جس سے کام کے طریق کار پر روشنی پڑتی ہے۔

"جدہ سے روانگی کے وقت کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں کہاں جانا ہوگا اور کس طرح کام کرنا ہوگا' اس لئے روانگی ایسے وقت ہوئی کہ نہ پورے ویزے لے سکے' نہ باقاعدہ کسی کو مطلع کیا جاسکا' نیروبی پہنچ کر کچھ نقشہ کام کا سمجھ میں آگیا کہ موثر اور صحیح صورت یہ ہے کہ ہر مرکزی مقام پر مقامی باشندوں کی جماعت "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے نام سے تشکیل دی جائے جو بسلسلہ قادیانیت موثر کام کرسکے' اور تقریروں میں اسلام اور ختم نبوت کی اہمیت و حقیقت واضح کی جائے' چنانچہ اس انداز سے کام شروع کیا اور نشان منزل نظر آنے لگا...

زمبیا سے واپسی پر یوگنڈا کا ویزا نہ ہونے کی وجہ سے تین چار دن یہاں تاخیر ہوگئی' شاید کل روانگی ہوسکے گی ....' سفر کے اختصار کا سوچ رہا تھا' لیکن معلوم ہوا کہ نائیجریا میں قادیانیوں کے اسکول' ہسپتال اور ادارے ہیں اور حکومت میں بھی ان کے عہدے ہیں۔ وہاں جانے کی شدید ضرورت ہے' اس لئے مغربی افریقہ کا ارادہ کرنا پڑا' اور پھر ساتھ

ہی مغربی افریقہ کے بقیہ ممالک کا جوڑ بھی لگانا ہو گا۔ اس لئے سفر طویل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آسان فرمائیں۔ آمین"۔

حضرتؒ کا یہ سفر جدہ سے ۷ر شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو شروع ہوا، اور ۱۹ر ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲ر نومبر ۱۹۷۵ء کو جدہ واپسی ہوئی۔

۱۹۷۵ء میں انڈونیشیا کے ایک بہت بڑے عالم الشیخ الحبشی الشافعی مشرق وسطی کے دورہ سے واپسی پر حضرتؒ کی خدمت میں کراچی تشریف لائے کئی دن ان کا قیام رہا اور انہوں نے حضرتؒ کے سامنے انڈونیشیا میں قادیانی سرگرمیوں اور نصرانی سازشوں کی تفصیلات پیش کیں۔ یہ بھی بتایا کہ "قادیانیوں سے ہمارا معرکہ رہتا ہے جب ہم مرزا غلام احمد کا کوئی حوالہ پیش کرتے ہیں تو قادیانیوں کی طرف سے اصل کتاب پیش کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے۔ میں نے مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہٗ کو لکھا تھا کہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس فن کے امام مولانا شیخ محمد یوسف بنوری ہیں۔ کراچی میں ان سے رجوع کرو۔ اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

حضرتؒ نے ان کی بہت ہی قدر اور ہمت افزائی کی اور ان سے فرمایا کہ ہم نہ صرف قادیانیوں کا سارا لٹریچر آپ کے لئے مہیا کریں گے بلکہ ایک ایسا عالم بھی بھیجیں گے جو قادیانیت کا پورا ماہر ہو کیونکہ قادیانیوں کی بیشتر کتابیں اردو میں ہیں۔ ہمارے آدمی آپ کے یہاں کے علماء کو قادیانی کتابوں کے حوالوں کا ترجمہ عربی میں نوٹ کرادیں گے۔ اور قادیانیت پر ایسی تیاری کرادیں گے کہ اس کے بعد آپ حضرات کو کسی اور سے مراجع کی حاجت نہیں ہوگی۔ وہ نقشہ آج بھی راقم الحروف کی آنکھوں کے سامنے ہے جب شیخ حسین رخصت ہوتے ہوئے حضرت کی پیشانی اور ریش مبارک کو بوسہ دے رہے تھے ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔ اور وہ بڑے رقت انگیز لہجے میں حضرت سے درخواست کر رہے تھے۔

"یا سیدی! زودنی بما زود سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ بن جبل حین بعثہ الی الیمن"

"اور جواب میں حضرت نے اسی رقت انگیز مگر بزرگانہ لہجہ میں فرمایا:

زودک اللہ التقوی۔ واستودع اللہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم"

بہرحال ان کی درخواست پر حضرتؒ نے جناب مولانا عبدالرحیم اشعر اور رفیق محترم مولانا اللہ وسایا اصلاحی کو قادیانیوں کا ضروری لٹریچر دے کر انڈونیشیا بھیجا' ان حضرات نے وہاں قادیانیوں کو مناظرہ ومباحثہ کی دعوت دی' مگر کوئی مقابلے پر نہیں آیا' وہاں مختلف مقامات پر ان کے بیانات ہوئے جن کا ترجمہ ساتھ کے ساتھ انڈونیشین زبان میں ہوتا رہا۔ وہاں کے ریڈیو پر بھی ان کی تقریریں نشر ہوئیں اور سب سے اہم کام یہ کیا کہ قریباً دو صد حضرات علماء وکلاء اور طلبہ کی ایک بڑی جماعت کو عربی میں قادیانیت سے متعلق مختلف موضوعات پر تیاری کرائی۔ قادیانیوں کی کتابوں کے اصل مآخذ کی نشاندہی پیش کرکے ان کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ اس طرح ایک بڑی جماعت کی رد قادیانیت پر تیاری مکمل کرائی۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

ان دونوں احباب کی میزبانی کے فرائض شیخ حسین الجشی نے ادا کئے۔ مگر سفر کے جملہ مصارف حضرتؒ نے جماعت کی طرف سے برداشت کئے اور قادیانی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بھی انڈونیشیا چھوڑ دیا گیا۔ یہ دو رکنی وفد ۲۶ر ذوالحجہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو کراچی سے روانہ ہوا اور ۲۸ر محرم ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۴ر جنوری ۱۹۷۶ء کو واپس ہوا' ان کی واپسی پر شیخ حسین نے حضرت کی خدمت میں شکریہ کا خط لکھا جس میں ان حضرات کی مساعی کی تفصیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: "ان حضرات کا قیام اگرچہ ایک مہینہ رہا' لیکن ہم نے ان سے ایک سال کا استفادہ کیا"۔

رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے فاضل مبلغ جناب مولانا سید منظور احمد شاہ صاحب کو متحدہ عرب امارات میں کام کرنے کے لئے بھیجا' وہاں رابطہ قائم کرنے کے لئے حضرتؒ نے ابوظہبی میں شئون دینیہ کے سربراہ جناب ڈاکٹر عبدالمنعم النحراور ابوظہبی کے قاضی القضاۃ شیخ احمد بن عبدالعزیز المبارک کے نام عربی میں الگ الگ گرامی نامے تحریر فرمائے۔ نیز ابوظہبی کے پاکستانی حضرات کے نام اردو میں حسب ذیل گرامی نامہ تحریر فرمایا:

> "اس وقت اسلام جن فتنوں سے گھرا ہوا ہے' محتاج بیان نہیں' مسلمان دنیا کے جس خطے میں ہو اسلام کا داعی اور مبلغ ہے' ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اس کا مکلف ہے کہ دینی خدمات انجام دے اور آخرت کی سرخروئی اور قیامت کی جوابدہی حاصل کرے۔

مجلس مرکزی تحفظ ختم نبوت نے اپنی شاخ کے افتتاح کا ارادہ کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ابو ظہبی اور امارات خلیج میں دینی خدمت ہوسکے اس خدمت کے لئے اپنے ایک داعی و مبلغ مولانا منظور احمد شاہ کا تقرر کیا ہے۔

آپ حضرات کے دینی مزاج اور مکارم اخلاق سے مجھے پوری توقع ہے کہ موصوف کی مقدور بھر امداد میں جس طرح بھی ہوسکے دریغ نہیں فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ان دینی خدمات کی توفیق عطا فرمائے"۔

چنانچہ موصوف نے وہاں کے احباب کے توسط سے اکابر علماء اور شیوخ سے رابطہ قائم کیا' انھیں قادیانیت کے مالہ وماعلیہ سے آگاہ کیا' قادیانی لٹریچر سے جو ساتھ لے کر گئے تھے ' قادیانیوں کے مرتدانہ نظریات وعقائد نکال کر دکھائے اور ان کی اسلام کش سرگرمیوں کی تفصیلات بتائیں جس کے نتیجہ میں وہاں کے رئیس القضاۃ شیخ احمد بن عبدالعزیز المبارک نے قادیانیت کے خلاف وہ فیصلہ کیا جو جماعت کی طرف سے "قادیانیوں کا ایک عبرت ناک انجام" کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ مولانا منظور احمد شاہ صاحب نے ۱۹۷۶ء میں متحدہ عرب امارات کے علاوہ کویت اور بحرین کا دورہ بھی کیا اور وہاں مجلس تحفظ ختم نبوت کی شاخیں قائم کیں۔

۱۹۷۵ء میں مولانا مقبول احمد کو ختم نبوت کے داعی کی حیثیت سے انگلینڈ بھیجا۔ موصوف نے وہاں کے نہ صرف پاکستانی حضرات سے رابطہ قائم کیا بلکہ ممالک عربیہ کے طلبہ میں بھی کام کیا۔

۱۹۷۶ء کو "مدرسہ عربیہ اسلامیہ" کے متخصص جناب مولانا اسد اللہ طارق کو فیجی آئرلینڈ کے لئے داعی و مبلغ بنا کر بھیجا' موصوف نے وہاں ایک سال سے زیادہ عرصہ کام کیا' اس کے بعد جرمنی تشریف لے گئے' اور وہاں قادیانیت کا ناطقہ بند کیا۔

۱۹۷۶ء میں مولانا منظور احمد چنیوٹی اور علامہ ڈاکٹر خالد محمود (مقیم برمنگھم) نے افریقی ممالک کا دورہ کیا اس کی روئداد اخبارات و رسائل کے علاوہ الگ بھی شائع ہوچکی ہے۔

مساجد و مراکز کی تعمیر:

سید بنوری قدس سرہ کے سہ سالہ دور امارت میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے تعمیراتی منصوبوں میں بھی حیرت افزا ترقی ہوئی، متعدد مسجدیں تعمیر ہوئیں، جماعتی مراکز کا افتتاح ہوا اور کئی مدارس کھلے ان کی مختصر سی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ محلہ غریب آباد بیرون چوک شہیداں ملتان میں "مسجد الفاروق" تعمیر ہوئی۔

۲۔ کنزی ضلع تھرپارکر (سندھ) میں ایک مسجد تعمیر ہوئی۔

۳۔ جماعت کے زیر اہتمام ربوہ اسٹیشن پر مسجد تعمیر کی گئی، وہاں خطابت کے فرائض جماعت کے مبلغ جناب مولانا خدا بخش صاحب اور تدریس کی خدمات جناب حافظ شبیر احمد صاحب انجام دے رہے ہیں۔

۴۔ جماعت کے موجودہ مرکزی دفتر (واقع تغلق روڈ ملتان) کو حضرتؒ نے جماعت کے وسیع کام اور مستقبل کے منصوبوں کے لئے ناکافی سمجھ کر دفتر کے لئے ایک نیا قطعہ اراضی خریدنے کا حکم فرمایا، جس میں مسجد، لائبریری، اشاعتی مکتبہ، پریس اور دیگر ضروریات کے علاوہ بیرونی ممالک کے مندوبین کے قیام کے انتظامات ہوں، چنانچہ ملتان میں حضوری باغ روڈ پر ایک قطعہ اراضی خرید کیا گیا، حضرت کے بعض مخلصین احباب کی وساطت سے حق تعالیٰ نے اس کی تعمیرات کا انتظام بھی فرمادیا۔ اب یہ جدید مرکز تکمیل کے آخری مراحل میں ہے جو ان شاء اللہ حضرت کے لئے صدقہ جاریہ رہے گا۔

۵۔ ہڈر شفلیڈ (انگلینڈ) میں جماعت کے لئے ایک عمارت حضرت مولانا لال حسین نے اپنے قیام یورپ کے زمانہ میں خرید کی تھی، جماعت کا دفتر بھی اسی عمارت میں تھا، مگر اس کی مکانیت دفتر کی ضروریات کے لئے موزوں نہیں تھی، جناب مولانا مقبول احمد صاحب وہاں تشریف لے گئے تو ان کی توجہ سے وہاں ایک صاحب خیر دوست نے مسجد، مدرسہ اور دفتر کی تعمیر کے لئے ایک قطعہ اراضی وقف کردیا۔

بحمد اللہ اس کی تعمیرات بھی شروع ہیں۔

۶۔ "جابہ" کے احباب کی درخواست پر حضرتؒ نے وہاں ختم نبوت کی طرف سے مسجد تعمیر کرنے کا حکم فرمایا مگر افسوس کہ اس کی تعمیر بھی باقاعدہ شروع نہیں ہوئی تھی کہ حضرتؒ کا وصال ہوگیا۔

۷۔ "مسلم کالونی ربوہ" میں جماعت کے لئے ایک وسیع قطعہ اراضی حاصل کیا گیا وہاں بھی ایک عظیم الشان مسجد' مدرسہ' لائبریری' دفتر' مہمان خانہ وغیرہ کی تعمیر کا منصوبہ ہے کام کا آغاز ہوچکا ہے۔ رئیس المبلغین حضرت مولانا محمد حیات فاتح قادیاں وہاں فروکش ہیں۔

۸۔ اسلام آباد میں جماعت کا دفتر کرائے کی عمارت میں تھا' حضرت کی خواہش تھی کہ وہاں کسی موزوں جگہ پر قطعہ اراضی لے کر مسجد اور دفتر تعمیر کیا جائے' تاہم سردست دفتر کے لئے ایک مناسب عمارت خرید لی گئی۔

۹۔ حضرتؒ کے دور امارت میں ربوہ' ملتان اور جتوئی میں نئے مدارس کا افتتاح ہوا۔

۱۰۔ پاکستان کے بڑے شہروں میں جماعت کے دفاتر کرائے کی عمارت میں ہیں۔ کراچی' لاہور اور حیدر آباد وغیرہ مرکزی شہروں میں دفاتر کی تعمیر کے لئے بھی حضرت فکر مند تھے مگر حضرت کی یہ خواہش تشنہ تکمیل رہی۔

شعبہ نشرواشاعت:

حضرتؒ کے دور میں جماعت کے شعبہ نشرواشاعت کو بھی خاصی ترقی ہوئی' اگر چہ یہ دور ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۶ء کی تحریکات کے ہنگامہ رستاخیز کی بناء پر اشاعتی کاموں کے لئے بڑا حوصلہ شکن تھا' تاہم جماعت نے قریباً دو لاکھ روپیہ اشتہارات اور کتابچوں کے علاوہ نہایت دقیع اور علمی کتابوں کی اشاعت پر خرچ کیا۔ اس کا مختصر سا جائزہ پیش خدمت ہے۔

۱۔ ملت اسلامیہ کا موقف:

دو سو صفحے کی یہ کتاب "مجلس عمل" کے نمائندگان اسمبلی کی جانب سے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے سامنے مسلمانوں کا موقف پیش کرنے کی غرض سے جدید انداز میں مرتب کی گئی، جس میں قادیانیت کی مذہبی سماجی اور سیاسی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا کہ قادیانی کیوں دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ پہلی کتاب تھی جو حضرتؒ کے دور میں شائع ہوئی۔ اس کی تالیف طباعت بھی حضرتؒ کی کرامت تھی۔ دو صد صفحے کی کتاب مگر سننے والوں کو یقین نہیں آئے گا کہ اس کی فراہمی سے لے کر اس کی تجلید تک تالیف، کتابت اور طباعت وغیرہ کے تمام مراحل چھ دن میں طے ہوئے، راولپنڈی میں حضرت نے علماء کا ایک بورڈ مقرر کردیا تھا۔ مولانا محمد حیات اور مولانا عبدالرحیم اشعر مواد فراہم کررہے تھے۔ مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا سمیع الحق اس کی تالیف میں مصروف تھے، اور حضرت المخدوم سید انور حسین نفیس رقم الحسینی اپنے رفقاء سمیت اس کی کتابت میں مصروف تھے، روزانہ جتنا حصہ لکھا جاتا وہ علماء کی مجلس میں سنایا جاتا اور کتابت ہوجاتا .... کتاب کی تالیف وکتابت مکمل ہوئی تو طباعت کا مرحلہ درپیش تھا۔ مشکل یہ تھی کہ پریس پر پابندی عائد تھی اور قادیانیوں کے خلاف کسی چیز کا چھپنا ممنوع تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس مشکل کو بھی آسان فرمادیا۔ اس طرح یہ کتاب مواد کی فراہمی سے لے کر طباعت و تجلید تک چھ دن میں تیار ہوگئی، تمام اراکین اسمبلی میں تقسیم کی گئی اور حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہٗ نے اسمبلی میں حرفاً حرفاً پڑھ کر سنائی۔ حضرت نے اب اس کی دوبارہ طباعت کا حکم فرمایا تھا۔

۲۔ ملت اسلامیہ کا موقف: (عربی ایڈیشن)

بیرون ممالک کی ضروریات کا تقاضا تھا کہ اس کتاب کے عربی اور انگریزی ایڈیشن بھی شائع کئے جائیں چنانچہ حضرتؒ نے اپنے رفیق وخادم جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر کو اس کے عربی ترجمہ کا حکم فرمایا، موصوف نے "موقف الامۃ الاسلامیۃ من القادیانیۃ" کے نام سے اس کا عربی ترجمہ کیا۔ حضرتؒ نے خود اس پر ایک نفیس مقدمہ

لکھا اور افریقی ممالک کے دورہ پر جانے سے پہلے اسے اعلیٰ کاغذ اور عمدہ ٹائپ سے طبع کرایا اور عالم اسلام خصوصاً افریقی ممالک میں اسے تقسیم فرمایا۔

۳۔ ملت اسلامیہ کا موقف: (انگریزی)

اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کے لئے حضرتؒ نے کتاب کے مصنف جناب مولانا محمد تقی عثمانی کو فرمایا۔ بحمد اللہ موصوف نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی کیا' جو دارالعلوم کورنگی سے شائع ہوا۔

۴۔ خاتم النبیین:

یہ حضرتؒ کے شیخ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی آخری تالیف ہے جو مسئلہ ختم نبوت پر انوری علوم و معارف کا گنجینہ ہے۔ اس کی زبان فارسی تھی اور ایک مدت سے اس کے اردو ترجمہ کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی' اس لئے حضرتؒ نے راقم الحروف کو اس کے ترجمہ و تشریح کا حکم فرمایا' بحمد اللہ حضرتؒ کی عنایت و توجہ سے بہت مختصر سے عرصہ میں اس کے ترجمہ و تشریح اور تبویب و تخریج کا کام ہوا۔ پہلے ماہنامہ "بینات" میں بالاقساط شائع ہوچکی تو اسے مستقل شائع کرنے کا حکم فرمایا اور اس پر ایک گرانقدر مقدمہ بھی تحریر فرمایا۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب حضرتؒ کے وصال کے تین دن بعد پریس سے آئی۔

حضرتؒ کے حکم سے رد قادیانیت پر ایسی کئی قدیم اور نایاب کتابیں بھی شائع کی گئیں جن کے لوگ بہت ہی متلاشی تھے' مثلاً

۱۔ رئیس قادیاں مؤلفہ مولانا ابو القاسم دلاوری' مرزا غلام احمد قادیانی کے پوست کندہ حالات اور اس دور کی تاریخ پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔

۲۔ مغلظات مرزا۔ مؤلفہ مولانا نور محمد خان سابق مبلغ مظاہر علوم سہارن پور۔ جس میں مرزا قادیانی کی دشنام طرازی اور فحش گوئی کو بحوالہ ردیف وار جمع کیا گیا ہے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک سنجیدہ آدمی کے لئے بس یہی ایک رسالہ کافی ہے۔

۳۔ ہدیۃ المہدیین۔ مؤلفہ مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ مفتی اعظم پاکستان۔ یہ رسالہ جو حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے شیخ انورؒ کے ایماء و اعانت سے مرتب فرمایا تھا' حضرت مفتی

صاحب کے ایصال ثواب کے لئے شائع کیا گیا اور حضرت نے ایک تحریک کی شکل میں اس کی اشاعت کا حکم فرمایا۔(تفصیلات مجلس تحفظ ختم نبوت تغلق روڈ ملتان سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔)

۴۔ قادیانیوں سے ستر سوالات: مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری

۵۔ اشد العذاب علی مسیلمہ الپنجاب: = = = =

۶۔ مجموعہ رسائل: = = = =

حضرت چاند پوریؒ دور ثانی کے اکابر دیوبند میں سے تھے۔ میدان مناظرہ میں قادیانیوں نے ان کے ہاتھوں بارہا عبرت ناک شکست کھائی' تحریر کے میدان میں قدم رکھا تو ایسے کلّہ شکن رسائل لکھے کہ قادیانی آج تک ان کے جواب نہیں دے سکے۔ جماعت نے ان کے تمام رسائل کو دوبارہ شائع کیا۔

ان کے علاوہ چند نئے رسائل بھی مرتب کرکے شائع کیے گئے۔ مثلاً قادیانیوں کو دعوت اسلام .... ربوہ سے تل ابیب تک .... مراقی نبی .... مرزائی اور تعمیر مسجد؟ .... مرزا کا اقرار .... قادیانیت علامہ اقبال کی نظر میں وغیرہ وغیرہ۔

یہ حضرت بنوریؒ کے دور امارت کا مختصر سا خاکہ ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرتؒ کی برکت سے رد قادیانیت پر کتنا کام ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرتؒ کی قیادت میں جماعت کا ہر شعبہ قلت وسائل کے باوجود بہت ہی فعال ہوگیا تھا اور کام کی نئی نئی صورتیں سامنے آنے لگی تھیں۔ لیکن صد حیف کہ

"روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد"

حضرتؒ کے بعد آپ کے نائب عارف باللہ حضرت مولانا خان محمد سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ مجددیہ (کندیاں) کو "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا قائد اور امیر منتخب کیا گیا۔ حق تعالیٰ موصوف کے انفاس طیبات میں برکت فرمائے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً

(بصائر و عبر۔ رمضان المبارک۔ ۱۳۸۸ھ)

حضرت شیخ رح اکابر کی نظر میں

"شیخ آدم! آج کل تم پر جن علوم و معارف کا القاء ہو رہا ہے ان کو سمجھنے والے بھی دنیا میں اب خال ہی خال لوگ ہیں"۔

"یہ سب حضرت کی نظر عنایت کا فیضان ہے"۔

"نہیں! بلکہ یہ تمہاری علو استعداد کا نتیجہ ہے"۔

"یہ بھی تو حضرت ہی کی نظر کیمیا اثر کا کرشمہ ہے"۔

اپنے جدّ امجد شیخ آدم بنوری اور ان کے مرشد و مربی امام ربانی مجدد الف ثانی (قدس اللہ اسرارہم) کا یہ مکالمہ ہمارے حضرت غالباً "تذکرہ آدمیہ" کے حوالے سے نقل کیا کرتے تھے۔

بلاشبہ کسی شخصیت کی بلندئ مرتبت میں اس کے ذاتی کمالات، فطری ملکات اور خاندانی اوصاف و مآثر کا بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے، جس کی طرف حدیث نبوی: "الناس معادن کمعادن الذهب والفضة" میں اشارہ ہے یعنی انسانوں کی مختلف کانیں ہیں، جس طرح سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان ساری چیزوں کے باوصف جب تک اہل کمال کی صحبت اور ارباب قلوب کی "نظر شفقت" میسر نہ آئے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بقول عارف رومی ؎

بے عنایات حق و خاصان حق
گر ملک باشد سیاہ ہستش ورق

درحقیقت اہل اللہ کی "نظر" ہی وہ کیمیا ہے جو خاک کو اکسیر بنا دیتی اور ثریٰ کو ثریا تک پہنچا دیتی ہے ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

حضرت الشیخ الامام السید البنوری نور اللہ مرقدہٗ کو قدرت نے ذاتی اوصاف وکمالات اور فطری ملکات وخصوصیات سے بھی نوازا تھا' اور بڑی فیاضی وفراوانی سے نوازا تھا' پھر آپ کو اکابر اولیاء اللہ کی صحبت ومعیت اور رفاقت وشفقت کی قابل رشک نعمت بھی میسر آئی' جس نے آپ کی شخصیت کو نکھارا' آپؒ کے سینہ بے کینہ کو مزید جلا بخشی اور آپ کے قلب صافی کو آئینہ جہاں نما بنادیا' یہ آپ پر حق تعالیٰ کا بہت ہی بڑا انعام تھا کہ آپ نوعمری سے پیرانہ سالی تک اپنے دور کے ائمہ مشائخ کے محبوب ومحب رہے' خود فرماتے تھے کہ "الحمد للہ تمام اکابر مجھ سے خوش رہے' اور کبھی کسی بزرگ کو رنجیدہ وکبیدہ نہیں کیا"۔ ذیل کی سطور میں چند اکابر سے آپ کے تعلق کا مختصر تذکرہ مقصود ہے۔

امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ

حضرت شاہ صاحبؒ آپ کے سب سے بڑے شیخ تھے۔ استاذ وتلمیذ کے درمیان گل وبلبل کا رشتہ تھا' عشق ومحبت' عظمت وعقیدت اور فنائیت ومحویت کے الفاظ بھی اس "بے رنگ وبے کیف تعلق" کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی سے قاصر نظر آتے ہیں' حضرات صوفیاء کی اصطلاح میں "نسبت اتحادی" جسے کہتے ہیں شاید وہی آپ کو اپنے شیخ انور سے حاصل تھی' وہی خوبو' وہی طرز وانداز' وہی لب ولہجہ' وہی طور وطریق' وہی رنگ وروپ۔ ع

ناکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اور اسی نسبت نے آپ کو "جانشین انور شاہؒ" بنادیا تھا' چونکہ اس تعلق کو اکثر حضرات نے ذکر کیا ہے اور ان سطور کا راقم بھی متفرق طور پر بعض چیزیں لکھ چکا ہے اس لئے یہاں تبرکاً چند جزئیات پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ خادم خاص اور سفر وحضر کا رفیق وحاشیہ نشین' جسے شیخ "یوسف شاہ" کہہ کر پکارتے تھے' خدمت شیخ کے سلسلہ میں ایسی دقیق نفسیات کی رعایت کرتا تھا کہ عقل حیران ہے۔ فرماتے تھے کہ "بدن دبانا بھی ایک فن ہے' ہر شخص کو اس کا سلیقہ نہیں ہوتا' میں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت کے لئے یہ فن باقاعدہ سیکھا تھا"۔ اور کبھی کبھی فرماتے تھے کہ "الحمد للہ میں نے اپنے سے بہتر خادم کسی کو نہیں

دیکھا"۔ اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی بیان فرماتے تھے کہ حضرت شیخ " ایک مجلس میں تشریف فرما تھے' انہیں درد سر کی شکایت شروع ہوئی میں چہرہ انور سے پہچان گیا' چپکے سے اٹھا اور سر دبانے لگا' مجھے ایک خاص رگ معلوم تھی جس کے دبانے سے اس درد کو افاقہ ہو جاتا تھا۔ حاضرین مجلس کو نہ درد کا احساس ہوا نہ میرے اٹھنے کا سبب معلوم ہوا' میں اکثر حضرت شیخ " کے چہرہ انور سے پہچان لیتا تھا کہ آپ کو فلاں چیز کی ضرورت ہے۔

۲۔ فرماتے تھے کہ سفر کشمیر کے دوران جب حضرت شاہ صاحب" اپنے گھر پر تھے تو میں آپ کے والد ماجد (مولانا معظم شاہ") سے حضرت کے بچپن کے حالات کرید کرید کر معلوم کیا کرتا تھا' وہ میری عقیدت و محبت سے بہت متاثر تھے۔ دستر خوان پر طرح طرح کی چیزیں میرے لئے جمع کرتے تھے اور شفقت کی حد یہ کہ ننھے بچوں کی طرح لقمے بنا بنا کر میرے منہ میں ڈالتے' حضرت شاہ صاحب" اس دلربا منظر کو کن انکھیوں سے دیکھتے (یہاں حضرت بنوری" شیخ " کے دیکھنے کے خاص انداز کی حکایت بھی فرماتے تھے) حضرت کے والد ماجد" مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ "انور شاہ کیسا عالم ہے"؟ اور جب میں حضرت شاہ صاحب" کے بارے میں اپنی رائے ذکر کرتا (لم تر العیون مثلہ ولم یر ھو مثل نفسہ) تو والد ماجد فرماتے کہ "خیر عالم تو اور بھی ہوں گے مگر مجھے تو انور شاہ کی نیکی و پارسائی کی وجہ سے ان سے محبت ہے"۔ اور کبھی فرماتے: "اس باپ کی مسرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کا بیٹا انور شاہ ہو"۔

۳۔ فرماتے تھے کہ اہل علم حضرات حضرت شاہ صاحب" سے کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کرتے کہ آیا کسی نے اس کو ذکر کیا ہے تو فرماتے کہ حنفیہ نے تو کچھ نہیں لکھا' ہاں مالکیہ کچھ لکھ لیتے ہیں (کبھی مالکیہ کے بجائے شافعیہ کا اور کبھی حنابلہ کا ذکر ہوتا) اور کبھی فرماتے "کسی نے کچھ نہیں لکھا' میں نے چارہ کرلیا ہے"۔ اور پھر ایسی تحقیق و تدقیق سے مسئلہ کی تشریح فرماتے کہ گویا بس اسی ایک مسئلہ پر ساری عمر تحقیق فرماتے رہے ہیں۔

۴۔ فرماتے تھے کہ ایک بار حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی " حضرت شاہ صاحب" کی خدمت میں آئے' کتاب ہاتھ میں تھی اور چہرے پر مسرت ایسی کہ گویا بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے' کہنے لگے "حضرت! آج ایک عجیب حوالہ ملا ہے' اسحاق بن راہویہ کے حالات میں لکھا ہے: "کان یروج الاکاذیب لابی حنیفہ" حضرت شاہ صاحب" نے کتاب یوں

دیکھی (دیکھنے کا انداز بھی حضرت بنوریؒ نقل فرمایا کرتے تھے) اور فرمایا:

"مولوی صاحب! امام اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ تو امام بخاریؒ کے استاذ ہیں۔ اب اگر یہ عبارت اپنے ظاہر پر محمول ہو تو صحیح بخاری کی روایات کی حیثیت کیا ہوگی؟"

یہ سننا تھا کہ حضرت مولانا عثمانیؒ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ان کی پریشانی دیکھی تو فرمایا:

"دراصل جس شخصیت سے آدمی کو عقیدت نہیں ہوتی اس کے بارے میں روایات کی تحقیق و تفتیش نہیں کیا کرتا' یہی مطلب ہے اس عبارت کا کہ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں جو باتیں ان کے سامنے نقل کی جاتی تھیں وہ ان کی تحقیق و تفتیش نہیں فرماتے تھے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط؟ نہ ان پر کوئی تبصرہ فرماتے تھے بلکہ ان کو چلتا کردیتے تھے' یہ مطلب نہیں کہ وہ از خود جھوٹی روایتیں روایت کرتے تھے"۔

۵۔ آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں آپ کا ایک خواب نقل کرتا ہوں' فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خواب میں زیارت ہوئی' سر جھکائے تشریف فرما ہیں' گرد و پیش کچھ برتن سے پڑے ہیں' میں نے سلام ودعا کے بعد عرض کیا کہ "آپ کی ان چیزوں کا وارث کوئی اور ہوگا مگر آپ کے علوم وانفاس کا وارث میں ہوں"۔ میں جوش کے ساتھ بار بار اسی فقرے کو دہرارہا ہوں' حضرت شاہ صاحبؒ نظریں اوپر نہیں اٹھاتے آخر میں یہ فرمایا "میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا"۔ حضرت بنوریؒ کے ذریعہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم ومعارف کی جتنی اشاعت ہوئی وہ سب کو معلوم ہے' اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ "انور شاہؒ کی لسان" تھے۔

حضرت مولانا محمد شفیع الدین نگینوی مہاجر مکیؒ

حضرت بنوریؒ نے جب ۱۳۵۷ھ میں (سفر مصر پر جاتے ہوئے) پہلی بار

حرمین شریفین کی حاضری دی تو مکہ مکرمہ (زادھا اللہ شرفاً و کرامۃً) میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ رشید حضرت مولانا محمد شفیع الدین نگینوی ثم مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت نگینویؒ کے حالات اس ناکارہ کو زیادہ معلوم نہیں' نہ یہی علم ہو سکا کہ ہمارے حضرتؒ ان کی خدمت میں کتنا عرصہ رہے' البتہ بیعت و خلافت کا واقعہ حضرتؒ سے خود سنا تھا۔

یہاں اس لطیفہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ "دیوبند" کے مورث اعلیٰ دو بزرگ ہیں' ایک علم حدیث میں اور دوسرے طریقت و سلوک میں' چنانچہ علمائے دیوبند کا علمی رشتہ حضرت شاہ عبد الغنی مجددی ثم مدنیؒ سے وابستہ ہے' حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی ان کے بلاواسطہ شاگرد رشید ہیں' حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ ثم مدنی کو ان سے بالواسطہ تلمذ اور بلا واسطہ اجازت حدیث حاصل ہے۔ "دیوبند" کا سلسلۂ طریقت قطب العالم سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے پیوستہ ہے' دور اول اور دور دوم کے سارے اکابر دیوبند حضرت حاجی صاحبؒ کے خلفاء و مسترشدین ہیں۔

حضرت بنوریؒ زمانہ کے لحاظ سے تو اکابر دیوبند کے طبقہ چہارم میں آتے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہیں حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے صرف ایک واسطہ سے اجازت حدیث حاصل ہے (عن المحدثۃ امۃ اللہ بنت الشاہ عبدالغنی عن ابیھا) اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی صرف ایک واسطہ سے اجازت و خلافت طریقت حاصل ہے۔ (یعنی آپ کو حضرت نگینوی سے اور انہیں حضرت حاجی صاحبؒ سے نیز آپ کو حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے اور انہیں حضرت حاجی صاحب سے) حضرات محدثین کی اصطلاح کے مطابق "علو اسناد" کا یہ شرف اس زمانے کے بہت کم حضرات کو حاصل ہوگا۔

حضرت بنوریؒ اگرچہ شیخ طریقت تھے' مگر آپ نے "افادہ و اصلاح" کے لئے "پیری مریدی" کا طریق نہیں اپنایا' جب بھی کسی نے آپ سے "بیعت" کی درخواست کی اسے دوسرے اکابر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ خود بہت کم لوگوں کو بیعت فرمایا' آپ ایسا کیوں کرتے تھے؟ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ہر شخص اس کی الگ توجیہ کر سکتا ہے' اس ناکارہ کے نزدیک تو وہی قصہ ہے جو کسی پہلے بزرگ نے فرمایا تھا:

"اگر من شیخی کردم در جہاں ہیچ مریدے نگذاشتم، اما مارا برائے کارے دیگر آفریدہ اند"

بہرحال حاجی صاحبؒ کے خلیفہ کا آپ کو نوعمری میں خلافت سے سرفراز کرنا آپ کے حق میں اکابر کی نظر شفقت کی بہت وقیع شہادت ہے۔

شیخ محمد زاہد الکوثری

مصر میں جن اکابر علماء سے آپ نے استفادہ کیا ان میں سب سے نمایاں شخصیت خلافت عثمانیہ کے نائب شیخ الاسلام محمد زاہد الکوثری کی تھی جو امام العصر محمد انور شاہ کشمیریؒ کی طرح اپنے دور کے فاضل ترین علامہ تھے۔ حضرتؒ نے تقریباً ایک برس تک ان سے استفادہ کیا۔ اور انہیں حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد اکبر المشائخ سمجھتے تھے، شیخ الکوثری کو بھی آپ سے بہت تعلق تھا، بحمد اللہ اہم علمی مسائل پر دونوں میں خط و کتابت محفوظ ہے، جو ان شاء اللہ کسی وقت شائع ہوگی۔ شیخ کوثریؒ کا ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوا، ان دنوں حضرت ٹنڈو الہ یار میں شیخ التفسیر تھے، وہاں ایک تعزیتی جلسہ میں شیخ کوثریؒ کے کمالات بیان فرمائے، فبکیٰ وابکیٰ۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے آپ کا سب سے پہلا تعارف غالباً اس وقت ہوا جب آپ نے ۱۳۵۳ھ میں مسائل قبلہ پر ایک رسالہ تالیف فرمایا اور اس کا ادیبانہ نام **قبلۃ المجلی فی قبلۃ المصلی** تجویز کیا، یہ رسالہ دیگر حضرات کے علاوہ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ نام تو بہت اچھا ہے مگر عام فہم نہیں اور پھر "**بغیۃ الاریب فی مسائل القبلہ والمحاریب**" نام تجویز فرمایا۔ پھر جب آپ ۱۳۵۷ھ میں طباعت کتب کی غرض سے مصر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے اکابر کے کمالات کا تذکرہ کیا تو شیخ محمد زاہد الکوثریؒ نے حضرت حکیم الامتؒ سے حدیث کی اجازت حاصل کرنے کے لئے آپ کو وسیلہ بنایا۔ مصر سے واپسی پر آپ نے حضرت کی خدمت میں حاضری کے لئے عریضہ لکھا، حضرتؒ نے ضابطے کا جواب لکھ دیا کہ کیوں آنا چاہتے ہو؟ کتنے دن کا قیام رہے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس پر آپ نے حضرت

حکیم الامت کو ایک طویل خط عربی میں لکھا۔ فرماتے تھے کہ خط تو لکھ دیا مگر بعد میں خیال ہوا کہ حضرت حکیم الامتؒ کی جانب سے عتاب نامہ آئے گا کیونکہ اول تو حضرت حکیم الامتؒ کو عربی میں خط لکھا جاتا تو اس پر عتاب فرماتے تھے کہ اس کا منشا کبر ہے' اپنی علامیت کا اظہار مقصود ہے' دوسرے خط کافی لمبا تھا اور اس میں اشعار بھی تھے۔ اس پر بھی اندیشۂ عتاب تھا' لیکن حضرت حکیم الامتؒ کا کرامت نامہ بالکل خلاف توقع یہ آیا:

ع "بیابیا فرود آ" کہ خانہ خانہ تست۔ اور اگر تشریف آوری سے پہلے آنے کے دن اور وقت کی اطلاع کردی جائے تو احسان ہوگا"۔

چنانچہ حسب الارشاد وقت کی اطلاع کر کے تھانہ بھون پہنچا' اسٹیشن پر مولانا شبیر علی ایک اور رفیق کے ہمراہ موجود تھے' حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی' حضرتؒ نے خصوصی شفقتوں سے نوازا' اور جب واپسی کے لئے مصافحہ کیا تو حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا: "بنوری کی وجہ تسمیہ؟" عرض کیا "ہمارے جد امجد شیخ آدم بنوریؒ کی طرف نسبت ہے"۔ فرمایا: اچھا! پھر تو آپ ہمارے مخدوم زادہ ہیں"۔

اس کے بعد حضرت حکیم الامتؒ سے آپ کا مستقل تعلق ان کی حیات طیبہ کے آخر تک رہا' ایک خط میں حضرت حکیم الامتؒ نے آپ کو تحریر فرمایا:

"منبع اخلاص ومحبت ومعدن اختصاص ومودت۔ وقاہ اللّٰہ لما یتمنی ویرضاہ"۔

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:

"خدا نہ کرے مرحوم اپنے کو محروم کیوں سمجھے"۔

حضرت حکیم الامتؒ کا آخری گرامی نامہ جو آپ کے کاغذات میں محفوظ ہے اور جس پر آپ نے اپنے قلم سے "تقریباً ۲۰ر شوال ۱۳۶۱ھ" لکھا ہے' اس میں حضرت حکیم الامتؒ نے آپ کو مجاز صحبت ہونے کا شرف عطا فرمایا' اس کا متن تبرکاً درج ذیل ہے:

"السلام علیکم۔ حسب معمول قدیم اس وقت بھی بعض احباب کو میں نے اس خدمت کے لئے منتخب کیا ہے کہ وہ شائقان دین کو اپنے معمولات سے دینی نفع پہنچاویں۔ اور ایسی جماعت کا لقب "مجاز صحبت"

رکھا گیا ہے۔ میں نے آپ کو بھی توکلا" اس سلسلہ کے لئے تجویز کیا ہے، امید ہے کہ ایسے طالبین کی طرف توجہ رکھیں (گے) اللہ تعالیٰ مدد فرماوے"۔ اشرف علی

مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندیؒ

حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ میں تھے۔ حضرت بنوری کو بھی آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرتؒ ان کی شفقت و محبت کے بڑے دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے فرماتے تھے کہ ان سے تعارف کی تقریب یہ ہوئی کہ میں شروع شروع میں جب دیوبند گیا تو میں نے امام غزالیؒ کی "تہافۃ الفلاسفہ" کا نام سنا(اس کے ساتھ اور کتاب غالباً ابن رشد کی "تہافۃ التہافۃ" کا بھی فرماتے تھے) مولانا مفتی محمد شفیعؒ دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے اور ان کی کتابوں کی بھی دکان تھی۔ میں نے ان سے ان کتابوں کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ موجود تو نہیں، بمبئی سے منگوادیں گے، میں نے پوچھا کب تک آجائیں گی۔ انہوں نے بمبئی لکھ دیا۔ میں مقررہ تاریخ کو ان کے کتب خانے پہنچا تو کتابیں آچکی تھیں۔ اتفاق سے مولانا سید اصغر حسین بھی وہاں تشریف فرما تھے، کتابوں کا پیکٹ کھولا گیا، تو میاں صاحب(مولانا اصغر حسین) کچھ حیران سے ہوئے، مجھ سے فرمایا: "ان کتابوں کو کون پڑھے گا؟" میں نے عرض کیا " میں پڑھوں گا" فرمایا"تم سمجھ لو گے" عرض کیا "سمجھنے کے لئے تو منگوائیں ہیں"

یہ حضرت میاں صاحب سے پہلا تعارف تھا۔ حضرت بنوری کی شرافت و نجابت تو چہرہ مہرہ سے عیاں تھی، غالباً اکابر دیوبند کو بھی یہ معلوم تھا کہ آپ حضرت مخدوم شیخ آدم بنوریؒ کی اولاد سے ہیں اور علمی اشتیاق ان کتابوں کے منگوانے سے ظاہر ہوا ہے اس لئے حضرت میاں صاحبؒ آپ پر بہت ہی شفقت فرمانے لگے۔

حضرت فرماتے تھے کہ ایک بار حضرت میاں صاحبؒ میرے حجرے کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ میں جھپک کر آگے بڑھا، اور عرض کیا "آیئے چائے نوش فرمایئے"۔ حضرت میاں صاحب نے فرمایا "نہیں، آپ تو مہمان ہیں، ہمارا حق ہے کہ آپ کو چائے

پلائیں" اب وہ انکار فرمارہے ہیں' اور میں بے تکلفی سے انکا ہاتھ پکڑ کر اپنے حجرے کی طرف کھینچ رہا ہوں۔ تاہم میرے اصرار کے باوجود حضرت میاں صاحب تشریف نہیں لائے۔

دوسرے وقت حضرت میاں صاحبؒ کا خادم یہ پیغام لے کر آیا کہ تم افغانی لوگ گوشت کی پہچان اچھی رکھتے ہو' اس خادم کو اچھا گوشت خرید کر دینا اور دوپہر کا کھانا ہمارے یہاں کھانا۔ میں نے گوشت خرید دیا اور دوپہر کو حضرت میاں صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی مہمان نظر نہ آیا تو حضرت میاں صاحب سے دریافت کیا "مہمان کہاں ہیں؟" فرمایا "بس آپ ہی مہمان ہیں" بہرحال کھانا ہوا' اس کے بعد حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا' زندگی میں دو مرتبہ باوضو اپنے ہاتھ سے چاول پکائے ہیں' ایک مرتبہ حضرت حاجی (امداد اللہ مہاجر مکی) صاحبؒ کے لئے' اور دوسری مرتبہ آج آپ کے لئے"۔

حضرت کے دورۂ حدیث کا سال تھا کہ دیوبند میں اختلافات رونما ہوئے اور حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے ڈابھیل کا قصد فرمالیا۔ حضرت بنوریؒ فرماتے تھے کہ میں بھی حضرت کے ساتھ جانے کا عزم رکھتا تھا۔ حضرت میاں صاحبؒ کو پتہ لگا تو انہوں نے مجھے بلایا اور بڑی شفقت سے فرمایا "تم نہ جاؤ تمہیں میں حدیث پڑھاؤں گا" لیکن میں شاہ صاحبؒ پر مرمٹ چکا تھا' میں نے ان سے بے تکلفی سے کہا کیا میں آپ سے حدیث پڑھنے دیوبند آیا ہوں؟ میں تو حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھنے آیا ہوں"۔ میاں صاحب میرے اس بے تکلف جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا "اچھا' اچھا"

فراغت کے بعد میں بھی حضرت میاں صاحب سے آپ کا خصوصی تعلق رہا۔

حضرت میاں صاحب کے متعدد گرامی نامے آپ کے کاغذات میں محفوظ ہیں۔ جب بغیۃ الاریب فی مسائل القبلہ والمحاریب" تالیف فرمائی تو اس پر حضرت میاں صاحبؒ نے بھی تقریظ لکھی جو کتاب کے ساتھ چھپ چکی ہے اور میاں صاحب کی اصل تحریر بھی محفوظ ہے۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ

دیوبند کے صدر مفتی' عارف باللہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ اکابر اولیاء

اللہ میں تھے آپ سے حضرت بنوریؒ نے جلالین شریف پڑھی تھی فرماتے تھے کہ جب حضرت مفتیؒ کا وصال ہوا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

"ہماری جماعت میں جو سب سے افضل عند اللہ تھے چل بسے"۔

(حضرت بنوری حضرت شاہ صاحبؒ کے لب ولہجہ میں یہ فقرہ سنایا کرتے تھے)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے بھی آپ کو غایت درجہ اخلاص وارادت تھی، حضرت مولانا محمد شفیع الدین نگینویؒ نے حکم فرمایا تھا کہ ہندوستان میں حضرت حکیم الامتؒ اور حضرت مدنیؒ دونوں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھنا، اس لئے آپ نے مصر سے واپسی پر حضرت مدنیؒ کی خدمت میں استفادہ کے لئے عریضہ لکھا، حضرت نے آپ کو حضرت حکیم الامتؒ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر آپؒ نے یکے بعد دیگرے دو عریضے پھر لکھے، ان کے جواب میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے تحریر فرمایا:

"..... میرا عرض کرنا صرف اس وجہ سے تھا کہ .... حضرت تھانویؒ مدظلہم کا عظیم الشان مرتبہ تصوف اور علوم میں معلوم ہے، ان کی موجودگی میں ہم جیسے "ہنبونجیوں" کی طرف رجوع کرنا سخت غیر موزوں امر ہے، آپ جب کہ مولانا کی بارگاہ میں رسوخ رکھتے ہیں تو کیوں نہ وہاں سے ہی اغتراف فرمائیں۔

بہرحال اگر جناب کو مجھ نالائق اور ننگ اسلاف کے ساتھ حسن ظن ہے، اگرچہ وہ غیر واقعی ہی ہے میں اپنی استطاعت اور لنگڑی قابلیت کے ساتھ خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

(۳۰ شعبان ۱۳۵۹ھ)

حضرت بنوریؒ اگرچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے بھی اکتساب فیض کرتے رہے، اور آخر میں ان کی جانب سے "مجاز صحبت" بھی ہوئے، مگر اوراد واشغال اور معمولات

حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کی ہدایات کے مطابق ہی بجالاتے رہے۔

حضرت بنوریؒ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے، معمول تھا کہ ڈابھیل کے سالانہ امتحانات سے جلدی فارغ ہو کر دیوبند آجاتے اور کئی کئی دن تک حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ حضرت مدنیؒ بھی آپ کا بہت اکرام کرتے، کبھی آپ درس بخاری کے دوران پہنچ جاتے تو اپنی مسند کے پاس بٹھاتے، تقسیم ملک کے بعد جب حضرت بنوریؒ ڈابھیل سے پاکستان تشریف لے آئے تو خط وکتابت کے ذریعہ حضرت مدنیؒ سے استفادہ کرتے رہے جن دنوں آپ ٹنڈو الہ یار میں تھے حضرت مدنی کی خدمت میں اجازت حدیث کے لئے خط لکھا حضرت مدنیؒ پر تواضع کا بے حد غلبہ تھا۔ انہوں نے جواب نہ دیا بلکہ خاموشی کے ذریعہ اس درخواست کو ٹال دینا چاہا، آپ نے دوبارہ لکھا تو حضرت مدنیؒ نے جواباً تحریر فرمایا:

کس نیاید بزیر سایہ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف والا نامہ مورخہ ۱۰ ربیع الاول (۱۳۷۰ھ) باعث سرفرازی ہوا یاد آوری اور عزت افزائی کا شکر گذار ہوں، مندرجہ مضامین سے مطلع ہوا، جناب کا والا نامہ رمضان شریف میں بہ طلب اجازت وارد ہوا تھا مگر چونکہ یہ حکم نامہ فی غیر موقعہ تھا (کیوں کہ میں حقیقت میں ننگ اسلاف اور بدنام کنندہ نکونامے چند ہوں اور یہ کلمات تصنعاً نہیں ہیں بلکہ واقعہ یہی ہے اور بفضلہ تعالیٰ آپ کو مرحومین ذوی الفضائل والکمالات العالیہ سے شرف لقاء وتلمذ حاصل ہے اور خود بھی جامع کمالات ہیں) اس لئے جواب نہ دینا صواب سمجھا۔ امید قوی تھی کہ آپ حقیقت پر غور فرماکر ایسی غلط طلب سے چشم پوشی فرمائیں گے اور جو کچھ عطایا خداوندی آپ کے پاس درجہائے عالیہ رکھنے والی ہیں انہیں پر قناعت کریں گے، مگر آپ نے مضمون لا یشبعان الحدیث پر عمل کیا، اور اپنے حکم کے امتثال کا پھر مطالبہ فرمایا، اس لئے منسلکہ ورق پر جلدی میں کچھ

لکھ دیا ہے۔ گر قبول افتدز ہے عز و شرف۔

میرے محترم! شہرت غیر واقعیہ سے دھوکا نہ کھانا چاہئے تھا۔ انما کبرئی موت الکبراء۔ اگر وہ اکابرین زندہ ہوتے تو ہمارے جیسے پچوڑوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں چہ جائیکہ یہ درجہ دیا جائے' یہ صرف آپ کا حسن ظن ہے شاید یہی مجھ جیسے بے بضاعت بلکہ بدبضاعت کے لئے کفارۂ سیئات اور مخلصی کا ذریعہ بن جائے..."

(۱۸ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ)

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ

حضرت بنوریؒ کو حضرت عثمانیؒ سے بھی تلمذ تھا' اور ہمیشہ ان کا نام نامی بڑے احترام وعقیدت سے لیتے تھے "معارف السنن" اور دیگر تصنیفات میں انہیں "ہمارے شیخ محقق العصر" کے الفاظ سے یاد فرماتے ہیں۔ مصر تشریف لے گئے تو وہاں شیخ محمد زاہد الکوثریؒ کی خدمت میں حضرت عثمانیؒ کی طرف سے "فتح الملہم" کی دو جلدیں ہدیہ کیں۔ اور حضرت عثمانیؒ کا تفصیلی تذکرہ ان سے کیا' شیخ الکوثریؒ نے اس پر بڑی پر مغز تقریظ لکھ کر دی اور حضرت عثمانیؒ کو شکریہ کا خط بھی لکھا۔ جو "انوار عثمانیؒ" (ص۸۱و۸۲و۸۳) میں طبع ہوچکا ہے۔ حضرت عثمانیؒ کو آپ کے طالب علمی کے زمانے ہی سے آپ سے گہرا قلبی تعلق تھا' گزشتہ صفحات میں آپ حضرت عثمانیؒ کی تحریر فرمودہ "سند اجازت" پڑھ چکے ہیں' جس میں وہ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں: **وھو فی ما اری -- ولا ازکی علی اللہ احدا-- صالح' راشد' مسترشد' مستقیم السیرۃ' جید الفھم' ذومناسبۃ قویۃ بالعلوم' مستعد لتدریسھا"** --- اور اس سے قبل تحریر فرماتے ہیں: **"فجد واجتھد فی اکتساب علم السنۃ والقرآن' وبرع فیہ وفاق اقرانہ ماشاء اللہ۔"** چونکہ آپ نے مدت تک حضرت عثمانیؒ کی معیت میں کام کیا اس لئے دونوں کے درمیان بڑا گہرا تعلق رہا اور حضرت عثمانیؒ آپ سے ایسا معاملہ فرماتے تھے جو ایک مخلص رفیق اور ہم عصر دوست سے کیا جاتا ہے۔ حضرت بنوریؒ مصر کے طویل سفر سے واپس ہوئے' حضرت عثمانیؒ کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔ اس کے جواب میں حضرت عثمانی نے تحریر فرمایا:

بخدمت برادرم محترم! دامت مکارمہم بعد سلام مسنون آنکہ محبت نامہ پہنچا، مسرور کیا، مع الخیر مراجعت وطن پر مبارکباد دیتا ہوں، مدت سے ملاقات کا شوق ہے خیر یوسف مصر سے ہندوستان تو آیا، گجرات بھی ان شاء اللہ پہنچ جائے گا۔ ہم کو آپ کی باتیں سننے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا آپ کو سنانے کا، مگر خدا جانے کب ہمارا نمبر آئے...“

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

...”مجھے جو قلبی تعلق آپ کے ساتھ ہے وہ خود آپ کو معلوم ہے، مجھے بہت سی علمی توقعات آپ کی ذات سے ہیں... سنن ابی داؤد کے درس سے میری تمنا پوری ہوئی۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ اس درجہ کا کوئی سبق آپ کے ہاں ہو، الحمد للہ آپ کا درس مقبول ہے“۔

(۱۳ر ذوالحجہ ۱۳۵۸ھ)

ایک اور خط میں ۲۱ر ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ کو دیوبند سے لکھتے ہیں:

”بے شک آپ کے کئی خطوط مجھے ملے، جواب میں حسب عادت تاخیر ہوئی، دارالعلوم کے معاملات اور اکثر امراض کا تسلسل مانع ہوا، آپ برا نہ مانیں آپ کی محبت قلب میں جاگزیں ہے، اور ایسے دوستوں کا تعلق مایہ فخر سمجھتا ہوں...“

ان چند اقتباسات سے دونوں حضرات کے قلبی تعلق اور باہمی الفت و محبت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ حضرت عثمانی مدت تک ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ رہے لیکن آخر میں مصروفیات و عوارض کی بناء پر ڈابھیل کے بجائے مستقل طور پر دیوبند میں قیام رہا۔ اور تقسیم کے بعد پاکستان میں تشریف لے آئے۔ آپ کے بعد ڈابھیل میں آپ کے جانشین بھی حضرت بنوری تھے، چنانچہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ”الحمد للہ کہ مجھے اپنے دونوں مشائخ (حضرت شاہ صاحب اور حضرت عثمانی) کی جانشینی کی سعادت نصیب ہوئی“۔

حضرت بنوریؒ کو پاکستان بلوانے کے محرک بھی حضرت عثمانی ہوئے۔ حضرت عثمانی آپ کو پاکستان کے نائب سفیر کی حیثیت سے عرب ممالک میں بھجوانا چاہتے تھے، مگر آپ اپنے مخصوص مزاج کی بناء پر کسی سرکاری عہدے کو پسند نہیں فرماتے تھے، اس لئے عذر کردیا۔

حضرت عثمانیؒ اور حضرت مدنیؒ کا سیاسی اختلاف شہرۂ آفاق ہے جس کی شدت نے

ع "چوں گل بسیار شد پیلاں بلغزند"

کا سماں پیدا کردیا تھا۔ سوء ظن تو معمولی بات تھی' بہت سے لوگوں نے سوء ادب کے مرتکب ہوکر اپنی عاقبت برباد کی۔ لیکن یہ حضرت بنوریؒ کی سعادت' سلامتی فطرت اور عالی ظرفی تھی کہ اس طوفان میں بھی ان کے پائے استقامت کو لغزش نہیں آئی' وہ ایک طرف شیخ مدنیؒ کے عاشق و محب رہے اور دوسری طرف حضرت عثمانیؒ کے محبوب و مقرب ...... وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

حضرت کو شاہ جی سے بھی بے حد اخلاص و عقیدت کا تعلق تھا۔ انجمن خدام الدین کے جس اجلاس میں "شاہ جی" کو امیر شریعت کا خطاب عطا کیا گیا' اور ان کے ہاتھ پر علماء نے بیعت کی حضرت اس اجلاس میں شریک تھے' فرماتے تھے کہ چوتھے نمبر پر بیعت کرنے والا میں تھا۔ حضرت امیر شریعت کے بہت سے لطائف سنایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ سرحد میں ایک جلسہ تھا' جس کے سامعین بیشتر ہندو' سکھ تھے.... حضرت امیر شریعت نے تقریر فرمائی غیر مسلموں سے۔ فرمایا کہ جس ذات کو تم اپنی زبان میں پرمیشور' گرو وغیرہ کہتے ہو اسی کو ہم "اللہ" کہتے ہیں۔ بتاؤ اس ذات سے کوئی اور بڑا ہو سکتا ہے؟ سب کا جواب تھا کہ وہی سب سے بڑا ہے۔ فرمایا "اللہ اکبر" کے یہی معنی ہیں' سب سے اللہ اکبر کے نعرے لگوائے' اس کے بعد توحید پر اڑھائی گھنٹے تقریر فرمائی' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بھی اس جلسہ میں موجود تھے وہ "شاہ جی" کی تقریر میں زار وقطار رو رہے تھے' تقریر ختم ہوئی تو حضرت عثمانی نے فرمایا: "آج عطاء اللہ نے تبلیغ کا حق ادا کردیا"۔

ایک بار حضرت ملتان تشریف لے گئے۔ حضرت امیر شریعت علیل تھے۔ عیادت کے لئے ان کے در دولت پر حاضر ہوئے' دستک دی' حضرت امیر شریعت خود باہر تشریف لائے' آپ سامنے کھڑے ہیں مگر "شاہ جی" پوچھتے ہیں کون؟ آپ نے سمجھا کہ شاید نقاہت کی وجہ سے پہچان میں فرق آگیا اس لئے عرض کیا: "محمد یوسف بنوری"۔ شاہ جی نے پھر پوچھا کون؟ آپ سمجھے کہ شاید مرض کی وجہ سے سماعت میں بھی فرق آگیا ہے اس لئے ذرا بلند آواز سے کہا: "محمد یوسف بنوری"۔ فرمایا "نہیں! نہیں!! بلکہ انور شاہ"۔ یہ

کہہ کر آپ سے لپٹ گئے۔

ایک بار راقم الحروف نے منشی عبدالرحمٰن خان چہلیک (ملتان) کی کتاب "کردار قائد اعظم" سے حضرت امیر شریعت کی اس تقریر کا جو اردو پارک دہلی میں ۲۶ر اپریل ۱۹۴۶ء کو پانچ لاکھ کے اجتماع میں کی گئی تھی' اور جس میں پاکستان کا نقشہ کھینچا گیا تھا ایک اقتباس حضرت کو پڑھ کر سنایا حضرت سن کر آبدیدہ ہو گئے' اور فرمایا "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید"

حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجیؒ

حضرت مولانا حماد اللہؒ سلسلہ قادریہ کے بلند پایہ شیخ اور حضرت مولانا تاج محمود امروٹی کے خلیفہ وجانشین تھے پاکستان تشریف لانے کے بعد حضرت بنوری کو ان سے بھی ارادت وعقیدت کا غیر معمولی تعلق رہا' متعدد مرتبہ "ہالے جی" تشریف لے گئے اور حضرت ہالیجویؒ کے فیوض وانفاس سے مستفید ہوتے رہے' حضرت نے ان کے کچھ افادات بھی عربی میں قلبند فرمائے تھے جو ماہنامہ "بینات" (شعبان ورمضان ۱۳۹۰ھ) میں اس ناکارہ کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں حضرت نے انکی ایک مختصر سی تمہید بھی تحریر فرمائی تھی جو قابل دید ہے۔

حضرت مولانا حماد اللہ رحمہ اللہ نے ایک لغات القرآن بھی مرتب فرمائی' جو ۱۳۹۳ھ میں مولانا محمد امین اللہ (مہتمم مدرسہ مدینۃ العلوم حمادیہ۔ پنو عاقل) کے اہتمام سے طبع ہوئی' حضرت نے اس کی طباعت میں خصوصی اعانت فرمائی' اس کا نام "الیاقوت والمرجان فی شرح لغات القرآن" خود تجویز فرمایا' اور اس پر "سلک العقیان لنظم الیاقوت والمرجان" کے عنوان سے ایک وقیع مقدمہ رقم فرمایا۔ مصنفؒ کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

> "کان رحمہ اللہ عالما' عابدا' زاہدا' حلیما' وقورا ابعد الناس عن الریاء' وازہد خلق اللہ فی من رایتہ من اہل الفضل والصلاح' واعلم خلق اللہ فی اہل البیعتہ والارشاد' وکان ذا کشف صحیح وصریح ....." الخ

حضرت مولانا سید عزیز گل مدظلہ العالی (سخاکوٹ)

حضرت مولانا سید عزیز گل مدظلہ العالی سے حضرت کا تعلق متعدد وجوہ سے تھا:

اولاً: آپ حضرت کے شیخ الشیخ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے خادم خاص رازدار' رفیق اسارت اور محبوب عزیز ہیں اور آج روئے زمین پر کوئی شخص اس شرف وفضیلت میں ان کا ہمسر نہیں' ثانیاً: آپ حضرت کے شیخ' حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ کے بھی رفیق وہمدم ہیں' حضرت مدنیؒ کو آپ سے جو تعلق تھا اور آپ نے اسارت مالٹا کے زمانہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی جس طرح خدمت کی ہے وہ حضرت مدنی کی خود نوشت "نقش حیات" اور "اسیر مالٹا" سے واضح ہے۔ ثالثاً: آپ حضرت مولانا سید عبدالحق نافع رحمہ اللہ کے برادر اکبر ہیں اور حضرت بنوری کا جو تعلق مولانا نافع سے تھا وہ خود حضرت کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

> "مرحوم سے میرا تعلق تقریباً نصف صدی رہا۔ تحابب وتوادد کی اس منزل پر ہم پہنچے جس کی نظیر کم ملے گی۔ میں نے اپنے معاصرین اور حلقہ احباب اور اساتذہ میں (باستثناء بعض حضرات) ذکاوۃ طبع' دقت نظر' حسن ذوق' جامعیت مزاج میں ان کی نظیر نہیں دیکھی' میرے والد محترم حضرت مولانا سید محمد زکریا صاحب مدظلہم ودامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ مشکل سے مشکل مسائل کو آسان اور سادہ تعبیر میں حل کرنے والا عالم ان جیسا نہیں دیکھا"۔ ("بصائر وعبر" محرم الحرام ۱۳۹۴)

ان تین وجوہ کے علاوہ حضرت مولانا عزیز گل مدظلہ کی ذاتی سیادت' وشہامت بھی وجہ کشش تھی جس کی بناء پر وہ حضرت شیخ الہند سے آج تک ہمارے سارے اکابر کی آنکھ کا تارا رہے۔ حضرت آپ کا بہت اکرام فرماتے تھے اور آپ کو اپنے اکابر کی صف اول میں شمار کرتے تھے۔ چند سال قبل جب آپ حضرت کے اصرار پر نیو ٹاؤن تشریف لائے تو حضرت پرمسرت وانبساط کی ایسی کیفیت طاری تھی کہ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھی' نہ بعد میں۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا مدظلہ

حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص اور جانشین حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، سہارن پوری ثم مدنی سے بھی حضرت کو بڑی عقیدت تھی اور انہیں اپنے تمام اکابر کا پھول سمجھتے تھے، آخری چند سالوں میں تو یہ تعلق عارف رومی کے اس شعر کا مصداق تھا:

خود قوی ترمی شود خمر کہن
خاصہ آن خمرے کہ باشد من لدن

حضرت شیخ مدظلہ کے بارے میں بہت بلند وبالا الفاظ فرماتے تھے، کبھی "ریحانۃ العصر" کبھی "برکۃ العصر" اور کبھی "زینۃ ہذہ الدھور" ...... حضرت شیخ مدظلہ العالی کی متعدد تصنیفات پر گرانقدر مقدمے تحریر فرمائے جن میں شیخ مدظلہ کا مقام بھی کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً بیان فرمایا سب سے مختصر مگر جامع الفاظ **"الاستاذ المودودی وشیئی من حیاتہ وافکارہ"** کے ابتدائیہ کے ہیں:

"فتنبہ لمثل ھذہ الدعاوی العریضۃ افذاذ من الاکابر ... فمن ھولاء الاکابر حضرۃ المحدث برکۃ العصر الشیخ محمد زکریا الکاندھلوی الصدیقی، صاحب العکوف علی خدمۃ العلم تدریسا وتالیفا"۔

حضرت شیخ مدظلہ، کو بھی حضرت سے عجیب موانست والفت تھی۔ حضرت کے وصال کے چند روز بعد نیو ٹاؤن آپ کے مزار مبارک پر تشریف لائے، وہ رقت انگیز منظر کبھی نہ بھولے گا۔ دیر تک قبر مبارک پر اشک محبت کے موتی نثار کرتے اور ایصال ثواب ودعائے ترقی درجات فرماتے رہے۔ اندر سے حضرت کی روح طیبہ بھی گویا پکار رہی تھی:

شنیدہ ام کہ عشق داروئے گذاردت بدینسان
بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

اور جب کراچی سے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو چند دن بعد خادم کے نام عتاب نامہ آیا کہ اگر حضرت مرحوم زندہ ہوتے تو اب تک ان کے کئی خط آگئے ہوتے، تم

لوگوں نے اب تک کوئی خط نہیں لکھا ... سبحان اللہ! اس الفت وعنایت کا آج کے کسی پیمانے سے وزن کیا جاسکتا ہے؟

حضرت اقدس پر بینات کا خاص نمبر نکالنے کا ارادہ ہوا تو ڈرتے ڈرتے حضرت شیخ مدظلہ کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا کہ بطور تبرک چند کلمات تحریر کروادیے جائیں' جواب ملا:

"...بعد سلام مسنون گرامی نامہ پہنچا' مولانا بنوریؒ کی یادگار میں "بینات" کا خاص نمبر شائع کرنے کی تو میری بھی درخواست ہے اور دعا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کی شفقتیں اخیر میں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ وہ بار بار یاد آکر بہت ستاتی ہیں مگر اس ناکارہ کو اس قسم کے مضامین لکھنے کی کبھی عادت نہیں۔ یہ کوئی تصنع یا تواضع نہیں... حضرت مدنی کے وصال پر بھی دوستوں کا بہت اصرار رہا کہ "الجمعیۃ" کے خصوصی نمبر کے لئے لکھوں' نیز حضرت رائے پوری اور چچا جان اور عزیز یوسف (حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی ثم دہلوی' امیر تبلیغ) مرحوم کے وصالوں پر تقاضے ہوتے رہے' مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لکھوں ...... اس لئے اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں اور دعا سے بالکل دریغ نہیں اور درخواست ہے کہ ضرور یہ خاص نمبر شائع کریں۔ آپ نے مولاناؒ کے "بینات" کے اداریے الگ جمع کرنے شروع کردیئے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور امت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے"۔

اس کے بعد حضرت شیخ مدظلہ کے کرامت نامے مسلسل موصول ہوئے یہ سب حضرت مرحوم سے حضرت شیخ مدظلہ کی محبت وشفقت ہے حضرت کے طفیلوں کو بھی نصیب ہورہی ہے۔

قیام کراچی کے بعد حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ (مفتی اعظم پاکستان) سے اتحاد ویگانگت کا جو تعلق رہا وہ سب کو معلوم ہے۔ ان کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ حضرت مولانا عبدالہادی دین پوری مدظلہ اور دیگر اکابر سے بھی عقیدت مندانہ تعلق رہا۔

حضرت کی پوری زندگی کا خلاصہ صرف ایک فقرے میں سمیٹا جاسکتا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے دور کے ائمہ کبار کے دامن سے وابستہ رہے اور ان کی نظر عنایت کا سایہ آپ کے سر پر سایہ فگن رہا۔ اللہ تعالیٰ حضرت اور حضرت کے تمام اکابر کے درجات بلند فرمائے اور ہم ناکاروں کو بھی ان کی جوتیوں کے صدقے اپنی رحمت و رضا نصیب فرمائے۔ آمین۔

فاولئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا ۔

(اشاعت خاص بینات محرم الحرام ۱۳۹۸ھ مطابق جنوری ۱۹۷۸ء)

میرے حضرت بنوریؒ کی

چند حسین یادیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا محمد یوسف بنوری رحمتہ اللہ علیہ پر اقراء کا خاص نمبر شائع ہو رہا ہے، رفیق محترم مولانا محمد جمیل خان کا اصرار ہے کہ اس کے لئے کچھ میں بھی لکھوں، اس ناکارہ نے اپنے بہت سے اکابر پر لکھا ہے مگر ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ان اکابر پر جو کچھ لکھا جائے اسے اپنی آپ بیتی کے عنصر سے مبرّا رکھا جائے۔ موصوف کی فرمائش پر کوئی خاص علمی مضمون ذہن میں نہیں آیا۔ اس لئے خیال ہوا کہ آج کی صحبت میں حضرتؒ سے متعلق اپنی آپ بیتی کی چند یادداشتیں قلم بند کردوں۔

....

حق تعالیٰ شانہ کے جو بے پایاں انعامات واحسانات اس بندہ ناکارہ کے شاملِ حال ہیں، ان میں سے ایک عظیم انعام یہ ہے کہ اپنے مقبول و محبوب بندوں کی محبت قلب میں ودیعت فرمائی اور ان سے ربط و تعلق نصیب فرمایا۔ فلہ الحمد ولہ الشکر۔ ہمارے حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی عارفی نور اللہ مرقدہ یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

گرچہ از نیکاں نیم لیکن بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

چار بزرگوں کے ساتھ اس ناکارہ کو بچپن ہی سے عشق کی حد تک عقیدت و محبت تھی۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ، حضرت امام التبلیغ مولانا محمد یوسف دہلوی نور اللہ مرقدہ، حضرت محدث العصر مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ، حضرت سلطان القلم مولانا مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ۔

اپنے چار اکابر کے لئے یہ ناکارہ ہر نماز کے بعد التزاماً ایصال ثواب کرتا ہے اور ان کی بلندیٔ درجات کے لئے دعا کرتا ہے۔

۱۔ سیدی و مرشدی حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ بانی خیر المدارس ملتان، ۲۔ سیدی و مرشدی قطب العالم حضرت شیخ مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ ۳۔ سیدی و مرشدی حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ ۴۔ سیدی و سندی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ۔

اول الذکر میرے استاذ حدیث بھی ہیں اور شیخ اول بھی۔ ثانی الذکر میرے شیخ ثانی ہیں۔ حضرت ڈاکٹر صاحب میرے رہبر طریقت ہیں اور حضرت اقدس بنوریؒ سے نہ اس ناکارہ کو باقاعدہ تلمذ حاصل تھا اور نہ وہ اس ناکارہ کے باقاعدہ شیخ طریقت تھے، لیکن اس ناکارہ کی شخصیت کی تکوین میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے اور علمی و روحانی استفادہ سب سے زیادہ انہی سے کیا۔ اس لئے یہ ناکارہ ان کو اپنا سب سے بڑا محسن سمجھتا ہے۔ بعد میں حضرت بنوریؒ نے اس ناکارہ کو حدیث کی اجازت بھی عطا فرمائی تھی، اس لئے ان کو بھی اپنا شیخ و مرشد سمجھتا ہوں۔

اب یہ تو یاد نہیں کہ حضرت بنوریؒ کا نام سب سے پہلے کب سنا؟ اور ان کی زیارت سب سے پہلے کب اور کس جگہ ہوئی؟ البتہ اتنا یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ان کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ اس ناکارہ نے ہرچند کوشش کی کہ حدیث میں حضرتؒ سے تلمذ حاصل کروں اور دورۂ حدیث حضرتؒ کے مدرسہ میں ہو۔ لیکن میرے والد ماجدؒ مجھے اتنی دور بھیجنے پر راضی نہ ہوئے۔ اس لئے یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور یہ حسرت دل کی دل میں رہ گئی، یقیناً اس میں بھی حق تعالیٰ شانہ کی کوئی تکوینی مصلحت ہوگی۔

حضرت بنوریؒ کی پہلی یاد جو اس ناکارہ کے ذہن وحافظہ پر نقش ہے وہ خیرالمدارس ملتان کے سالانہ جلسہ پر حضرتؒ کی تشریف آوری تھی۔ یہ ناکارہ خیرالمدارس کا طالب علم تھا' حضرتؒ جلسہ پر تشریف لائے' آپ کے ساتھ آپ کے مدرسہ کے ایک مصری استاذ بھی تھے' حضرتؒ تقریر کے لئے جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو اس مصری استاذ کو بھی اپنے برابر کرسی پر بٹھالیا اور تقریر سے پہلے حضرتؒ اپنے اس رفیق کی مدح وستائش کرنے لگے' سامعین حضرتؒ کے تعریفی کلمات سے متعجب تھے' کیونکہ مصری علماء کی طرح یہ صاحب بھی بے ریش تھے۔ غالباً حضرتؒ نے سامعین کے چہروں میں حیرت واستعجاب کے خطوط پڑھ لئے' اس لئے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

" آپ حضرات ان کی ظاہری شکل کو نہ دیکھیں' ان کا باطن بہت خوب ہے' بہت عمدہ ہے' بہت اچھا ہے۔ آپ حضرات دعا کریں کہ میرا باطن ان جیسا ہوجائے اور ان کا ظاہر مجھ جیسا ہوجائے۔"

اور پھر اپنے اس رفیق کی طرف متوجہ ہوکر عربی میں فرمایا کہ شیخ! میں نے حاضرین سے یہ دعا کرنے کی فرمائش کی ہے۔ یہ سن کر وہ مصری عالم کھڑے ہوئے اور عربی میں کہا کہ "تمام حاضرین گواہ رہیں کہ آج سے میرا ظاہر شیخ بنوریؒ جیسا ہوگا"۔

حضرتؒ نے جب ان کے عربی فقروں کا ترجمہ کیا تو سامعین عَش عَش کر اٹھے' اس وقت ان کی مسرت وشادمانی لائق دید تھی۔ حضرت کی تواضع اور ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے انداز کا یہ پہلا نقش تھا جو اس ناکارہ کے ذہن پر مرتسم ہوا' اور آپ کی یہ ادا ایک مثال تھی جو اہل علم کے لئے لائق تقلید ہے۔

حضرت بنوریؒ سے اس ناکارہ کا تعلق ۱۳۸۶ھ میں ہوا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ یہ ناکارہ ایک چھوٹے سے قصبہ ماموں کانجن ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) میں مدرس تھا۔ ان دنوں فیلڈ مارشل ایوب خان "پاکستان کا اکبر بادشاہ" بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر فضل الرحمان اور اس کے بعض ملحد رفقاء ابو الفضل اور فیضی کا کردار ادا کر رہے تھے' ادارہ تحقیقات اسلامی' ان کی کمین گاہ تھی۔ جہاں استشراقی افکار کی آری سے اسلام کی جڑیں کاٹنے کے لئے دن رات کام ہورہا تھا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کا ماہنامہ تو ان دنوں

ڈاکٹر فضل الرحمان کے الحاد ونفاق کا خصوصی ترجمان تھا ہی' اس کے علاوہ دیگر اخبارات ورسائل میں بھی ان کے ملحدانہ افکار وسیع پیمانے پر شائع ہو رہے تھے۔ ادھر حضرت بنوریؒ کا ماہنامہ "بینات" کراچی' ڈاکٹر فضل الرحمان کے خلاف میدان جہاد میں اترا ہوا تھا۔ "بینات" کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت بنوریؒ کی تمام تر ظاہری وباطنی قوتیں فضل الرحمانی فتنہ کا سر کچلنے پر مرکوز ہیں' انہی دنوں ڈاکٹر فضل الرحمان کے بعض ملحدانہ مضامین اخبارات میں شائع ہوئے' جس سے اس ناکارہ کی طبیعت بے چین ہو گئی' اسی اضطرابی کیفیت میں حضرت بنوریؒ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا کہ آپ حضرات اس سیل الحاد کے سامنے بند باندھنے کی کوئی تدبیر فرمائیں' میرے خط کا جواب نہ آیا تو میں نے یاد دہانی کے لئے دوبارہ عریضہ لکھا' اس کے جواب میں حضرت کا گرامی نامہ موصول ہوا۔

جس کا عکس اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

ڈاکٹر فضل الرحمان کا رسالہ "فکر و نظر" تو ماموں کانجن میں مجھے کہاں میسر آتا "بینات" میں ڈاکٹر فضل الرحمان کے جو اقتباسات نقل کئے جارہے تھے' انہی کو پڑھ کر اس ناکارہ نے بھی اس فتنہ کی تردید میں ایک مضمون سپرد قلم کیا۔ جس کا عنوان تھا "ڈاکٹر فضل الرحمان کا تحقیقاتی فلسفہ اور اس کے بنیادی اصول" میں نے اس کی ایک نقل حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی مدیر "بینات" مدظلہ العالی کو بھیجی' چونکہ یہ ناکارہ اس میدان میں بالکل اناڑی تھا اور اس مضمون میں بعض نازک تعبیرات آگئی تھیں اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میرا قلم جادۂ استقامت سے نہ بھٹک گیا ہو۔ اس لئے میں نے حضرت مولانا میرٹھی مدظلہ العالی سے درخواست کی کہ اس مضمون کو ایک نظر دیکھ لیا جائے اور کوئی چیز اصلاح طلب نظر آئے تو اس کی اصلاح فرمادی جائے۔ اس ناکارہ کو وہم وخیال بھی نہیں تھا کہ یہ مضمون "بینات" میں چھپ سکتا ہے؟ مدعا صرف یہ تھا کہ اگر اس کی تصحیح وتصویب فرمادی جائے تو کسی اور پرچے میں چھاپ دیا جائے گا' لیکن میری حیرت کی حد نہ رہی' جب میرے منسلکہ عریضہ کے جواب میں نہ صرف یہ کہ مدیر "بینات" کا گرامی نامہ موصول ہوا' بلکہ اس کے ساتھ میرے حضرت اقدس شیخ بنو[illegible]ت نامہ تھا کہ تمہارا مضمون پسند آیا' تم

المدرسة العربية الإسلامية
كراتشي رقم (٥)
باكستان

تاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ ۳۰ جون ۱۹۶۶ء
نمبر ....
ٹیلیفون 46962-41720

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

بسم اللہ الرحمان الرحیم

گرامی قدر محترم۔ وفقکم اللہ لکل خیر وسعادة — السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نامہ کرم نے مشرف کیا آپ کا پہلا کرم نامہ بھی آیا تھا لیکن میں اس وقت ٹائیفائڈ بخار میں صاحب فراش تھا۔ مراسلات لکھنے اور پڑھنے سے معذور تھا' بخار طویل ہو گیا تھا کوئٹہ تبدیلی آب و ہوا کے لئے جانا پڑا اس طرح آمدہ خطوط کے ڈھیر میں مکتوب دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا' سب درست ہے آپ کے دینی جذبات اور دینی احساسات سے بہت خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ ان مبارک خیالات کو امت کے لئے نافع اور مثمر فرمائے۔ آمین۔ انہی مقاصد کے پیش نظر حضرت مفتی مولانا محمد شفیع صاحب کے ساتھ مل کر "دعوت و اصلاح" کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل کی گئی ہے مطبوعہ پمفلٹ ارسال کیا جائے گا۔ بہر حال دعا کریں۔ غفلت یا تغافل نہیں ۔۔۔ تدبیر زیر غور ہے۔ اس وقت اتنا ہی لکھ سکتا ہوں ۔۔۔ والسلام

۔۔۔ نوری عفا اللہ عنہ

رمضان المبارک ہمارے پاس گزارو' اور اگر یہ تعلق مستقل ہو جائے تو بہت ہی بہتر ہوگا۔ حضرتؒ کے کرامت نامہ کے جواب میں اس ناکارہ نے لکھا کہ رمضان المبارک میں تو میرا اپنے والد ماجد کی خدمت میں گاؤں میں رہنا ناگزیر ہوتا ہے اور وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے کہ میں رمضان کراچی میں گزاروں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں یکم شعبان کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور ۲۸ر شعبان کو آپ سے رخصت ہو کر ۲۹ر شعبان کو حضرت والد ماجد کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔ حضرتؒ نے اس تجویز کو شرف قبول بخشا اور میں قرارداد کے مطابق یکم شعبان ۱۳۸۶ھ کو حضرت کی خدمت میں پہنچ گیا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ مزاحاً فرمایا کرتے تھے:

"ارے! نفس و شیطان تو ہمارے محسن ہیں کہ ہمیں مقام عبدیت پر لاتے ہیں کیونکہ بندہ گڑگڑا کر جب حق تعالیٰ شانہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو توبہ و انابت کے بعد مقام قرب میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کا ذریعہ نفس و شیطان بنے۔" اسی طرح ڈاکٹر فضل الرحمان اس ناکارہ کے لئے حضرت بنوریؒ سے ربط و تعلق کا ذریعہ بن گیا۔ حق تعالیٰ شانہ جب چاہیں شر سے خیر کا پہلو پیدا فرما دیتے ہیں۔

حضرت بنوریؒ کی خواہش تھی کہ ناکارہ کا تعلق ان سے مستقل ہو جائے۔ اس لئے اس حاضری کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ تم ماموں کانجن سے ایک سال کی چھٹی لے کر رمضان کے بعد یہاں آجاؤ' اس ارشاد کی تعمیل سے بڑھ کر میرے لئے اور کیا سعادت ہو سکتی تھی' لیکن میری مشکل یہ تھی کہ میں آزاد اور خود رو نہیں تھا۔ اس لئے عرض کیا کہ میری نکیل میرے پیر و مرشد حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے یہ جرأت نہیں کہ ان کی خدمت میں عرض تمنا کروں' آپ حضرتؒ سے اجازت لے لیں' یہ ناکارہ بصد شوق حاضر ہے۔ فرمایا' ہم حضرت جالندھریؒ کی خدمت میں لکھیں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ حضرت اجازت نہ دیں۔

۲۸ر شعبان کو رخصت ہونے لگا تو حضرت رخصت کرنے کے لئے اس ناکارہ کی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ ایک لفافہ' جس میں دو سو روپے تھے' عطا کرنا چاہا۔ اس ناکارہ نے (اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے) محض تصنع اور بناوٹ کی بناء پر یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا

کہ میں اپنا کرایہ لے کر آیا ہوں' اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے حضرت کا مشفقانہ لہجہ کبھی نہ بھولے گا' اس کے جواب میں نہایت شفقت و محبت سے فرمایا۔ یہ میری طرف سے ہدیہ ہی قبول کرلیجئے۔ یہ سنتے ہی میں نے فوراً وہ لفافہ لے کر جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد حضرتؒ نے کئی بار اس ناکارہ سے فرمایا کہ "تمہارا وہ انکار کرنا مجھے گھائل کرگیا' میں نے (حضرتؒ نے) اسی سے سمجھ لیا کہ یہ ہمارے کام کا آدمی ہے۔"

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صاحب بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللّٰہ دلنی علٰی عمل اذا انا عملتہ احبنی اللّٰہ واحبنی الناس۔ "یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے کہ جب میں اسے کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کریں اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔"

جواب میں ارشاد فرمایا:

ازھد فی الدنیا یحبک اللّٰہ' وازھد فیما عند الناس یحبک الناس۔

"دنیا سے بے رغبتی اختیار کر' تجھے اللہ تعالیٰ محبوب رکھیں گے اور جو لوگوں کے پاس ہے' اس سے بے رغبتی اختیار کر' تجھے لوگ محبوب رکھیں گے۔"

(رواہ الترمذی وابن ماجہ عن سہیل بن سعد۔ مشکوٰۃ' ص ۴۴۲)

حضرت بنوریؒ کے اس واقعہ سے اس ارشاد نبوی (علٰی صاحبہا الصلاۃ والتسلیمات) کی کیسی تصدیق ہوئی؟

اس ناکارہ کی طرف سے استغناء کا یہ مظاہرہ محض ریاکاری اور تصنع تھا' جس سے حضرتؒ متاثر ہوئے۔ اے کاش! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تکمیل میں ہمیں واقعتاً زہد کی حقیقت نصیب ہوجاتی تو ہم خالق اور مخلوق کی نظر میں واقعی محبوب بن جاتے۔

زہد کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی محبت دل سے نکل جائے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں:

"تحصیل زہد کا طریقہ یہ ہے کہ مخلوق کے ہاتھ میں جو کچھ متاع دنیا ہے سب سے امید قطع کردے' جو شخص ایسا کرے گا اس کا قلب راحت میں رہے گا' کیونکہ زہد قلب اور بدن دونوں کو راحت دیتا ہے۔" (انفاس عیسیٰ' ص ۱۷۸)

ہمیں دنیا کی رغبت اس لئے ہے کہ ہم دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھتے' اگر دنیا کی حقیقت معلوم ہو جائے تو واقعتاً دنیا کی رغبت سے دل سرد ہو جائے۔ حضرت حکیم الامت" فرماتے ہیں:

"دنیا کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے لوگ اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں' اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے' اس کی ایسی مثال ہے جیسے پاخانہ پر چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوں اور کوئی اس کو حلوہ سمجھ کر تاک میں بیٹھا ہو' یا کسی چڑیل بڑھیا کو لال ریشمی لباس پہنا دیا گیا ہو اور نقاب سے منہ ڈھک دیا گیا ہو اور کوئی حسین و خوبصورت سمجھ کر محبت کا دم بھرنے لگے۔

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد
چوں باز کنی مادر مادر باشد

(انفاس عیسیٰ' ص ۱۷۴)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"صاحبو! دنیا ظاہر میں محاسن سے مزین ہے مگر اندر گوہ' موت اور سانپ بچھو بھرے ہوئے ہیں' اور آخرت ظاہر میں مکارہ و مصائب سے گھری ہوئی ہے' مگر اندر سے نہایت حسین و دلفریب محبوبہ ہے' جس کی ایک نگاہ کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی کوئی چیز نہیں۔"

(انفاس عیسیٰ' ص ۱۷۵)

" آج کل فخراً کوئی کہتا ہے مجھ کو اتنا نفع ہوا' دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس اتنا جمع ہے' اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو بھنگی آپس میں فخر کریں' ایک کہے میں نے اتنے گوہ کے ٹوکرے کمائے دوسرا کہے میں نے تجھ سے زیادہ کمائے۔"

(انفاس عیسیٰ' ص ۱۷۴)

ان ارشادات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی علت بھی معلوم ہو جاتی ہے جو اوپر نقل کیا گیا' کیونکہ جب دنیا کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردار لاش اور گندگی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں تو جو لوگ اس میں رغبت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں کیسے محبوب ہو سکتے ہیں؟

یہ ناکارہ ۲۸ر شعبان ۸۶ھ کو حضرت" سے رخصت ہو کر گھر چلا گیا۔ حضرت" نے حضرت

اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ کی خدمت میں میرے بارے میں خط لکھا ہوگا لیکن جواب نہیں آیا' اس لئے حضرت نے گھر کے پتہ پر مجھے گرامی نامہ تحریر فرمایا' جس میں مجھے تاکید کی گئی کہ میں خود بھی حضرت جالندھریؒ کی خدمت میں لکھوں تاکہ حضرت کا منشا معلوم ہونے سے یکسوئی ہو جائے۔ اس گرامی نامے کا عکس پیش خدمت ہے:

المدرسة العربية الإسلامية
كراتشي رقم (٥)
باكستان

تاریخ..............................
نمبر..............................
ٹیلیفون 46962-41720

باسمہ تعالیٰ

برادر گرامی الطاف صاحب - وفقکم اللہ لکل خیر وسعادۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ - نامہ کرم و تبصرہ پہنچ گیا تھا

مولانا خیر محمد صاحب کی خدمت میں خط لکھا تو جواب کا انتظار رہا خیر

ہوگئی - [illegible] - [illegible]

ہوگئے [illegible] [illegible] ہوگا اگر

آپ بھی چند سطریں لکھ کر دریافت کریں - مولانا [illegible]

اور مولانا بدیع الزماں صاحب [illegible] کو [illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible] - ممکن ہے [illegible]

[illegible] - [illegible]

والسلام

محمد یوسف بنوری [illegible]

[illegible]

حضرت بنوریؒ کے ارشاد کی تعمیل میں اس ناکارہ نے بھی ایک دستی خط برادر زادہ مولوی محمد اسلم کے ہاتھ سیدی حضرت اقدس مولانا خیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ حضرتؒ نے تحریر فرمایا کہ "میں مولانا بنوریؒ کو لکھ رہا ہوں، تمہارا کچھ مدت کے لئے کراچی رہنا مفید ہے۔" اس طرح ایک سال کی رخصت لے کر شوال ۸۶ھ سے شعبان ۸۷ھ تک یہ ناکارہ حضرت بنوریؒ کی خدمت میں رہا۔ تدریس کے لئے ایک سبق دے دیا گیا اور باقی اوقات "بینات" کے لئے وقف کردیئے گئے۔ شعبان میں سال کی رخصت ختم ہوئی تو حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ اب مستقل طور پر یہاں آجاؤ۔ عرض کیا کہ اہل و عیال کے بغیر رہنا میرے لئے مشکل ہے۔ اور اہل و عیال کو یہاں لانا مشکل ہے۔ حضرتؒ کی طرف سے اصرار ہوا کہ اگر یہ صورت ممکن نہیں تو کم سے کم مہینے میں دس دن "بینات" کے لئے دے دیا کروں، میں نے اس تجویز کو بخوشی قبول کرلیا۔ مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ پنجاب کے جس مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دوں وہ بھی ہر مہینے دس دن کی چھٹی پر راضی ہو۔ میرے سابقہ مدرسہ والے اس پر راضی نہیں ہوئے۔ لیکن جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے ناظم اعلیٰ جناب مولانا حبیب اللہ فاضل رشیدی مرحوم کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس کو غنیمت باردہ سمجھ کر بڑی فراخ قلبی سے اس کی پیش کش کردی کہ میں ان کے مدرسہ میں رہوں۔ بیس دن ساہیوال کے اور دس دن کراچی کے۔ حق تعالیٰ شانہ مولانا فاضل رشیدیؒ کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائیں۔ یہ ناکارہ شوال ۱۳۸۷ھ سے شعبان ۱۳۹۴ھ تک جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں رہا۔ وہاں کے شیخ الجامعہ فاضل رشیدی کے برادر اکبر اس ناکارہ کے محبوب ترین استاذ حضرت مولانا محمد عبداللہ رائے پوریؒ تھے۔ صدر مدرس حضرت علامہ غلام رسولؒ اور ناظم جناب مولانا مقبول احمد صاحب زید مجدہ تھے۔ ان اکابر کے اخلاص و تواضع اور شفقت و محبت کی برکت سے جامعہ رشیدیہ کی فضا رشک جنت تھی۔ تمام اساتذہ کے درمیان ایسی الفت و یگانگت تھی جس کی مثال اس دور میں بہت ہی کمیاب ہے۔

ذر ... ... كنا وكنا نحبها
اذا لـ... ناس والزمان زمان

جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں قیام کرنے کے بعد یہ ناکارہ ہر مہینے پابندی سے دس دن کے لئے ساہیوال سے کراچی آتا۔ "بینات" کا کام سمیٹتا (جو اَب کلیتہً اس کے سپرد تھا) اور دس دن بعد چلا جاتا۔ کبھی کبھی ایک مہینہ کے دورہ پر "جمع بین الشہرین" کی شکل بھی ہوجاتی کہ ایک مہینے کے آخری دس دن اور دوسرے کے پہلے دس دن جمع کرکے بیس دن کا قیام ہوجاتا۔ میری پابندیٔ آمد و رفت کے باوجود حضرتؒ کی خواہش تھی کہ میں مستقل یہاں آجاؤں۔ قریباً ہر حاضری کے موقع پر ہمیشہ یہی اصرار رہتا کہ بس یہاں آجاؤ۔ مگر یہ ناکارہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اصرار و انکار کا یہ سلسلہ آخر تک رہا۔ یہاں تک کہ حضرتؒ کی آخری مجلس میں (جو مسجد کے عقب میں شوال کی آخری بدھ کو ہوئی) حضرتؒ نے فرمایا: "مولانا! آپ یہاں آجایئے! آپ جیسا مکان چاہیں گے آپ کو لے کر دوں گا۔" یہ حضرتؒ کی کرامت تھی کہ ان کے وصال کے بعد یہ ناکارہ کراچی ہی کا ہوکر رہ گیا' حضرتؒ نے ایک بار دریافت فرمایا کہ آخر تم یہاں آنے پر آمادہ کیوں نہیں ہوتے؟ اس ناکارہ نے دل کا اصل چور بتانے کی تو جرأت نہ کی' صرف یہ عرض کیا کہ میرے گھر والی دیہات کے کھلے مکانوں میں رہنے کی عادی ہے' یہاں کے تنگ مکانوں میں پریشانی ہوگی۔ حضرتؒ نے میرے والد ماجدؒ سے اس کا شکوہ کیا کہ اس کی بیوی دین کی خاطر تکلیف برداشت کرنے پر آمادہ نہیں' میرے دل کا اصل چور یہ تھا۔۔۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے ۔۔۔ کہ مجھے دنیا کا کوئی کام تو آتا نہیں' ادھر مدرسہ سے اڑھائی تین سو روپے تنخواہ ملتی ہے' بچوں کو یہاں لاؤں گا تو مکان کا کرایہ اور دیگر مصارف کہاں سے پورے کروں گا؟ بہتر ہے کہ بچے پنجاب ہی میں رہیں' وہاں سے جو کچھ ملتا ہے اس سے بچوں کا گزارہ چلتا رہے گا' یہاں لاکر ان کو پریشان کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ میں خود ہی ہر مہینے طویل سفر کی صعوبت برداشت کرلیا کروں۔ میں اگر حضرتؒ کو یہ اصل بات بتاتا تو یقیناً حضرتؒ میرے اس "مرض بے یقینی" کا علاج بھی تجویز فرمادیتے' مگر اس ناکارہ کو یہ بتانے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ پیش آیا۔ اسیر مالٹا حضرت اقدس مولانا سید عزیر گل صاحب مدظلہ العالی جو اسارت مالٹا میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے رفیق امام المجاہدین حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کے خادم

خاص رہ چکے ہیں، حضرت بنوریؒ کو ان سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ حضرتؒ ایک طویل عرصہ سے کوشاں تھے کہ وہ ہمارے مدرسہ کو اپنے قدوم میمنت کا شرف بخشیں، اور حضرتؒ ان کی میزبانی فرمائیں۔ ایک عرصہ کی پیہم کوششوں کے بعد حضرتؒ کی یہ مراد بر آئی، اور حضرت اقدس مولانا سید عزیز گل مدظلہ العالی ہمارے مدرسہ میں رونق افروز ہوئے، وہ دن ہمارے حضرت بنوریؒ کی انتہائی مسرت وشادمانی کا دن تھا۔ جبیں حسین پر ایسی خوشی اور بشاشت کے آثار میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ چہرۂ مبارک فرط مسرت سے دمک رہا تھا۔ حسن اتفاق سے یہ ناکارہ بھی ان دنوں کراچی تھا۔ مخدوم و معظم مہمان جس کمرے میں تشریف فرما تھے، زیارت کے لئے یہ ناکارہ بھی وہاں حاضر ہوا، آج تک وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے، میں نے لپک کر مصافحہ کیا اور میرے حضرت بنوریؒ نے معزز مہمان سے اس نالائق کا تعارف کرانا شروع کیا۔ "یہ میرے ہم نام ہیں، ایسے ہیں، ویسے ہیں، چنیں ہیں، چناں ہیں۔"

میرے حضرت بنوریؒ کا حیرت انگیز فقرہ جس کی توجیہہ آج تک سمجھ میں نہیں آئی یہ تھا "حضرت! یہ ہمارے مدرسہ میں مستقل قیام کے لئے نہیں آتے۔ ان سے کہئے کہ مستقل طور پر ہمارے مدرسہ میں آجائیں۔" اب بھی سوچتا ہوں تو حیران ہوجاتا ہوں کہ آخر مدرسہ میں اس ناکارہ کا ٹھہرنا ایسا کون سا اہم مسئلہ تھا جس کو حضرتؒ نے اپنے عظیم اور محبوب مہمان کے سامنے پیش کیا اور ان سے سفارش کی فرمائش کی؟

مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھریؒ تھے۔ جن کو ہمارے حضرتؒ "وکیل العلماء" کا خطاب دیتے تھے، ان کے انتقال کے بعد جماعت کی قیادت میں خلا سا محسوس ہونے لگا اور کچھ ایسے مسائل سر اٹھانے لگے تھے جن سے مضبوط قیادت ہی نمٹ سکتی تھی، جماعت کے امیر کے انتخاب کے لئے شوریٰ کا اجلاس طلب کیا گیا۔ ہمارے حضرت بنوریؒ بھی جماعت کی شوریٰ کے رکن رکین تھے۔ حضرتؒ اجلاس میں شرکت کے لئے ملتان تشریف لے جارہے تھے کہ یہ ناکارہ حاضر خدمت ہوا، اور عرض کیا کہ "حضرت اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، میری درخواست ہے کہ یا تو جماعت کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیجئے، یا فاتحہ فراغ پڑھ کر

جماعت کو ختم کرنے کا اعلان کرادیجئے۔" حضرتؒ اس ناکارہ کی اس درخواست سے بہت متاثر ہوئے اور برجستہ فرمایا کہ "اگر میں جماعت کی امارت قبول کرلوں تو تم ساہیوال سے ملتان مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں منتقل ہو جاؤ گے؟"

عرض کیا' حضرت! مجھے کراچی' آنے سے عذر ہے' کراچی کے علاوہ آپ جہاں حکم فرمائیں وہاں جابیٹھنے کے لئے تیار ہوں۔ بہت خوش ہوئے۔ ملتان تشریف لے گئے تو حسن اتفاق سے وہاں کے احباب نے بھی حضرتؒ سے وہی درخواست کی' دفتر کی کنجیاں حضرتؒ کے سامنے رکھ دیں اور عرض کیا کہ "آپ کے استاد محترم امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے یہ کام امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ذمہ لگایا تھا' شاہ جیؒ اور ان کے رفیق مولانا محمد علیؒ اس کام کو کررہے تھے' ہم لوگ ان کے کارکن تھے' اب یہ آپ کے استاذ محترم کی میراث ہے' اور اس کی کنجیاں آپ کے سپرد ہیں' اگر اس کام کو جاری رکھنا ہو تو بسم اللہ ہماری قیادت کیجئے' ورنہ یہ کنجیاں پڑی ہیں' دفتر کو تالا لگادیجئے' ہم سب بھی اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔" اس طرح حضرتؒ کو جماعت کی امارت قبول کرنا پڑی اور پھر چند مہینے بعد ہی حضرت کی قیادت میں ختم نبوت کی وہ تحریک چلی' جس کے نتیجہ میں ۱۹۷۴ء کا تاریخی فیصلہ ہوا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ گویا جماعت کی امارت کے لئے حضرت بنوریؒ کا انتخاب حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے اس تحریک کی کامیابی کا تکوینی انتظام تھا۔ الغرض حضرتؒ جماعت ختم نبوت کے امیر منتخب ہو کر کراچی تشریف لائے تو یہ ناکارہ مبارکباد کے لئے حاضر ہوا' مبارکباد پیش کی تو فرمایا "تمہیں اپنا وعدہ بھی یاد ہے؟ اب تمہیں ختم نبوت کے دفتر میں ٹھہرنا ہوگا۔" عرض کیا! "حضرت! بالکل حاضر ہوں' مگر میری تین درخواستیں ہیں' ایک یہ کہ مجھے رہائش کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی۔ دوسری یہ کہ ختم نبوت کے مرکزی دفتر ملتان میں مسجد کے بغیر جماعت ہوتی ہے' دفتر کے ساتھ مسجد ہونی چاہئے' اور تیسری یہ کہ بچوں کی پڑھائی کے لئے قرآن کریم کے مکتب کا انتظام کردیا جائے۔" فرمایا "تینوں شرطیں منظور۔" حضرتؒ نے جامعہ رشیدیہ کے حضرات سے فرمایا کہ اس کو مدرسہ سے فارغ کردیا جائے۔ اس طرح یہ ناکارہ شوال ۱۳۹۴ھ سے

ساہیوال سے دفتر ختم نبوت ملتان میں منتقل ہوگیا۔ اور دس دن کے لئے کراچی حاضری کا سلسلہ بدستور رہا۔

ملتان میں رہائش کے لئے مکان کا حصول ایک مسئلہ تھا' جماعت کے پاس کوئی مکان نہ تھا جس میں ٹھہرتا۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے حضرت کو پیشکش کی کہ یہ ہمارے مدرسہ قاسم العلوم میں ایک سبق پڑھادیا کرے ہم اس کو مکان دے دیں گے۔ حضرتؒ نے یہ تجویز اس ناکارہ سے ذکر کی تو میں نے عرض کیا کہ "حضرت! ملتان میں میری مادر علمی خیر المدارس ہے' اس کے ہوتے ہوئے ملتان میں کسی دوسری جگہ سبق نہیں پڑھاسکتا' آپ خیر المدارس کے مہتمم صاحب سے دریافت فرمالیں' اگر وہ مجھے خیر المدارس میں مکان دینے پر آمادہ ہوں تو میں ایک سبق خیر المدارس میں رکھ لوں گا۔" چنانچہ حضرتؒ نے خاص اس مقصد کے لئے ملتان کا سفر فرمایا' خیر المدارس تشریف لے گئے۔ وہ منظر آج بھی گویا آنکھوں کے سامنے ہے۔ حضرتؒ نے خیر المدارس کے مہتمم صاحب جناب مولانا محمد شریف جالندھریؒ سے فرمایا کہ "اس کو (ناکارہ کو) تمہارے ساتھ خاص تعلق ہے' اس کو مدرسہ میں مکان دے دو' یہ مدرسہ میں ایک سبق پڑھادیا کرے گا۔" لیکن مولانا مرحوم نے اس امر کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور ہوں ہاں کرکے ٹال گئے۔ جب یہ صورت بھی نہ بَن پڑی اور قاسم العلوم میں پڑھانے کے لئے یہ ناکارہ آمادہ نہ ہوا تو حضرتؒ نے حکم فرمایا کہ دفتر کی عمارت ہی میں مکان کا انتظام کیا جائے۔ دفتر میں مکتب بھی کھول دیا گیا اور مسجد کے لئے جگہ حاصل کرکے تعمیر شروع کردی گئی' اور اب جماعت کا نیا دفتر وہاں قائم ہے' اس طرح حضرتؒ نے میری تینوں درخواستوں کو شرف قبول بخشا۔

میرے چھوٹے بھائی کا مکان خیر المدارس ملتان کے قریب ہے۔ جس دن حضرتؒ میرے مکان کے سلسلے میں خیر المدارس تشریف لے گئے (جس کا ابھی اوپر ذکر ہوچکا ہے) اس دن حسن اتفاق سے میرے والد ماجدؒ بھی بھائی صاحب کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ حضرت کی تشریف آوری کا سن کر وہ بھی زیارت کے لئے خیر المدارس میں حاضر ہوئے۔ میرے حضرتؒ نے بہت ہی تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ سلام ودعا اور معانقہ ومصافحہ کے بعد میرے والد ماجدؒ سے دریافت فرمایا کتنے بیٹے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا چار۔ فرمایا

پانچواں محمد یوسف بنوریؒ۔ بعد میں میرے والد ماجدؒ جب کبھی اس کا تذکرہ کرتے تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔ اس لطف و عنایت اور محبت و شفقت کی کوئی حد ہے؟

اس ناکارہ کو اپنے اکابر کے کشف و کرامت کا کبھی انتظار نہیں رہا' نہ کبھی اس کا خیال آیا۔ ان کی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق ان کی کھلی کرامت تھی۔ ان کی خشیت و انابت' ان کا سوز و گداز' اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے ان کا تعلق و محبت' حضرت رسالت مآبؐ (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا عشق' اور ان کے اندر احیائے سنت اور خدمت دین کا جذبہ ہزار کرامتوں کی ایک کرامت تھی۔ جسے حضرات صوفیاء (قدس اللہ اسرارہم) "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" سے تعبیر کرتے ہیں' لیکن بعض واقعات بے ساختہ ایسے پیش آجاتے ہیں جن کی توجیہ قارئین شاید کشف کے سوا کسی اور چیز کے حوالے سے نہ کر سکیں گے۔ اس ضمن میں حضرت بنوریؒ کے ساتھ آپ بیتی کے دو واقعے نقل کرتا ہوں۔

یہ ناکارہ بالکل دیہاتی گاؤدی تھا' شہری ماحول اور شہری بود و باش سے بالکل ناآشنا' پہلی بار جب حضرتؒ کی دعوت پر حضرتؒ کے مدرسہ میں آیا' ان دنوں مدرسہ کے دفتر میں قالین کے بجائے میز کرسی اور صوفے رکھے ہوئے تھے۔ میرے حضرتؒ صوفے پر تشریف فرما تھے اور یہ ناکارہ سامنے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ یکایک دل میں وسوسہ آیا کہ یہ طمطراق بزرگوں کی وضع کے تو خلاف ہے' اس احمقانہ خیال کا دل میں آنا تھا کہ حضرتؒ فوراً میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ "یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں ہم نے ایک پیسے کا بھی نہیں خریدا' لوگ زبردستی یہاں ڈال جاتے ہیں۔" حضرتؒ کا یہ ارشاد سن کر یہ ناکارہ اپنے خیال پر ایسا شرمندہ ہوا کہ پسینے چھوٹ گئے۔

ایک مرتبہ دار الحدیث میں دعوت تھی' دستر خوان پر اس ناکارہ کی نشست میرے حضرتؒ کے بالکل سامنے تھی' حضرت گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے چار زانو تشریف فرما تھے۔ اچانک خیال آیا کہ کھانے کے لئے بیٹھنے کی یہ وضع خلاف سنت ہے' دوسرے ہی لمحہ حضرتؒ اس ناکارہ سے مخاطب تھے' اور فرما رہے تھے۔ "میں اپنے عذر کی وجہ سے سنت کے مطابق بیٹھنے پر قادر نہیں ہوں۔" واللہ ھذا لفظہ۔

اکابر کا ارشاد ہے:

ع پیش اہل دل نگہ دارید دل

یہ ناکارہ چونکہ اپنے دل کے گندے وساوس کو دفع کرنے اور "نگہدارید دل" کی وصیت پر عمل کرنے پر قادر نہیں تھا اس لئے حضرت کی محفل میں حاضر ہوتے ہوئے ڈرتا تھا اور "اللھم استر عوراتی" کی دعا دل ہی دل میں پڑھتا رہتا تھا۔ ایک صرف حضرت بنوریؒ ہی نہیں، بلکہ اپنے باطن کی گندگیاں ہمیشہ اپنے اکابر کی خدمت میں حاضری سے مانع رہیں۔ حق تعالیٰ شانہ حفاظت فرمائیں۔

یہاں بے ساختہ ایک لطیفہ یاد آیا۔ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ جب پہلی بار حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو راستے میں بہت ڈر رہے تھے اور اپنے رفقاء سے فرما رہے تھے کہ اگر ہمارے قلوب کے وساوس حضرتؒ پر منکشف ہو گئے تو کیا ہوگا؟ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو حضرت غیر معمولی شفقت وملاطفت سے پیش آئے۔ میرے شیخ حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ نے حضرت حکیم الامتؒ کو بتایا کہ شاہ جی بہت ڈر رہے تھے کہ کہیں ہمارے قلوب حضرت پر منکشف نہ ہو جائیں۔ دوران گفتگو شاہ جی نے عرض کیا کہ "حضرتؒ! ہم تو آپ کے بچے ہیں۔" حضرتؒ نے برجستہ فرمایا۔ "چھوٹے بچے تو ماں باپ کے سامنے ننگے پھرا کرتے ہیں۔ اگر اپنے کو بچہ سمجھتے تھے تو ڈر کیوں رہے تھے۔"

ہمارے حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی عارفی نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے:

اک ادائے چارہ فرما، اک نگاہ دل نواز
اور اک آزردہ خاطر کی خوشی ہوتی ہے کیا؟

میرے حضرت بنوریؒ کی ایک ایک ادا، ادائے چارہ فرما اور ایک ایک نگاہ، نگاہ دلنواز تھی۔ واقعات تو بہت سے ہیں ایک دو واقعے اس سلسلہ کے بھی عرض کرتا ہوں:

بینات کے ابتدائی دور میں اس کا ٹائیٹل "برہان" اور "معارف" کی طرح موٹے گلیز

کاغذ کا ہوا کرتا تھا' جسے جلد کرتے وقت عموماً الگ کردیا جاتا تھا۔

میرے آنے کے بعد اس کے بجائے آرٹ پیپر لگنے لگا' حضرتؒ کے اس وقت کے مشیر و معتمد جناب سردار میر عالم لغاری صاحب زید مجدہ نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ "بینات" کا ٹائیٹل وہی پرانا گلیز کاغذ کا ہونا چاہئے' اس ناکارہ کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ مغرب و عشاء کے درمیان حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی مدظلہ العالی میرے کمرے میں تشریف لائے اور فرمایا کہ لغاری صاحب نے حضرتؒ کو اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ بینات کا ٹائیٹل موٹے کاغذ کا ہونا چاہئے' کل صبح مشورے میں یہ مسئلہ بھی زیر غور آئے گا' اگر تم سے کوئی بندوست ہوسکتا ہے تو کرلینا' میں نے ان سے عرض کردیا کہ میرے خیال میں بھی یہی ٹائیٹل اچھا ہے۔ بہرحال صبح دیکھا جائے گا۔ صبح آٹھ بجے دار الحدیث میں اساتذہ جمع ہوئے' متعدد مسائل زیر غور تھے۔ حضرتؒ نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ پہلا مسئلہ بینات کے ٹائیٹل کا ہے۔ میری اور لغاری صاحب کی رائے یہ ہے کہ بینات پر وہی ٹائیٹل لگنا چاہئے جو ابتدائی دور میں لگا کرتا تھا اور جو "برہان" اور "معارف" پر لگتا ہے۔ اب اس کے دلائل سنو۔

جب حضرتؒ نے "اب اس کے دلائل سنو" فرمایا تو اس ناکارہ نے' جو حضرتؒ کے پاس بیٹھا تھا' بات کاٹتے ہوئے عرض کیا۔

" حضرت! دلائل کی بالکل ضرورت نہیں! ہم حضرت کی بات بلا دلیل مانتے ہیں' مگر ٹائیٹل یہی رہے گا جو اب لگ رہا ہے۔"

میرا لہجہ نہایت متأدبانہ تھا' مگر جو بات میں نے کہی وہ قطعاً غیر متوقع اور دو ٹوک تھی۔ اسے سن کر حضرتؒ پر حیرت و مسرت کی ملی جلی کیفیت طاری ہوگئی' اور بڑی تیزی سے (جیسا کہ حضرتؒ کا انداز تھا) فرمانے لگے "عجیب بات ہے' عجیب بات ہے" بس اس "عجیب بات ہے" میں ٹائیٹل کے مسئلہ کا فیصلہ ہوگیا۔ باہر نکل کر میرے دوستوں نے کہا کہ تم نے عجیب بات کی۔ میں نے کہا بھائی! حضرتؒ سے دلائل کی جنگ کون لڑتا اور آپ کے دلائل کی کاٹ کون کرتا؟ اس لئے سپر ڈال دی' اور مقام ناز میں کھڑے ہوکر اپنی بات منوالی۔

جب دس دن کے لئے اس ناکارہ کا تقرر ہوا تھا تب حضرتؒ نے میرا وظیفہ دو سو روپے مقرر فرمایا تھا' پھر اڑھائی سو کردیا' سالہا سال تک وہی چلتا رہا۔ ایک بار جناب مولانا مفتی ولی حسن صاحب زید مجدہ نے اس ناکارہ سے فرمایا کہ تیری تنخواہ تھوڑی ہے' خرچ زیادہ ہے' میں حضرتؒ سے عرض کروں گا' تنخواہ میں کچھ اضافہ فرمادیں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ "مفتی صاحب! حضرتؒ سے عرض کرنے کے بجائے حق تعالیٰ شانہ سے دعا فرمادیں کہ وہ اسی میں برکت ڈال دیں۔" ان دنوں اکابر اساتذہ کی تنخواہ غالباً پانچ چھ سو سے زیادہ نہیں تھی' اس لئے میرا دس دن کا یہ معاوضہ بھی استحقاق سے زیادہ ہی تھا۔ شاید مفتی صاحب نے حضرتؒ سے ذکر کیا ہوگا' اس کے بعد میری تنخواہ میں پچاس کا اضافہ کردیا گیا اور تین سو روپے ملنے لگے۔ انہی دو اڑھائی یا تین سو میں میرا ریل کا دو طرفہ کرایہ بھی ہوتا' مدرسہ کے دہ روزہ قیام کے مصارف بھی اور دیگر ضروریات بھی۔ حضرتؒ کے وصال سے غالباً ڈیڑھ دو سال پہلے ہمارے مخدوم جناب سردار میرعالم لغاری صاحب کو اس ناکارہ پر نہ جانے کیوں ترس آیا۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ "مولانا! آپ کا ہر مہینے اتنا طویل سفر کرکے آنا اور اس کے مصارف برداشت کرنا بڑا تکلیف دہ ہے۔ میرے خیال میں آپ ملتان ہی میں "بینات" مرتب کرکے بھیج دیا کریں۔ یہاں آپ کا ایک نائب رکھ دیا جائے گا' وہ یہاں کا کام کرلیا کرے گا' اور آپ زحمت سے بچ جائیں گے۔" میں نے کہا کہ اگر حضرتؒ اس کو منظور فرماتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اگلے دن نو بجے حضرت کے دولت کدہ پر طلب کیا گیا۔ بس یہ سہ رکنی مشاورت تھی۔ حضرت اقدسؒ تھے' جناب لغاری صاحب تھے' اور یہ کم سواد تھا۔ لغاری صاحب نے حضرتؒ کی خدمت میں اپنی وہی بات خوب وضاحت وفصاحت کے ساتھ بڑے دل کش انداز میں دہرائی' جو اوپر نقل کرچکا ہوں۔ لغاری صاحب اپنی بات پوری کرچکے تو اس ناکارہ نے عرض کیا کہ یہ تجویز تین وجہ سے غلط ہے:

اول : آپ لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ ساری صعوبتیں اور مصارف آپ کے "بینات" (اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں' میں نے یہی لفظ کہا۔ حالانکہ بینات' تو میرا نہیں بلکہ میں خود تھا۔ بینات' میری روح تھی اور میری غذا تھی۔ مگر لغاری صاحب نے جب مجھے

ملتان میں نظر بند کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی تو میں نے آپ کے بینات کے الفاظ استعمال کئے' بہرحال میں نے کہا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ ساری صعوبتیں اور سارے مصارف آپ کے بینات) کے لئے اٹھارہا ہوں' تو آپ غلط سمجھے ہیں۔ میرا ہر مہینے سفر کرکے یہاں آنا اور دس دن ٹھہرنا آپ کے بینات کے لئے نہیں' بلکہ میں حضرتؒ سے بیس دن کا توشہ لینے آتا ہوں۔ دس دن حضرتؒ کی خدمت میں رہنے کا جو موقع مجھے ملتا ہے' میں اس میں بیس دن کی روحانی غذا لے کر جاتا ہوں۔

دوم: یہ کہ جب میں یہاں ہوتا ہوں مجھے ملتان کے حالات کی کچھ خبر نہیں ہوتی اور جب ملتان ہوتا ہوں تو یہاں کے حالات سے بے خبر ہوتا ہوں۔ اب اگر میں یہاں آؤں نہیں تو مجھے کیا معلوم ہوگا کہ اس وقت کس چیز کی ضرورت ہے اور ہمارے پرچے میں کس چیز کو نمایاں ہونا چاہئے؟ اور پھر بسا اوقات جزئی امور میں بھی حضرتؒ سے مشورہ واستفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب میں ملتان میں بیٹھا کس سے مشورہ کیا کروں گا؟

ابھی میں نے نمبر۳ نہیں کہا تھا کہ حضرت نے فرمایا نہیں' نہیں! یہ تجویز غلط ہے' البتہ آئندہ آپ کے (اس ناکارہ کے) مصارف ہمارے ذمہ ہوں گے۔ آپ ریل کے فرسٹ کلاس سے یا ہوائی جہاز سے سفر کریں اور مصارف کا بل دے دیا کریں۔ نیز فرمایا کہ آپ کے ذمہ کام زیادہ رہتا ہے اس لئے ایک آپ کا نائب ہونا چاہئے' جو آپ کی غیر حاضری میں بھی کام کرے۔ جناب لغاری صاحب نے ازراہ شفقت فرمایا کہ نائب ان کو مقرر کردیا جائے۔ یہ تو وہ بھی جانتے تھے کہ وہ کیا نیابت فرمائیں گے؟ تاہم "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کو سوچ کر یہ ناکارہ بھی خاموش ہوگیا' اگر کراچی آنے سے اس ناکارہ کو سبکدوش کردیا جاتا تو میں جانتا تھا کہ دو چار مہینے بعد بینات سے بھی رشتہ کاٹ دیا جاتا' اور یہ میرے لئے جان وتن کا رشتہ کٹ جانے کے مترادف ہوتا' مگر میرے حضرتؒ کی ادائے چارہ فرمائی نے نہ صرف اس رشتہ کو مزید مستحکم کردیا بلکہ اس ناکارہ کے ذمہ جو مصارف کا بار تھا اس کا بھی مداوا فرمادیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

بینات کے بصائر وعبر' حضرتؒ تحریر فرماتے تھے' اور یہ ناکارہ اسے صاف کرکے کتابت کے لئے دے جاتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ بصائر وعبر میری روانگی کے بعد

تحریر فرمائے جاتے' ایک دفعہ ایسا ہی اتفاق ہوا۔ جب پرچہ چھپ کر میرے سامنے آیا تو بصائر وعبر کے نیچے یہ آیت کریمہ درج تھی:

هذا بصائر من ربكم

میں اس آیت کو پڑھ کر بڑا تلملایا' لیکن کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا' اگلے مہینے کے بصائر وعبر' میری موجودگی میں تحریر فرمائے' ان پر بھی یہ آیت کریمہ درج تھی۔ میں نے آیت حذف کردی' پرچہ چھپ کر سامنے آیا تو آیت کا حذف کرنا حضرت کو ناگوار گزرا' چنانچہ اس سے اگلے مہینے جب حضرت نے بصائر وعبر تحریر کرکے بھیجے تو یہ آیت کریمہ پھر تحریر فرمائی اور صاحبزادہ گرامی کے ہاتھ یہ پیغام بھی بھیجا کہ یہ آیت حذف نہ کی جائے۔ حضرت نماز عصر سے فارغ ہوکر ابھی اپنی جگہ تشریف فرما تھے کہ یہ ناکارہ حاضر خدمت ہوا(اس ناکارہ کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ جب حضرتؒ مدرسہ میں تشریف فرما ہوتے تو عصر کے فوراً بعد حضرتؒ کے اٹھنے سے پہلے ان کی خدمت میں پہنچ جاتا) اور عرض کیا کہ صاحبزادہ کے ہاتھ یہ پیغام موصول ہوا تھا کہ آیت حذف نہ کی جائے' میں نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی کسی تحریر میں پڑھا ہے کہ یہ بھی ایک طرح سے قرآن کریم کی تحریف ہے' سوال یہ ہے کہ آیت کریمہ هذا بصائر من ربكم کا اشارہ کیا آپ کے بصائر وعبر کی طرف ہے؟ حضرتؒ نے تامل کے بعد فرمایا' پھر رہنے دیجئے۔

اس ناکارہ کے نزدیک یہ حضرتؒ کی تواضع' للّٰہیت وانابت اور رجوع الی الحق کی بلند ترین مثال ہے۔ حضرتؒ کے علم وفضل کے سامنے اس ناکارہ کی وہ حیثیت بھی نہیں تھی جو آفتاب کے سامنے ذرے کی ہوسکتی ہے' اس کے باوجود حضرتؒ نے اس ناکارہ کی عرضداشت کو قبول فرمالیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس گستاخی پر پتہ ہی کاٹ دیتا۔ افسوس ہے کہ بہت سے دینی رسائل میں یہ بے احتیاطیاں ہورہی ہیں' اور قرآن کریم کی آیات مقدسہ کو پرچوں کی زینت کے لئے بے محل چسپاں کیا جاتا ہے' نہیں معلوم کہ ان حضرات کو کوئی ٹوکنے والا نہیں یا قلوب میں رجوع الی الحق کی استعداد نہیں رہی۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

میرے والد ماجد ایک عرصہ سے حج کے لئے کوشاں تھے' مگر قرعہ میں ان کا نام نہیں نکلتا تھا' حضرتؒ سے عرض کیا گیا تو ارشاد فرمایا کہ کراچی سے درخواست دی جائے' اگر نہ نکلی تو کوئی دوسری صورت کریں گے۔ حق تعالیٰ شانہ نے محض لطف وعنایت سے اس ناکارہ کے لئے بھی ایک سال پہلے والد ماجدؒ کی رفاقت کا انتظام کردیا تھا' چنانچہ دونوں نے کراچی سے درخواست دی اور وہ حسب دستور نہیں نکلی۔ حضرتؒ نے جناب حافظ فرید الدین صاحب مرحوم سے فرمایا' وہ ان کاموں میں موفق للخیر تھے' نہ جانے کتنے لوگوں کے حج کا ثواب ان کے نامۂ عمل میں درج ہے' موصوف نے چند دن میں نہ صرف کاغذات مکمل کرادیئے بلکہ جہاز کی تاریخ بھی لے کر دے دی۔ ہمارا سفر سفینۂ حجاج سے تھا۔

حضرتؒ نے ہماری روانگی سے پہلے مجھے گھر پر بلایا' تنہائی میں مجھے چند نصیحتیں فرمائیں' کچھ مسائل سمجھائے اور خصوصی ارشاد یہ فرمایا:

"وہاں جاکر خرچ کے معاملہ میں بخل نہ کرنا' تمہیں جتنی رقم کی ضرورت ہو مجھ سے لے لینا' وہاں پر میں بڑا سیٹھ ہوتا ہوں۔"

الحمد للہ! حضرت کی وصیت کے مطابق خرچ میں خوب توسع سے کام لیا' ان دنوں سترہ سو روپے کل جمع کرائے جاتے تھے' قریباً آٹھ سو ریال زر مبادلہ ملتا تھا' سعودی سو ریال ہمارے ایک سو آٹھ روپے کے برابر تھے۔ میں ایک ہزار روپیہ مزید ساتھ لے گیا تھا اور ایک ہزار وہاں اپنے رفیق سے لے لیا اور واپسی میں خریدنے کی چیز سوائے کتابوں کے کچھ نہیں لایا۔ بہرحال حضرتؒ سے پیسے لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ لیکن حضرت کا یہ فقرہ جب سے اب تک کانوں میں برابر گونج رہا ہے۔

"تمہیں جتنے پیسوں کی ضرورت ہو مجھ سے لے لینا وہاں میں بڑا سیٹھ ہوتا ہوں۔"

اس وقت تو اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوا' لیکن اب کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں نے حضرتؒ کے وہاں کے تبرک سے محروم رہ کر کہیں غلطی تو نہیں کی؟ معلوم نہیں کہ میرا یہ خیال بربنائے محبت وعقیدت ہے؟ یا بربنائے حرص و آز؟ کیونکہ آدمی جس قدر بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کی حرص و آز اور طول امل اسی نسبت سے جوان ہوتی رہتی

ہیں۔ غالباً حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مواعظ میں کہیں یہ لطیفہ پڑھا تھا کہ ایک بادشاہ کسی بزرگ کی زیارت کو گئے' انہوں نے بادشاہ کو بہت سی نصیحتیں فرمائیں' بادشاہ نے عقیدت کی بناء پر کچھ نذرانہ پیش کیا' انہوں نے لینے سے انکار کردیا۔ بادشاہ کے دل میں بزرگ کی عقیدت اور بھی بڑھ گئی' اس وقت کے شیخ الاسلام بھی بادشاہ کے ساتھ تھے' ان بزرگ سے بادشاہ کی نیاز مندی و عقیدت کی کیفیت دیکھ کر شیخ الاسلام کے دل میں حسد پیدا ہوا اور یہ حدیث پڑھی:

یھرم ابن آدم ویشب فیہ خصلتان: الحرص وطول الامل۔

(آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور دو خصلتیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں:
ایک حرص اور دوسری لمبی امیدیں)

اس حدیث کے ذریعہ شیخ الاسلام دراصل ان بزرگ پر چوٹ کرنا چاہتے تھے کہ ان دو بیماریوں کا جوان ہونا تو حدیث سے ثابت ہے' اس لئے بزرگ کا استغناء کا مظاہرہ محض ظاہرداری اور تصنع ہے۔

وہ بزرگ بھی شیخ الاسلام کا مطلب سمجھ گئے' انہوں نے فرمایا: "مولانا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مقدس سر آنکھوں پر! مگر جوان وہی چیز ہوتی ہے پہلے پیدا بھی ہوچکی ہو' اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ دونوں بیماریاں یہاں "پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ ان کے جوان ہونے کا کیا سوال؟" پھر فرمایا' "مولانا! برا نہ منائیں تو ایک حدیث میں بھی سنادوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

العلماء ورثۃ الانبیاء مالم یخالطوا السلطان'
فاذا خالطوھم فاحذروھم فانھم لصوص الدین۔

"علماء انبیاء کے وارث ہیں بشرطیکہ اہل اقتدار سے اختلاط نہ رکھیں'
جب وہ ان سے اختلاط کریں تو ان سے ڈرو کہ وہ دین کے چور ہیں۔"

اسی سال ۱۳۸۸ھ کے حج کا قصہ ہے۔ ایک دن نماز عصر کے بعد مسجد حرام میں حضرتؒ نے اس ناکارہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا آؤ تمہیں اپنے ایک دوست سے ملا کر لاؤں۔ ان دنوں حرم شریف میں کنکریٹ کا فرش ہوتا تھا اور اکابر اہل علم کی خاص خاص جگہیں گویا متعین ہوتی تھیں۔ ان کے متعلقین اور دوست واحباب 'جن کو ملاقات کرنی ہوتی تھی ان کے ڈیروں پر پہنچ جاتے تھے۔ حضرت مجھے اس جگہ جہاں آب زمزم شریف کی سیڑھیاں ہیں' لے گئے' غالباً یہ بزرگ شیخ حسن مشاط مالکی تھے۔ مگر وہ اپنے ڈیرے پر موجود نہیں تھے۔ اس لئے ہم واپس آگئے۔ آتے ہوئے حضرتؒ نے بتایا کہ یہ میرے بڑے قدیم دوست ہیں اور آج سے تیس سال پہلے انہوں نے مجھ سے حدیث کی اجازت لی تھی۔ یہ ناکارہ منہ پھٹ گستاخ تو تھا ہی کہ

ع کرمہائے تو مارا کرد گستاخ

نہایت بے تکلفی سے عرض کیا "اور حضرت! ہمیں تو آج تک نہیں ملی۔" حضرتؒ خوب ہنسے اور پھر عربی میں فرمایا۔ اجزتکم بجمیع مرویاتی' وساکنبها بالمدينة المنورة' انشاء الله۔

اس ناکارہ کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ نہ تو اپنی وہ سندیں جو مدرسہ سے ملی تھیں' انہیں محفوظ رکھا' نہ اکابر سے سند اجازت حاصل کرنے کا کبھی شوق ہوا۔ بس یہ خیال رہتا تھا کہ جب اپنے کو آتا جاتا کچھ نہیں تو سند لے کر کیا کریں گے؟ اس کے باوجود اس ناکارہ کو تین اسانید اجازت گویا زبردستی مل گئیں۔ ایک میرے حضرت بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے' دوسری حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ علیہ سے۔ اس کا قصہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کی کامیابی کے بعد یہ ناکارہ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے تحریک کی کامیابی پر اس ناکارہ کو بہت ہی مبارکباد دی' مٹھائی کھلائی' اور جناب مولانا محمد تقی عثمانی زید مجدہ سے سند حدیث لکھوا کر اور اس پر اپنے دستخط ثبت فرما کر مجھے مرحمت فرمائی۔ تیسری سند سیدی و مرشدی قطب العالم برکۃ

العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ سے حاصل ہوئی۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ جس سال حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے فیصل آباد میں اعتکاف فرمایا۔ وہاں کے شیخ الحدیث جناب مولانا نذیر احمد صاحب زید مجدہم نے تحریک کی کہ جتنے علماء یہاں موجود ہیں ان کو حضرت شیخؒ کی طرف سے اجازت حدیث ملنی چاہئے۔ چنانچہ علماء کی ایک فہرست تیار کی گئی' اس ناکارہ کو بھی "ایں ہم بچہ شتراست" سمجھ کر اس میں شامل کرلیا گیا' عید الفطر کے دن حضرت شیخؒ نے سب کو مسلسلات کی اجازت دی اور سند اجازت مرحمت فرمائی گئی۔

اسانید کے بارے میں اگرچہ یہ ناکارہ لاابالی تھا مگر حضرت بنوریؒ کی سند چونکہ حرمین سے نسبت رکھتی تھی اس لئے اس ناکارہ نے اس کو ایک مقدس دستاویز سمجھ کر برکت کے لئے فریم کروالیا۔ جس کا عکس اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

اس ناکارہ نے اپنے قارئین کا بہت سا وقت لے لیا۔ آپ سے اب رخصت ہوتا ہوں اور اس سے پہلے دو واقعے مزید سنانا چاہتا ہوں۔

وفات سے ایک سال قبل حضرت بنوریؒ کو قلب کا عارضہ ہوگیا تھا' ڈاکٹروں نے ملاقات بھی بند کر رکھی تھی' یہ ناکارہ کئی دن سے کراچی آیا ہوا تھا' لیکن زیارت سے محروم تھا' ایک دن حضرتؒ کے خادم اور اس ناکارہ کے مشفق بزرگ جناب حاجی عبداللہ صاحب نے اس ناکارہ سے اپنے مخصوص پٹھانی لہجے میں فرمایا کہ "مولوی صاحب! تم مولانا سے نہیں ملا؟" میں نے کہا "حاجی صاحب! حضرت باہر تشریف نہیں لاتے اور گھر پر زحمت دینے کی مجھے جرات نہیں ہوتی" (گیارہ سال تک حضرتؒ سے تعلق رہا' بے تکلفی رہی' لیکن اس پورے عرصہ میں ایک دفعہ بھی اس ناکارہ نے گھر جاکر حضرت کے دروازے کی کنڈی نہیں کھٹکھٹائی' تاکہ حضرت کو میری وجہ سے بے جا زحمت نہ ہو) یہ اذان فجر کا وقت تھا اور حضرتؒ کا معمول تھا کہ اس وقت تفریح کے لئے پارک میں تشریف لے جاتے تھے۔ حاجی صاحب نے کہا' "چلو! مولانا باہر جارہا ہے' ان سے مل لو۔" ادھر حاجی صاحب جلدی سے گئے اور حضرتؒ سے عرض کیا کہ وہ کئی دن سے آیا ہوا ہے اور آپ سے نہیں مل سکا۔

المدرسة العربية الإسلامية
كراتشي رقم (٥)
باكستان

تاريخ ....
نمبر ....
تيليفون 46962-41720

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى خصوصًا على سيدنا سيد العالمين محمد المصطفى وآله وصحبه ما شفى وكفى.

أما بعد فقد أجزت أخي في الله العالم الصالح الجليل الشيخ محمد يوسف اللديانوي بأسانيدي في الحديث إجازة وقراءة لا يسع الوقت تفصيلها وأكبر شيوخ التلقي والقراءة مسند الوقت المحدث الكبير إمام العصر مولانا الشيخ محمد أنور شاه الكشميري المتوفى سنة ١٣٥٢ هـ وأكبر شيوخي في الإجازات علامة العصر المحقق محمد زاهد الكوثري نزيل القاهرة المتوفى سنة ١٣٧١ هـ وأسانيدي العالية عن المحدثة أمة الله بنت مسند العصر المحدث الشاه عبد الغني رحمهما الله وقد أجزت الأخ المشار إليه بجميع مروياتي بشرط التثبت والإتقان والتقوى من الشروط المعتبرة عند أهل الحديث وأسأل الله التوفيق والتسديد وأرجو الأخ الإسلامي من دعواته الصالحة والله سبحانه يتولانا برعايته وعنايته وهو حسبنا ونعم الوكيل.

محمد يوسف بن السيد محمد زكريا الحسيني البنوري

بالمسجد النبوي الكريم في الصف الأول بقرب المواجهة الشريفة قبيل أذان المغرب يوم الثلاثاء ٢٦ ذي الحجة الحرام سنة ١٣٨٨ هـ
عفا الله عنه وعافاه وجعل آخرته خيرًا من أولاه

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى. اما بعد: فيقول العبد المفتقر الى رحمة ربه القوى عبده زكريا بن العلامة حافظ القران والحديث محمد يحيى الكاندهلوى نور الله مرقده أن أخا لى فى الدين المولوى محمد يوسف بن حاجى الله بخش سمع منا وقرئ على من الحديث المسلسل بالاولية ومن اوائل الجامع الصحيح لامير المؤمنين فى الحديث الامام البخارى وطلب منى اجازتها واجازة بقية الامهات الستة فأجيزه بالشروط المعتبرة عند أئمة الحديث من استقامة العقائد والاعمال على طريقة السلف من الصحابة والتابعين واتباعهم وأوصيه بتقوى الله و الاعتصام بسنة سيد الأنام على صاحبها الف الف صلوة وسلام و الاجتناب عن المعاصى البدعات السيئة والتبعد عن صحبة المبتدعين والتفريق بين المسلمين وأن يحترز عن طلب لذات الدنيا وحماتها وعن إساءة الأدب باكابر الامة وهداتها من الصحابة والتابعين والفقهاء المجتهدين والمشائخ العارفين وأن لاينسانى ومشائخى فى دعواته الصالحة وأسأل تعالى ان يوفقنى وإياه لما يحب ويرضاه

ليلة الخامس والعشرين من رمضان سنة ١٤٠٠ھ

بمعتكف مسجد دار العلوم فيصل آباد باكستان

حضرت نے بلا بھیجا۔ حضرت گاڑی پر سوار ہو رہے تھے۔ سلام و دعا کے بعد فرمایا۔

"آپ جتنے دن یہاں ہیں اس وقت آجایا کیجئے اور ہمارے ساتھ سیر کے لئے چلا کیجئے۔"

چنانچہ رشتہ گلدستہ کی طرح یہ ناکارہ بھی حضرتؒ کے ساتھ پیوستہ ہو گیا۔ حاجی شفیع اللہ مرحوم گاڑی لاتے، عموماً چار پانچ آدمی ہوتے اور کبھی بڑی گاڑی ہوتی تو زیادہ بھی ہو جاتے، ہل پارک جاکر حضرتؒ فجر کی نماز خود پڑھاتے، پھر کچھ چائے پانی کا شغل ہوتا، جو حاجی شفیع اللہ صاحب التزاماً ساتھ لے جاتے۔ ایک دن حسب معمول حضرتؒ نے نماز پڑھائی اور دعا کے بعد ارشاد فرمایا "جانتے ہو میں نے کیا دعا کی ہے؟ عرض کیا گیا کہ حضرتؒ نے جہری دعا تو فرمائی نہیں، اس لئے ہمیں کیا معلوم کہ کیا دعا فرمائی ہے؟ فرمایا میں نے یہ دعا کی ہے:

"یا اللہ! جس طرح آپ نے ہمیں یہاں جمع کر دیا ہے، اسی طرح جنت میں بھی جمع کر دیجئے۔"

حضرت کی اس دعا پر ہم لوگوں کو جتنی خوشی ہونی چاہئے تھی ظاہر ہے، اگرچہ اپنی سیاہ کاریوں سے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے، لیکن حضرتؒ کی اس دعا سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ محض اپنے لطف و احسان سے حضرتؒ کی دعا کے طفیل ہمیں بھی حضرتؒ کی جوتیوں میں جگہ عطا فرما دیں تو ان کے فضل سے کیا بعید ہے۔

حضرت کی بیٹھک میں جب کبھی تنہائی میں شرف بازیابی ہوتا تو حضرتؒ اس ناکارہ کے بارے میں بعض اوقات ایسے الفاظ ارشاد فرماتے، جو اس ناکارہ کی حیثیت سے بہت ہی بلند و بالا ہوتے تھے۔ یہ ناکارہ حضرت کے ایسے الفاظ کو سن کر محجوب ہو جاتا اور مالک کی ستاری کے قربان جاتا کہ اس ناکارہ کی وہ گندگیاں، جو اس مالک کے علم میں ہیں ان پر کیسا پردہ ڈال دیا ہے، ورنہ کوئی شریف آدمی اس ناکارہ کو اپنے پاس بھی نہ بیٹھنے دیتا۔ ایک بار حضرتؒ نے بہت ہی شفیقانہ انداز میں بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، اور فرمایا "میں تم کو اور مفتی ولی حسن کو اپنے مدرسہ کا مدار سمجھتا ہوں۔" اور پھر ایسی نصیحتیں فرمائیں جس طرح شفیق باپ اپنے بیٹے کو وصیت کر رہا ہو، اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن زبیر اور ان

کے والد ماجد حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ذکر فرمایا۔ جو امام بخاریؒ نے باب برکۃ مال الغازی حیا ومیتا میں روایت کیا ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے پہلے اپنے صاحبزادے کو قرضوں کے ادا کرنے کی وصیت فرمائی اور فرمایا:

یا بنی ان عجزت عن شیئی منہ فاستعن علیہ مولائی۔

(بیٹا اگر اس کی کسی چیز سے عاجز آجاؤ اور وسائل ساتھ نہ دیں' تو اس کے لئے میرے مولا سے مدد لینا)

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں سمجھا کہ میرے مولا سے ان کی کیا مراد ہے؟ اس لئے میں نے عرض کیا:

یا ابہ من مولاک قال : اللہ

ابا جان آپ کے مولا کون ہیں؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے ان کے قرض کی ادائیگی میں جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو میں کہتا۔

یا مولی الزبیر اقض عنہ دینہ "۔اے زبیر کے مولا قرضہ ادا کردیجئے۔"

(صحیح بخاری۔ ص ۴۴۱' ج ۱)

اس واقعہ کو ذکر کرکے میرے حضرتؒ نے مجھ سے فرمایا:

"تمہیں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے' میرے مولا سے مدد لینا اور یہ کہنا اے محمد یوسف بنوریؒ کے مولا میرا یہ کام کردے۔"

یہ میرے حضرت کا خاص عطیہ تھا' جو حضرتؒ نے اس خاص انبساط کی حالت میں عطا فرمایا اور الحمد للہ حضرتؒ کا یہ نسخہ کیمیا بہت سے مشکل مواقع میں کام آیا۔

اس ناکارہ نے حضرتؒ سے (اسی طرح کسی اور بزرگ سے بھی) کبھی اپنی کسی کتاب پر تقریظ یا پیش لفظ لکھنے کی درخواست نہیں کی' لیکن میری دو کتابیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک تو حضرت شیخ و مرشد قطب العالم مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کی کتاب "حجتہ الوداع و عمرات النبی ﷺ" کا ترجمہ۔ کہ یہ ترجمہ حاجی محمد یوسف صاحب رنگ والے کی فرمائش پر کیا گیا تھا' اور انہی کی فرمائش پر حضرت بنوریؒ نے اس پر مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا۔

دوسرے حضرتؒ کے محبوب استاذ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ کی آخری کتاب "خاتم النبیین" کا ترجمہ' جو اس ناکارہ نے حضرتؒ کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ ترجمہ پہلے ماہنامہ بینات میں بالاقساط شائع ہوا۔ بعد میں جب اسے کتابی شکل میں (عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی جانب سے) شائع کیا گیا تو اس ناکارہ نے حضرتؒ سے اطلاعاً" عرض کیا کہ کتاب کی کاپیاں پریس جا رہی ہیں۔ اس پر حضرتؒ نے بے ساختہ فرمایا کہ مجھے اس پر مقدمہ لکھنا ہے۔ عرض کیا "میری طرف سے اس کی کوئی فرمائش نہیں۔" فرمایا "نہیں! مجھے آپ کا حق ادا کرنا ہے۔"

چنانچہ حضرتؒ نے اس پر طویل مقدمہ رقم فرمایا' اور ترجمہ کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا اسے ذیل میں بطور تبرک نقل کرتا ہوں' کہ حضرتؒ کے حسن ظن کو حق تعالیٰ شانہ قبول فرمائیں تو یہ اس ناکارہ کے لئے شفاعت کی دستاویز ہے۔

"حضرت رحمہ اللہ نے اپنی آخری زندگی میں مسلمانان کشمیر کو اس فتنے سے بچانے کے لئے آخری تصنیف فارسی زبان میں تالیف فرمائی' کشمیر میں فارسی زبان عام تھی اور وہاں کی علمی زبان فارسی ہی تھی' اس لئے آیت خاتم النبیین کی شرح فرمائی' حضرت مرحوم کا دل و دماغ جس طرح علوم و معارف سے بھرا ہوا تھا' ظاہر ہے کہ قلم سے اسی انداز کے علوم و حقائق نکلیں گے' زبان فارسی ہو یا اردو علوم انوری کے جواہرات اپنی پوری تابانی کے ساتھ ظاہر ہوں گے۔ ہر شخص نہ اس کی تہوں تک پہنچ سکتا تھا' اور نہ یہ علوم اس کے قبضہ میں آسکتے تھے۔ اس کے لئے حسب ذیل امور کی ضرورت تھی۔

○ عام فہم شستہ اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ ○ مترجم ذکی و محقق عالم ہو کہ علمی اشارات و لطائف کو بخوبی سمجھتا ہو۔ ○ حضرت امام العصر رحمہ اللہ کے طرز تحریر سے مناسبت رکھتا ہو' اور اس کے سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ ○ قادیانیت کے موضوع سے دلچسپی رکھتا ہو اور قادیانی مذہب کے لٹریچر سے پوری طرح باخبر ہو۔ ○ علمی دقائق کی تشریح پر اردو میں قادر ہو' اور قلمی افادات سے عوام کو مستفید بنانے کی قابلیت رکھتا ہو۔ ○ تالیفی ذوق رکھتا ہو' تصنیفی ملکہ حاصل ہو' تاکہ مناسب عنوانات سے مضمون کو آسان کرسکتا ہو۔ ○ حضرت امام العصر رحمہ اللہ سے انتہائی عقیدت و محبت ہو کہ مشکلات حل کرنے میں گھبرا نہ جائے اور غور و خوض سے اکتا نہ جائے۔ ○ محنت و عرق ریزی کا عادی ہو' دل کا درد رکھتا ہو' قادیانیت سے بغض ہو۔ ○ اپنے علمی کاموں میں محض رضا حق کا طالب ہو' حب جاہ و ثنا سے بالاتر ہو۔ عام علمی مہارت اور دینی ذوق کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ عربیت و بلاغت کے سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہو اور معانی و بلاغت کی نکتہ سنجیوں سے واقف ہو۔

یہ دس امور تھے جو ارتجالاً زبان قلم پر آگئے' "عشرہ کاملہ" کے بعد اب مترجم صحیح ترجمہ پر قدرت پاسکتا ہے۔ مجھے کسی سے توقع نہ تھی کہ یہ خدمت صحیح طور پر انجام دے سکے گا' میری خود بھی ہمت نہ تھی کہ اس لق و دق صحراء میں قدم رکھوں' اگرچہ عرصہ دراز سے احساس تھا کہ اس کے ترجمہ و تشریح کی ضرورت ہے' جس وقت شباب تھا اور فرصت بھی تھی' دماغ میں تازگی تھی اور عہد انوری کی صحبتوں کی یاد تازہ تھی اس وقت توجہ نہ کرسکا اور اس سعادت سے محروم رہا' حالانکہ "نفحۃ العنبر" میں ۴۵ برس پہلے لکھ چکا تھا کہ خدا کی قسم! انوری علوم کے باغ و بہار اور وہبی علوم کا نمونہ اگر دیکھنا ہو تو رسالہ "خاتم النبیین" ملاحظہ کیا جائے۔

الحمد للہ کہ یہ سعادت میرے ہم نام اور میرے ہم کام میرے مخلص

رفیق کار مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی کے حصہ میں آئی جو اس "عشرہ کاملہ" سے متصف تھے' باکمال تھے' اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ اس کے ترجمہ و تشریح کے فرض سے نہایت کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہوئے' اور اس علمی و دینی خدمت کا حق ادا کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بارگاہ قدس میں قبول فرمائے' اور مترجم کے لئے سعادت دارین کا وسیلہ بنائے' اور حضرت مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کی شفاعت مقبولہ کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اصل رسالہ "خاتم النبیین" حضرت مولف کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا' اور اس ناکارہ کا یہ ترجمہ جس پر میرے حضرت نے ازخود مقدمہ تحریر فرمایا تھا' حضرت کی وفات کے اگلے دن چھپ کر آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس ناکارہ کو حضرت کے ایک رسالہ "ایداء اکلبد" پر افتتاحیہ لکھنے کی سعادت بھی میسر آئی' بطور یادگار اس کو بھی درج ذیل کیا جاتا ہے۔

افتتاحیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت الشیخ مولانا سید محمد یوسف بنوری۔ دامت برکاتہم۔ کے والد ماجد العارف المحقق العلامہ حضرت مولانا سید محمد زکریا بنوری کا سانحۂ ارتحال ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ (۵ جون ۱۹۷۵ء) کو پیش آیا جب کہ اس سے قریباً پونے تین ماہ پہلے ۴ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ (۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء) کو حضرت کی لخت جگر سیدہ فاطمہ خدا کو پیاری ہوچکی تھیں۔ ان دونوں والد وما ولد کے فراق پر جو نقوش غم و تاثرات الم حضرت کی غم آگیں چشم قلم سے اشک خون بن کر ٹپکے وہ ماہنامہ "بینات" کے دامن میں شذرۂ بصیرت اور درس عبرت کی حیثیت سے محفوظ ہیں۔ بصائر و عبر کی یہ امانت اس رسالہ کے ذریعہ قارئین

کے سپرد کی جارہی ہے، اسی کے ساتھ حضرت اقدس محدث اعظم الشیخ الامام الحاج مولانا محمد زکریا صدیقی کاندھلوی ثم المدنی مدت فیوضہم اور حضرت حکیم اسلام مولانا الشیخ قاری محمد طیب صدیقی مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے تعزیت نامے اور حضرت مولانا فضل محمد سواتی مدظلہ کا مرثیہ بھی شامل کیا جارہا ہے — اس اشاعت سے مقصد ایک تو اداۓ حقِ رفتگاں ہے، دوسرے صالحین کی یاد تذکار موجب نزول رحمت ہے، تیسرے اس سے مرحومین کی اقتدار کا داعیہ پیدا ہوگا، چوتھے اولیائے سابقین کے جو واقعات اس افسانوی دور میں افسانے نظر آتے تھے ان سے استبعاد رفع ہوگا۔ پانچویں، ہمارے اکابر کی عالی حوصلگی کا اندازہ ہوگا کہ "دریا فروش کر دند و آروغ نیاوردند" ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم

محمد یوسف لدھیانوی

ماہنامہ "بینات" نیو ٹاؤن، کراچی

۲۵، ربیع الآخر ۱۳۹۵ھ

حق تعالیٰ شانہ حضرتؒ کو اپنی رحمت کے شایان شان جزائے خیر عطا فرمائیں اور حضرتؒ کے درجات بلند فرمائیں اور قارئین کے ساتھ اس ناکارہ کو بھی اپنے مقبول بندوں کے ساتھ ملحق فرمادیں۔

فاطر السمٰوات والارض انت ولیی فی الدنیا
والآخرۃ، توفنی مسلمًا والحقنی بالصالحین،
و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قطب الارشاد حضرت مولانا عبد الہادیؒ

۳۰ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ (۳ اگست ۱۹۷۸ء) جمعہ وہفتہ کی درمیانی شب کو قریباً تین بجے قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا عبد الہادی دین پوری کا وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مرحوم اکابر کے علوم وانفاس کے وارث' زہد وتوکل' ایثار وقناعت اور حب للہ وفی اللہ کے امام تھے۔ اصلاح وتربیت اور تزکیہ نفوس کے لئے مرجع انام تھے۔ ان کی پوری زندگی جہاد ومجاہدہ' جرات ومروت' اخلاص ویقین اور بے تکلفی وسادگی سے عبارت تھی۔ افسوس ہے کہ ان کی رحلت سے اصلاح وارشاد کی مسند خالی ہوگئی۔ حق تعالیٰ شانہ حضرت مرحوم کو درجات عالیہ نصیب فرمائے۔

اللهم اغفر له وارحمه' وعافه واعف عنه' واكرم نزله'
ووسع مدخله' وابدله داراً خيرا من داره' واهلا خيراً من
اهله' بحرمة سيد المرسلين' وخاتم النبيين وامام
المتقين سيدنا محمد صفوة البرية صلى الله عليه
وسلم و آله واصحابه واتباعه اجمعين۔

(بینات ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۸ء)

حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلوی رحؒ

مخدوم العلماء پیر طریقت و شریعت، شمس العارفین، شیخ التفسیر مولانا محمد عبداللہ صاحب بہلوی شجاع آبادی ۲؍ جنوری بمطابق ۲۲؍ محرم بروز سوموار رات بعد نماز عشاء اس جہان فانی سے رحلت فرماگئے۔ نماز جنازہ ہزاروں علماء اکابر مشائخ فضلاء صوفیاء اور دانشوروں کی موجودگی میں حضرت امیر العلماء مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی نے پڑھائی اور آپ کے قائم کردہ مدرسہ اشرف العلوم کی مسجد کے قریب اسلاف کی یادگار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہزاروں اشک بار آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کردیا گیا۔ آپؒ نے دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ سے کئی ماہ تک اسباق پڑھے اور حدیث فخر الاماثل خاتم المحدثین مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے حاصل کی۔ حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سلسلہ چشتیہ کی خلافت حاصل کی، روحانی اکتساب فیض قطب العالم شیخ المشائخ مولانا فضل علی قریشی مسکین پوری رحمہ اللہ سے حاصل کیا اور تمام سلاسل روحانیہ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ کی اجازت حاصل کی۔ رئیس المفسرین مولانا حسین علی واں بھچراںؒ سے دورہ تفسیر پڑھا اور ان کے سلسلہ نقشبندیہ قادریہ کے مجاز ہوئے۔ عرصہ ۶۰ سال تک فارغ التحصیل علماء فضلاء کو رمضان المبارک میں دورۂ تفسیر پڑھاتے رہے آپ کا حلقہ مریدین ملک کے دور دراز کے حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ تیس سے زائد کتب تفسیر، کتب حدیث، کتب علوم تصوف کے مصنف تھے۔ ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا، جنازہ میں تقریباً چالیس ہزار سے زائد علماء اور عوام وخواص نے شرکت کی۔ حضرت درخواستی مدظلہٗ نے حضرت بہلویؒ کی وفات کو مولانا شیخ بنوریؒ کی وفات کے بعد امت کے لئے دوسرا عظیم روحانی وعلمی صدمہ قرار دیا، آپ نے فرمایا مجھے ان اکابرین کی وفات سے ناقابل تلافی صدمہ پہنچا۔ پس ماندگان میں تین صاحبزادے اور چار لڑکیاں اور ایک بیوہ ہے۔ بڑے

صاحبزادے مولانا الحاج عبدالحیٔ صاحب مدظلہٗ کو حضرت درخواستی نے آپ کا جانشین مقرر کیا' اور ان کی دستار بندی فرمائی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی روحانی خانقاہ اور علمی فیض کو ہمیشہ ہمیشہ قائم دائم رکھے۔ اور پس ماندگان کو حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے نقش قدم پر چلائے (آمین)

(بینات ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۸ء)

مولانا فضل اللہ شاہ مونگیریؒ

۲۵ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ ۔ ۲۳ مئی ۱۹۷۹ء کو علی گڑھ میں ایک باخدا عالم مولانا شاہ فضل اللہ صاحب کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم .... حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس سرہٗ بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پوتے تھے۔ ظاہری اور باطنی علوم کا اکتساب اپنے جد امجد کے زیر تربیت کیا' ایک عرصہ تک "جامعہ عثمانیہ" حیدر آباد میں مولانا مناظر احسن گیلانی کے رفیق اور ان کے بعد صدارت شعبہ اسلامیات میں ان کے جانشین ہوئے۔ موصوف کا اہم علمی کارنامہ امام بخاریؒ کی مشہور کتاب "الادب المفرد" کی مبسوط شرح ہے جو "فضل اللہ الصمد" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ شاہ صاحب کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ ان کی چار صاحبزادیاں ہیں' دو علی گڑھ میں ہیں اور دو کراچی میں۔ ان کی ایک صاحبزادی نے غزوات نبوی پر اور دوسری نے حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ مرحوم کی عمر ستر سے متجاوز تھی اور وہ علم و فضل اور مجد شرافت میں اپنے اکابر کا نمونہ تھے۔ حق تعالیٰ شانہ ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں عباد صالحین کے زمرہ میں شامل فرما کر عنایات خاصہ کا مورد بنائے۔

(بینات رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق اگست ۱۹۷۹ء)

مولانا انعام کریمؒ

۱۳؍ رجب ۱۳۹۹ھ مطابق ۸ جون ۱۹۷۹ء کو حضرت مولانا انعام کریم مہاجر مدنی مدینہ طیبہ میں واصل رحمت ہوئے۔ مرحوم' حضرت اقدس شیخ الہندؒ کے نواسے تھے۔ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ بعد ازاں ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور حضرت مدنیؒ کے برادر اکبر مولانا سید احمدؒ کے قائم کردہ "مدرسہ علوم شرعیہ" سے منسلک ہو گئے۔ ابتدائی دور میں مشکلات اور عسر کا بڑے صبر و شکر کے ساتھ مقابلہ کیا' اخیر عمر میں حق تعالیٰ نے بہت راحت و آرام میسر فرما دیا تھا' کچھ عرصہ سے "مدرسہ علوم شرعیہ" کے مکتبہ کے مدیر تھے' وہیں مدرسہ کے کمروں ہی میں قیام تھا۔ مرحوم نہایت خاموش طبع اور معمولات کے پابند تھے۔

حسن صورت' حسن سیرت' حسن لباس' اور حسن ذوق میں ممتاز تھے' حضرت اقدس مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے۔ ہمارے حضرت (مولانا محمد یوسف بنوری) رحمہ اللہ سے عقیدت و محبت کا خصوصی تعلق تھا۔ حضرت بنوریؒ مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے تو قیام اکثر دوسری جگہ ہوتا تھا لیکن بعد عصر مولانا مرحوم کے کمرے میں (جو حرم نبوی کے بالکل قریب تھا) تشریف لے جاتے۔ اکثر شام کی چائے وہاں ہوتی۔ مولانا مرحوم نے بڑے قابل رشک انداز میں زندگی گذاری۔ عمر ستر کے قریب تھی۔ کبر سنی کا ضعف اور کچھ گھٹنوں کی تکلیف ضرور تھی۔ مگر عام صحت بڑی اچھی تھی۔ ۸؍ جون کو حسب معمول نماز مغرب کے بعد حرم نبوی سے اپنی قیام گاہ پر واپس آئے' اچانک دل کا دورہ ہوا' اور جان' جان آفریں کے سپرد کر دی' صبح کو بعد از نماز فجر جنت البقیع میں سلا دیے گئے جو ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی' حق تعالیٰ آغوش رحمت میں جگہ نصیب فرمائے اور مغفرت و رضوان سے مشرف فرمائے۔ آمین

(بینات۔ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق اگست ۱۹۷۹ء)

مولانا اسعد اللہ رح

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے خلیفہ اور مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے سابق ناظم حضرت مولانا اسعد اللہ طویل علالت کے بعد ۱۴ر رجب (۱۳۹۹ھ) مطابق ۱۰ جون (۱۹۷۹ء) جاں بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم کے ساتھ مظاہر علوم کی نصف صدی سے زیادہ کی تاریخ وابستہ ہے' موصوف حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری (قدس سرہٗ) کے زمانہ سے مظاہر علوم کے اساتذہ میں تھے' حضرت مولانا عبداللطیف رحمہ اللہ کے وصال کے بعد مدرسہ کے انتظامی امور بھی آپ کے سپرد تھے۔ مولانا کی جوانی کا ابتدائی دور عجیب بانکپن میں گذرا۔ مگر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کے بعد کایا پلٹ گئی۔ اور صوفی صافی' عارف و مرشد بن گئے۔

مولانا کو فرق باطلہ کے رد اور مباحثہ و مناظرہ کا بھی خاص ذوق تھا۔ انہوں نے آریوں' قادیانیوں اور دیگر گمراہوں کے ساتھ بڑے کامیاب مناظرے کئے اور اپنے حریفوں کو شکست دی۔

شعروسخن اور ادب و انشاء سے بھی مولانا کو خصوصی شغف تھا۔ اردو' فارسی' عربی تینوں زبانوں میں وہ برجستہ اور فی البدیہہ شعر کہا کرتے تھے۔ مزاج میں مزاح وانبساط بھی خوب تھا۔ وہ طلبہ کو لطیفے اور چٹکلے بھی خوب سنایا کرتے تھے۔

حضرت مرحوم طویل عرصے سے صاحب فراش چلے آرہے تھے' سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے مگر تعلق مع اللہ کا یہ عالم تھا کہ خادم آپ کو اٹھاکر لاتا اور جماعت کی صف میں کھڑا کردیتا' حضرت مرحوم پوری نماز قیام وقعود اور رکوع و سجود کے ساتھ ادا فرماتے۔ اور سلام پھیرتے ہی پھر دوسرے کے اٹھانے کے محتاج ہوتے۔ مولانا کی رحلت تمام اہل دین اور اہل قلوب کے لئے خصوصاً ہمارے شیخ (مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم سہارن پوری ثم

مدنی مدظلہ العالی) کے لئے گہرا صدمہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ حضرت مرحوم کو اپنے خاص الخاص مقبول بندوں کی صف میں جگہ نصیب فرمائے اور اپنے قرب و رضا اور درجات عالیہ سے نوازے۔ آمین

(بینات رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق اگست ۹ ۱۹ء)

۲۷

مولانا محمد الحسنی

۱۷؍رجب المرجب' ۱۳ جون کو بعد عشاء عربی کے مایۂ ناز مجلّہ "البعث الاسلامی" ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مدیر شہیر جناب مولانا محمد الحسنی ایک روزہ مختصر سی علالت کے بعد خدا کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون' ان للہ ما اخذ ولہٗ ما اعطیٰ' وکل عندہٗ باجلٍ مسمّیٰ۔

حق تعالیٰ شانہٗ مولانا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے' ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے در گذر فرمائے اور انہیں رحمت ورضوان کے بلند ترین عطایا سے نوازے' **اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ' وعافہ واعف عنہ وابدلہ دارًا خیرًا من دارہ واھلاً خیرًا من اھلہ' اللّٰھم اجزہ احسن ماتجزی بہ عبادک الصلحین المجاھدین المخلصین۔** اور حق تعالیٰ مرحوم کے اہل خانہ کو' ان کی اولاد وغیرہ کو' خصوصاً ہمارے مخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہٗ کو اس سانحۂ کبریٰ پر صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے اور مرحوم کے صاحبزادہ برادرم مولوی عبداللہ کو (جو ماشاء اللہ فارغ التحصیل ہوچکے ہیں) ان کا حقیقی جانشین بنائے۔ اور وہ تمام صلاحیتیں اور خوبیاں جو مرحوم میں ودیعت تھیں بطور موہبت ان کے صاحبزادہ کو عطا فرمائے۔

(بینات رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق اگست ۱۹۷۹ء)

مولانا اسحاق جلیس ندوی رح

مولانا محمد الحسنی مرحوم کا غم ابھی غلط نہیں ہو پایا تھا کہ ان کے بعد ٹھیک انتیسویں دن ۱۵ر شعبان ۱۱ر جولائی کو ان کے رفیق کار مولانا اسحاق جلیس ندویؒ بھی تین چار دن کی مختصر علالت کے بعد عالم آخرت کی طرف منتقل ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا محمد الحسنی مرحوم کے ساتھ مولانا اسحاق جلیس مرحوم ہمارے مخدوم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے گویا دوسرے بازو اور ان کے علمی کاموں کے معاون اور رفیق تھے۔ وہ ایک مدت سے پندرہ روزہ "تعمیر حیات لکھنؤ" سے منسلک تھے۔ (یہ ندوۃ العلماء کا ترجمان پندرہ سال قبل مولانا محمد الحسنی کی ادارت میں جاری ہوا تھا) یہ عجیب اتفاق ہے کہ "تعمیر حیات" کا خصوصی شمارہ جو مولانا محمد الحسنی مرحوم کی یاد میں نکلا اور جس پر ۲۵ر جون و ۱۰ جولائی ۲۹ رجب و ۱۴ شعبان کی تاریخ درج ہے اس میں مولانا اسحاق جلیس مرحوم کا ایک مبسوط افتتاحیہ اپنے رفیق مولانا محمد الحسنی مرحوم کی رحلت پر ہے۔ اور اس سے اگلا دن خود مولانا اسحاق جلیس کی وفات کا دن ہے۔

؎ خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں درجہاں نماند

بعض صدمات ایسے پیش آتے ہیں کہ تعزیت کرنے والوں کو تعزیت کے الفاظ نہیں ملتے۔ ان پے درپے صدمات میں کچھ یہی کیفیت تحیر درپیش ہے۔ حق تعالیٰ مرحوموں کے ساتھ اپنی عطاء ونوازش کا معاملہ فرمائے اور امت کو اپنے دین کے سپاہیوں کا نعم البدل عطا فرمائے۔

گزشتہ سال اسلامی ایشیائی کانفرنس کے موقع پر مولانا محمد الحسنیؒ اور مولانا محمد اسحاق جلیسؒ ندوی کی پہلی اور آخری بار زیارت ہوئی تھی خیال تھا کہ راہ ورسم بڑھے گی مگر افسوس کہ

ع روئے گل سیر ندیدم وبہار آخر شد

(بینات رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق اگست ۱۹۷۹ء)

حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ

۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۱ر اپریل ۱۹۸۰ء بروز جمعہ پاکستان کے مشہور خطیب حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ واصل بحق ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم، دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ، حضرت ــــــــ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کے شاگرد اور حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رشتہ میں عزیز تھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے انہیں بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ جن میں وہ ممتاز تھے۔ ان کی آواز کانوں میں رس گھولتی تھی اور مترنم آواز میں قرآن مجید کی تلاوت وجد آفرین تھی۔ وہ بے بدل خطیب تھے۔ ان کا طرز بیان لب ولہجہ اور انداز تکلم بڑوں بڑوں کے لئے لائق صد رشک تھا۔ وہ مشکل سے مشکل موضوع کو حکایت وتمثیل کے پیرائے میں بڑی آسانی سے ذہن نشین کرادیتے تھے۔ ان کے خطبہ جمعہ کے لئے لوگ دور دور سے کشاں کشاں آتے تھے۔ سالہا سال تک ریڈیو پر ان کا درس قرآن ہوتا رہا۔ لوگ بڑے ذوق وشوق سے سنتے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے مولانا مرحوم دہلی سکریٹریٹ کی مسجد میں خطیب تھے۔ اور مسلمان سرکاری افسران وملازمین پر ان کا گہرا اثر تھا۔ تحریک پاکستان میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قیام پاکستان کے بعد وہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کے شریک کار رہے۔ پاکستان کے ابتدائی دور کی تاریخ اور حضرت علامہ کی مساعی کا جس قدر ریکارڈ ان کے پاس تھا وہ غالباً پاکستان کے کسی شخص کے پاس نہیں ہوگا، راقم الحروف کی تمنا تھی کہ ہماری دینی وملی تاریخ کا یہ قیمتی اور مستند حصہ قلمبند ہوجائے۔ چنانچہ ان کے ہندوستان کے سفر پر تشریف لے جانے سے دو روز قبل ناکارہ نے برادرم محترم مولانا محمد طیب صاحب کشمیری کو مرحوم کی خدمت میں اسی مقصد کے لئے بھیجا (میں خود ان دنوں علیل تھا) اور سہولت کے لئے دس سوالات بھی مرتب کرکے دیئے تھے۔ حضرت مرحوم نے اس کا وعدہ بھی فرمالیا تھا مگر وہ اچانک سفر ہند پر تشریف لے گئے اور افسوس کہ ان کا یہ سفر سفر آخرت

کا مقدمہ ثابت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ع وکم حسرات فی بطون المقابر

مرحوم سیرت طیبہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے ہندوستان کے مشہور شہر مدراس تشریف لے گئے تھے کہ جمعہ کی صبح اچانک دل کا حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ حق تعالیٰ شانہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کی حسنات کو قبول فرمائے۔ انسانی فروگذاشتوں سے درگذر فرمائے اور مرحوم کے صاحبزادگان اور اعزہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(بینات جمادی الاولیٰ۔ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۰ھ مطابق اپریل۔ مئی ۱۹۸۰ء)

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ

۲ رجب ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۷ر مئی ۱۹۸۰ء کو بروز سہ شنبہ دوبئی میں حضرت شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے فارغ التحصیل، حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے شاگرد تھے۔ قرآنی علوم کا استفادہ شیخ وقت حضرت اقدس مولانا حسین علی صاحبؒ واں بھچراں (تلمیذ رشید حضرت گنگوہیؒ) سے کیا۔

مولانا مرحوم اپنی بعض خصوصیات میں منفرد تھے، حق تعالیٰ شانہ نے ان کو قائدانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، بڑے جوانمرد اور کریم النفس تھے۔ شرک وبدعت کے رد میں شمشیر بے نیام تھے۔ حق گوئی میں "لایخافون فی اللہ لومۃ لائم" کا مصداق تھے۔ ایک عالم ان کا شیدا و گرویدہ تھا۔ ان کی تقریر میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اللہ کا شیر دھاڑ رہا ہے۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ان کی گونج تھی اور شرک وبدعت کا ابلیسی نظام ان کی آواز سے لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ اہل اقتدار کو بھی کھری کھری سنانے کے عادی تھے۔ جس کی پاداش میں بار بار انہیں پس دیوار زنداں جانا پڑا۔ ملک کے بہت سے حصے ان کے لئے "ممنوعہ علاقہ" قرار دیئے جاتے۔ ایوبی دور میں ایوب خان کی غلط روش پر انہوں نے روکا ٹوکا تو گیارہ مہینے تک انہیں اپنے مستقر راولپنڈی سے خارج البلد رکھا گیا۔ ایک بار پشاور میں ان پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا لیکن ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی، بلکہ توحید وسنت کی اشاعت کا کام انہوں نے پوری تندہی سے جاری رکھا۔

مولانا مرحوم کا "دورہ قرآن" شہرہ آفاق بن گیا تھا۔ اور ہر سال سینکڑوں علماء اور منتہی طلباء ان سے قرآن کریم پڑھنے کے لئے جوق در جوق آتے تھے۔ طلبہ کے قیام وطعام اور کاغذ قلم تک کا انتظام مولانا مرحوم خود فرماتے تھے اور جو حضرات ان سے استفادہ کرتے، وہ انہی کے رنگ میں ڈھل کر نکلتے۔ اس طرح ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد تھی اور اسی

مناسبت سے ان کا لقب "شیخ القرآن" تھا۔ پاکستان میں وہ واحد شخصیت تھے جو اس لقب سے معروف تھے۔ اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو ان کے کسی دوسرے معاصر کو نصیب نہیں ہوا۔ مولانا کے ماثر میں ان کی تفسیر "جواہر القرآن" تین جلدوں میں یادگار ہے جسے انہوں نے اپنے شیخ حضرت مولانا حسین علیؒ کے افادات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ ان کے بعض نکات سے علماء کو اختلاف ہوسکتا ہے' اور ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بڑی خدمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لی۔ ان کے ماثر میں ان کا قائم کردہ دارالعلوم "تعلیم القرآن" راولپنڈی بھی ہے۔ جس میں درس نظامی کی تعلیم حدیث شریف تک ہوتی تھی۔ لیکن مولانا مرحوم کو چونکہ قرآن کریم سے عشق تھا اس لئے انہوں نے اس کا نام بھی "تعلیم القرآن" ہی تجویز فرمایا۔ دارالعلوم سے ایک مجلہ بھی نکلتا تھا۔ اس کا نام بھی "تعلیم القرآن" ہی رکھا۔ مولانا مرحوم نے تحریک ختم نبوت' ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف تحریک اور قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰؐ میں بھی قائدانہ حصہ لیا۔

مولانا مرحوم ایک عرصے سے دل کے مریض چلے آرہے تھے۔ جون ۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کے لئے ہندوستان تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو حرمین شریفین اور دیار مقدسہ کی حاضری کے لئے رخت سفر باندھا۔ بیت اللہ شریف کے انوار وبرکات کو جذب کیا اور بارگاہ نبویؐ کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوئے' وہاں سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے دوبئ تشریف لے گئے۔ اور وہیں وقت موعود آپہنچا۔ اس طرح ان کا سفر حرمین سفر آخرت کی تمہید بن گیا۔ جو ہر مومن کے لئے لائق صد رشک ہے۔ گویا حرمین کی حاضری ان کی زندگی کا آخری عمل ہوا اور یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کے مژدہ جاں فزا سے سرفراز ہوئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔ اللھم لاتحرمنا اجرہ ولاتفتنا بعدہ۔

(بینات رمضان ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء)

حضرت قاری محمد حبیب اللہؒ

۵ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۰ھ ۲۲ر اپریل ۱۹۸۰ء کو استاذ القراء حضرت قاری محمد حبیب اللہ رہگرائے عالم آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم فن قرات و تجوید کے بہت بڑے عالم تھے ان کی پوری زندگی قرآن کریم کی خدمت میں گذری۔ اور بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ فن قرأت کی خدمت ان کا شب و روز مشغلہ تھا' جامعہ علوم اسلامیہ میں درجات حفظ کا امتحان حضرت مرحوم خود لیا کرتے تھے۔ ان کی رحلت سے ملک علم قرأت و تجوید کے ایک ماہر سے محروم ہوگیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے خدام قرآن سے جو وعدے فرمائے ہیں اپنے فضل واحسان سے حضرت قاری صاحب کو ان وعدوں کا مورد بنائے ان کو رحمت و رضوان کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے اور ان کے اخلاف و مستفیدین اور عزیز شاگردوں کو ان کے صدقۂ جاریہ کو قائم ودائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(بینات جمادی الاولیٰ۔ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۰ھ مطابق اپریل۔ مئی ۱۹۸۰ء)

حضرت مولانا سید زوار حسین نقشبندیؒ

۲۳ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ (۱۹۸۰ء) کو حضرت مولانا سید زوار حسین صاحب نے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ مولانا مرحوم رافضی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان کا میلان فطری طور پر سنت کی طرف تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد مولانا اپنی ہمشیرہ کے گھر رہنے لگے۔ ان کے شوہر صحیح العقیدہ تھے۔ ان کی صحبت نے ان کے فطری میلان کو جلا بخشی' پھر اسی زمانہ میں انہوں نے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں رفض وسنت کے درمیان فرق واختلاف دریافت کیا گیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے اس کا مفصل جواب تحریر فرمایا اور حضرت کا یہ گرامی نامہ مولانا کے لئے سرمۂ چشم بصیرت ثابت ہوا۔ شبہات کا غبار چھٹ گیا اور قلب ونظر سنت کے نور سے منور ہو گئے۔

مولانا نے سرکاری اسکولوں کے ابتدائی درجات طے کر کے جے وی اور ایس وی کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ اس کے بعد منشی فاضل کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرلی۔ اسی امتحان سے انہیں عربی کا شوق پیدا ہوا۔ اور دہلی میں مختلف حضرات سے عربی پڑھتے رہے۔ اور آخر میں مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے فقہ وحدیث کی تکمیل کی۔ حضرت مفتی اعظم کی صحبت سے ان میں فقہ کا ذوق پیدا ہوا۔ دینی مسائل پر بڑی محنت سے بار بار غور کرتے اور جس مسئلہ میں ذرا بھی اشتباہ ہوا؟ اہل علم سے رجوع کرتے۔ ہمارے حضرت مفتی ولی حسن خان ٹونکی سے خاص تعلق تھا۔ مفتی صاحب کے پاس اکثر تشریف لاتے اور مسائل پر تبادلۂ افکار کرتے۔ حضرت مفتی اعظم کی صحبت' ان کی اپنی محنت وریاضت اور اہل علم سے بار بار علمی مذاکرہ اور فقہی کتابوں کے بکثرت مطالعہ نے ان میں اچھا خاصہ فقہی ملکہ پیدا کر دیا تھا۔ خط بڑا پاکیزہ تھا اور تحریر صاف اور سلیس۔ ایک عرصہ سے "عمدۃ الفقہ" کے نام سے فقہ کا ایک مجموعہ مرتب فرما رہے تھے جسے اردو میں فقہ کا دائرۃ المعارف کہنا چاہئے۔ اس کی تین ضخیم

جلدیں کتاب الایمان ، اور کتاب الطہارۃ، کتاب الصلاۃ، کتاب الصوم اور کتاب الزکاۃ کئی سال ہوئے شائع ہوئی تھیں۔ اس سلسلہ کی آخری جلد کتاب الحج ابھی چند مہینے پہلے شائع ہوئی تھی۔ عمدۃ الفقہ کی طوالت کے پیش نظر اس کی تلخیص "زبدۃ الفقہ" کے نام سے مرتب فرمائی اس کی غالباً دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

مولانا مرحوم نقشبندی ، مجددی سلسلہ کے شیخ تھے۔ خواجہ محمد سعید (خلیفہ خواجہ فضل علی قریشی نقشبندی) سے بیعت و مجاز تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ محمد سعید رحمہ اللہ نے اسباق پورے کرانے کے بعد حضرت خواجہ فضل علی شاہ صاحب کی خدمت میں انہیں پیش کیا۔ اور حضرت شیخ کے ارشاد پر خواجہ محمد سعید نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔

فقہ کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کو سلسلہ مجددیہ کے فیوض وافادات کی اشاعت کا شوق تھا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہٗ پر ایک ضخیم کتاب تالیف فرمائی جس میں حضرت کے حالات اور سوانح اور ان کے خلفاء کے تذکرہ کے علاوہ تعلیمات مجددیہ کو بڑی تفصیل سے قلمبند فرمایا۔ حضرت مجدد کے چند رسائل بھی ترجمہ کے ساتھ شائع کئے اور حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات کی تینوں جلدوں کو اردو میں منتقل کیا۔ سلوک و تصوف پر عمدۃ السلوک کے نام سے ایک کتاب لکھی اور ایک کتاب میں اپنے سلسلہ کے مشائخ کے سوانح قلمبند فرمائے۔

مولانا مرحوم بلند قامت ، خضر صورت، حسین و جمیل تھے۔ سرگیں آنکھوں سے حیا ٹپکتی تھی، ہمیشہ عمامہ زیب سر ہوتا، بہت ہی خلیق، متواضع اور "نظر بر قدم" تھے۔ افسوس ہے کہ ایسی صفات کے آدمی دنیا سے رخصت تو ہوتے لیکن پیدا کم ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ مولانا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں مراتب عالیہ عطا فرمائے اور ان کے اعزہ واقارب اور متوسلین کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔

(بینات شوال ۱۴۰۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۰ء)

مناظر اسلام مولانا محمد حیاتؒ

۲۸ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ ۱۱ اگست ۱۹۸۰ کو مناظر اسلام حضرت الاستاذ مولانا محمد حیات (فاتح قادیاں) واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اس قافلۂ حریت کے رکن رکین تھے جس نے انگریزی طاغوت سے ٹکرلی۔ اور اپنی تمام طاقتیں وصلاحیتیں انگریز اور اس کے گماشتوں سے اسلام کی مدافعت میں صرف کرڈالیں۔ "مجلس احرار اسلام" کے ماتحت جب سارقین نبوت کے تعاقب و سرکوبی کے لئے شعبہ تبلیغ کا اجرا ہوا تو مولانا مرحوم کو اس کا نگران تجویز کیا گیا۔ اور قادیان کا مشن ان کے سپرد ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد جب "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی تاسیس ہوئی تو مولانا مرحوم کی خدمات اس کے لئے وقف ہوگئیں اور تادم آخر وقف رہیں۔ اس طرح ان کی پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ، اعلاء کلمۃ اللہ، اسلام کی دعوت و تبلیغ اور ختم نبوت کی پاسبانی میں گذری۔

حضرت مرحوم کو حق تعالیٰ شانہٗ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان کی ایک بڑی خوبی زہد وقناعت کی وہ درویشانہ صفت تھی جو خاصان حق ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ عیش و تنعم سے گویا انہیں طبعی نفرت تھی۔ دنیا کی نمود ونمائش، ساز وسامان اور جاہ ومال سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لباس وخوراک جو انسان کی ناگزیر ضرورت ہے اس میں بھی مولانا مرحوم کا معیار ایسا تھا کہ اچھے اچھے زاہد وعابد بھی اس کو مشکل سے قائم رکھ سکتے ہیں۔ اہل نظر کی نگاہ میں ان کی یہ خوبی ان کے دیگر کمالات واوصاف میں سب سے زیادہ لائق رشک اور پر کشش تھی۔

مولانا مرحوم آغاز جوانی سے جس محنت وریاضت اور مشقت ومجاہدہ کے خوگر ہوگئے تھے آخر عمر تک اس میں فرق نہیں آیا۔ پیرانہ سالی میں بھی کسل اور راحت طلبی ان کو چھو کر نہیں گذری تھی۔ ان کے قویٰ اور اعضاء وجوارح ان کی اولو العزمی کا ساتھ دینے سے قاصر تھے لیکن ان کے عزم وہمت کا شباب آخر وقت تک قائم رہا۔

مولانا مرحوم کو حق تعالیٰ شانہٗ نے فرق باطلہ کی تردید اور ان سے بحث و مناظرہ کا خاص ذوق اور بہت ہی اچھا سلیقہ عطا فرمایا تھا۔ وہ بہت صبر و تحمل، حلم و وقار اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ فریق مخالف کے شبہات کا ایسا تسلی بخش اور مسکت جواب دیتے کہ منصف کو تسلیم و اقرار کے بغیر چارہ نہ ہوتا اور مکابر و معاند خجلت و ندامت کے ساتھ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتا۔ ان کی پوری زندگی میں بحمد للہ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہیں مناظرے میں شکست ہوئی ہو بلکہ وہ ہر میدان میں بفضل خداوندی مظفر و منصور رہے۔ مناظروں میں عموماً شیخی و تعلّی، اور حریف کی دل آزاری کے الفاظ نکل جاتے ہیں اور حریف کی کج روی پر غصہ اور برافروختگی تو ایک معمولی بات ہے لیکن مولانا کی گفتگو شیخی و تعلّی، خودنمائی و خودنگری، سب وشتم، دل آزاری و دریدہ دہنی اور غصہ و برافروختگی کے عیوب سے قطعاً" پاک ہوتی تھی۔ اسی طرح مولانا کے مناظروں میں طنز و تشنیع اور فقرہ بازی کا بھی گزر نہیں تھا۔ وہ جو بات کہتے تھے خوب ناپ تول کر پوری متانت و سنجیدگی سے کہتے تھے۔

یوں تو انہوں نے مختلف فرقوں سے مناظرے کئے لیکن قادیانیت ان کا خاص موضوع تھا اور وہ اس میں متخصص تھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کے ہاتھ پر ان میں سے بہت لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی۔ اور بہت سے پھسلتے ہوؤں کو اسلام پر قرار و ثبات نصیب ہوا۔ مرحوم قادیانی لٹریچر کے گویا حافظ تھے اور صفحوں کے صفحے انہیں ازبر تھے۔ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ قادیانیوں نے صرف ایک مسئلہ سیکھا ہے اور وہ ہے وفات مسیح۔ اور مجھے بھی بس یہی ایک مسئلہ آتا ہے اس موضوع پر ان کی گفتگو اس فرقہ باطلہ کے بڑوں بڑوں سے ہوئی اور بحمداللہ مولانا مرحوم ہر موقعہ پر غالب رہے۔

دو باتیں مولانا مرحوم کا مزاج بن گئی تھیں۔ ایک کثرت مطالعہ انہیں جب دیکھو کتاب ہاتھ میں ہوگی۔ اور وہ (اگر تنہا ہوں تو) اس کے مطالعہ میں مصروف ہوں گے۔ بعض اوقات رات کے دو بجے مولانا مرحوم کو مطالعہ میں منہمک دیکھا گیا۔ ضعف بصر کا عارضہ بھی انکے اس شوق کے راستے میں حائل نہ ہوسکا۔ اور جب تک ان کی صحت کتاب اٹھانے کی متحمل رہی ان کا مطالعہ نہیں چھوٹا۔ ان کے پاس اپنی ذاتی کتابیں تھیں جو ان ہی کی طرح سال خوردہ تھیں۔ وہ ہی مولانا کی کل کائنات تھی اور وہ انہیں جان سے زیادہ عزیز جانتے تھے۔

دوسری بات جس کا ان پر حال کے درجہ میں غلبہ تھا' وہ افادہ کی شان تھی جو شخص بھی ان کے پاس آکر بیٹھے قادیانیت کے موضوع پر اس کے سامنے گفتگو شروع کردیتے تھے' گویا وہ ہر شخص کو اس دجل وتلبیس سے آگاہ کرنا چاہتے تھے اور یہ ان کا حال بن چکا تھا۔

مولانا ایک عرصہ سے اس بات کے متمنی تھے اور ہر وارد وصادر سے اس کے لئے دعائیں کراتے تھے کہ کسی طرح قادیانیوں کے مرکز ربوہ میں جاکر بیٹھنے اور وہاں کے لوگوں کو براہ راست اسلام کی دعوت دینے کی سعادت انہیں نصیب ہوجائے۔ چنانچہ جب مسلم کالونی ربوہ میں "ختم نبوت" کے دفتر اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مولانا مرحوم نے وہاں اقامت اختیار کرلی۔ ہرچند ان کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ابھی تک یہاں رہائش وخوراک کی سہولتیں میسر نہیں ہیں اور اس پیرانہ سالی میں یہاں آپ کی رہائش آپ کے لئے تکلیف دہ ہوگی لیکن انہوں نے قبول نہیں فرمایا اور تمام مشکلات کو خوش آمدید کہتے ہوئے وہاں اقامت گزیں رہے اور جب تک چلنے پھرنے کی سکت رہی وہاں جمے رہے۔ مقصد سے عشق اور لگن کی یہ مثال اس زمانہ میں نادر الوجود ہے۔

مولانا مرحوم بہت کم بیمار پڑتے تھے اور کبھی بیمار ہوتے بھی تو دوا دارو کا تکلف کم ہی فرماتے تھے۔ ان کی صحت ومرض کی گاڑی بھی بس توکل ہی کے سہارے چلتی تھی' عام صحت اچھی تھی مگر سن مبارک سو کے قریب پہنچ چکا تھا اس لئے چند سال سے بدن پر ضعف وانحطاط کے آثار بڑھ رہے تھے۔ پیرانہ سالی کا یہی ضعف گویا ان کا مرض الوفات تھا۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے ربوہ سے لاہور منتقل ہوگئے اور پھر وہاں سے اپنے آبائی گاؤں کوٹلی بیرے خان تحصیل شکر گڑھ (ضلع سیالکوٹ) تشریف لے گئے۔ وہیں وصال ہوا۔ نماز جنازہ مدرسہ رحیمیہ تعلیم القرآن کے مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب نے پڑھائی۔ اسطرح یہ سو سال کا تھکا ماندہ مسافر آسودہ خاک ہوا۔ **اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ' واعف عنہ' واکرم نزلہ' ووسع مدخلہ' وابدلہ داراً خیراً من دارہ' واھلاً خیراً من اھلہ' اللّٰھم لاتحرمنا اجرہ ولاتفتنا بعدہ۔**

(بینات شوال ۱۴۰۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۰ء)

مولانا غلام غوث ہزارویؒ

۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ مطابق ۴ فروری ۱۹۸۱ء کو حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی قریباً نوے سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کی دینی خدمات پون صدی پر محیط ہیں۔ وہ آغاز شباب سے پیرانہ سالی بلکہ آخری لمحات زندگی تک امور خیر کے لئے موفق رہے۔ راقم الحروف کو انہیں دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی یاد آجاتا تھا۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا۔ یارسول اللہ! اچھا آدمی کون ہے؟ فرمایا:

من طال عمرہٗ وحسن عملہ (مشکوٰۃ ص ۴۵۰)

"جس کی عمر طویل ہو اور عمل اچھا ہو"۔

حضرت مرحوم کا سب سے ممتاز وصف باطل کے مقابلے میں شدت وسختی اور حق گوئی وبے باکی تھا۔ وہ زائغین کے مقابلہ میں ہمیشہ شمشیر برہنہ رہے۔ اور اس بارے میں کسی لچک اور نرمی کے روادار نہیں تھے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ مناسب ہوگا کہ حضرت الشیخ مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہٗ ۱۹۳۷ میں جب پہلی بار مصر تشریف لے گئے تو ایک مختصر سا مقالہ مجلہ "الاسلام" مصر (جلد ۷ شمارہ ۴۱ بابت ۲۴ ماہ شوال ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۶ دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع فرمایا۔ جس کا عنوان تھا: "کلمة عن الالحاد وکتاب التذکرة لاحد ملاحدة الشرق وجهود علماء الهند فی هذا الصدد" جس میں عنایت اللہ مشرقی کی کتاب "تذکرہ" اور اس کی تحریک الحاد کے مقابلہ میں علماء ہند کی مساعی جمیلہ کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت نے "مجلس احرار اسلام" کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس کے جواں سال

مجاہدین مولانا بہاء الحق قاسمیؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا تذکرہ بطور خاص کیا ہے:

فلعلماء الهند فی هذا السبیل جهود تشكر دائما، فهم لم یغفلوا ولم یتغافلوا ولم یحجموا ولم یقصروا، وعلى الاخص "جماعة احرارالاسلام" فی الهند، فان لها مجهودات كبیرة ومن المبرزین فی هذه الجماعة السباقین الى الغایات الاستاذ الفاضل بهاء الحق القاسمی۔ وصدیقنا الفاضل الاستاذ غلام غوث الهزاروی فانهما قد القماه احجارا فی فیه، وسدا علیه كل حیلة یحتالها وتركا فتنته بین انیاب الاسد۔

فنشكر لهما جلیل خدمتها ودفاعهما عن الدین والاسلام، وفقهما الله للخدمة الصحیحة وبارک الله فی مساعیهما المنجحة وجهودهما المثمرة۔

"پس علماء ہند کی مشرقی الحاد کے مقابلہ میں بہت سی کوششیں ہیں جو ہمیشہ لائق تشکر رہیں گی، کہ نہ وہ غافل ہوئے اور نہ غفلت کا مظاہرہ کیا، نہ پیچھے ہٹے اور نہ کوتاہ عملی سے کام لیا۔ خصوصاً ہندوستان میں "مجلس احرار اسلام" کے بہت سے مجاہدانہ کارنامے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اس جماعت کے دو شخص بہت ہی ممتاز اور بازی جیتنے والے ہیں۔ ایک استاذ فاضل بہاء الحق قاسمی اور دوسرے ہمارے فاضل دوست استاد غلام غوث ہزاروی۔ ان دونوں نے مشرقی کا منہ بالکل بند کردیا۔ اور اس کے تمام حیلوں کو روک دیا اور اس کے فتنہ کو کچل کر رکھ دیا۔

اس لئے ہم ان کی اس جلیل القدر خدمت اور دین اسلام کی پاسبانی پر ان کے شکر گذار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو صحیح خدمت کی توفیق سے نوازیں۔ اور ان کی کامیاب مساعی اور ثمر آور کوششوں میں برکت فرمائیں"۔

اس پون صدی میں جتنے فتنے رونما ہوئے مولانا مرحوم سب کے خلاف مصروف جہاد رہے۔

مولانا کا ایک خصوصی وصف ان کی بلند نظری، زہد واستغنا، اور ان کی قلندرانہ شان تھی؛ اس طویل عمر میں انہیں طوفان حوادث کے بے شمار مدوجزر دیکھنے پڑے، زمانے کے سرد وگرم کے نامعلوم کتنے تجربات ان کو ہوئے، عسر ویسر کی خدا معلوم کیسی کیسی حالتیں ان پر گذریں، اور نعرہ ہائے زندہ باد ومردہ باد کے کیسے کیسے تماشے دیکھنے کا انہیں اتفاق ہوا، لیکن ان کی وضع وروش میں کبھی تغیر نہیں آیا، اور وہ ہر حال میں اپنی وضع پر قائم رہے۔ وہ مخلوق کی داد و تحسین یا مذمت ونکوہش دونوں سے بالاتر تھے۔ عام لوگ انہیں ایک عالم، ایک خطیب، ایک مجاہد اور ایک سیاسی ودینی راہنما کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے، مگر ان کے باطن کا سوز وگداز، تعلق مع اللہ اور غیر اللہ سے استغناء ہمیشہ ان کے سینے کا راز رہا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہوسکا کہ وہ محض سیاسی لیڈر ہی نہیں، عابد شب زندہ دار بھی ہیں، اسی قلندرانہ شان کا ایک مظہر یہ تھا کہ حضرت مرحوم کو مخدومیت سے چڑ تھی۔ وہ ہمیشہ خادم کی حیثیت سے رہنا پسند فرماتے تھے۔ کبھی مخدوم بننا گوارہ نہ فرماتے تھے۔

حضرت مرحوم کو حق تعالیٰ شانہ، نے آہنی عزم اور مضبوط اعصاب عطا فرمائے تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود میلوں کا پیدل سفر اور محنت ومجاہدہ بھی ان کے بدن کی برقی قوت میں کسی خلل کا موجب نہ ہوتا تھا اور وہ تھکن محسوس نہ کرتے تھے۔

حضرت مرحوم ایک عرصہ سے تجرید وتفرید کی زندگی بسر کررہے تھے۔ اور انہوں نے تقریر وخطابت کی ذمہ داریوں سے بھی تقریباً سبکدوشی حاصل کرلی تھی۔ لیکن دسمبر ۱۹۸۰ میں ختم نبوت چنیوٹ کانفرنس میں تشریف لائے۔ اور ربوہ میں مسلمانوں کے ایک عظیم اجلاس سے خطاب فرمایا۔ حق تعالیٰ شانہ، حضرت مرحوم کے ساتھ رحمت ورضوان کا معاملہ فرمائے۔ ان کے سہو ونسیان اور بشری لغزشوں کی مغفرت فرمائے اور اپنے مخلص بندوں کے ساتھ انہیں جنت الفردوس کے بلند ترین درجات نصیب فرمائے۔

"مشاہیر علماء دیوبند" کے مؤلف جناب قاری فیوض الرحمٰن صاحب نے حضرت مرحوم کے حالات کا مختصر سا تذکرہ پیش کیا ہے۔ مناسب ہے کہ اسے یہاں نقل کردیا جائے:

"آپ جون ۱۸۹۶ کو بفہ، تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں جناب حکیم سید گل

کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ میں مڈل پاس کیا۔ ابتدائی دینی تعلیم ساتھ ہی ساتھ والد سے حاصل کرتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے پہلے مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، ازاں بعد 1915 میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے فیضان صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا محمد رسول خان ہزارویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ امتحان میں مولانا محمد اسحاق کانپوری اول اور آپ دوم آئے۔

تدریس: فراغت کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم کے ارشاد پر بطور معین مدرس تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر جمعیتہ علماء ہند کی تنظیم کے لئے مولانا محمد یوسف جونپوری کے ہمراہ پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ حیدر آباد دکن کی ایک ہندو ریاست "سمستان گدوال" میں دو سال تک بطور مبلغ اسلام تبلیغی خدمات انجام دیں اور بہت سے ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ مسلمانوں کے اندر جو ہندوانہ رسوم راہ پارہی تھیں ان کا سدباب کرکے اسلامی رسوم کو رواج دینے کی سعی بلیغ کی۔ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۰ اپنے ضلع میں تبلیغی کام کرتے رہے۔

۱۹۳۱ میں ہزارہ میں سیاسی کام کا آغاز کیا اور انگریز کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ اور اس کے نتیجہ میں ۱۹۳۲ کا پورا سال ایبٹ آباد اور بنوں کی جیلوں میں گزارا۔ رہائی کے بعد "انجمن اسلامیہ" ایبٹ آباد نے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر آپ کی خدمات حاصل کرلیں۔ ۱۹۳۳ میں مرزائیت کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

۱۹۳۴ میں شریعت کانفرنس پشاور کا اہتمام کرنے والوں میں آپ پیش پیش تھے۔ اسی سال مجلس احرار اسلام کا قیام عمل میں

آیا اور آپ اس میں شامل ہوگئے۔ اس سلسلہ میں ہونے والی آل انڈیا کانفرنس سیالکوٹ (۱۹۳۵ء) کی آپ نے صدارت کی، بعد ازاں ایجی ٹیشنوں میں حصہ لیا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے ساتھ ہی انگریزی فوج میں مسلمانوں کے بھرتی ہونے کے خلاف احرار کی سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوکر ۱۹۴۲ء کا سال ڈیرہ اسماعیل خان جیل میں گزارا۔ اس تمام عرصہ میں آپ جمعیۃ علمائے ہند کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۵۳ کی تحریک ختم نبوت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۶ میں جمعیۃ علمائے اسلام کے امیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور ناظم آپ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ میں جب ایوب خان مرحوم نے مارشل لاء نافذ کرکے تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی تو آپ "نظام العلماء" کے نام سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۲ میں آپ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور عائلی قوانین کے خلاف قرارداد پاس کراوئی۔ ۶۵-۱۹۶۴ میں دوبارہ موتمر عالم اسلام قاہرہ میں شریک ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے ممبر چنے گئے، ۱۹۷۱ء میں عرب ممالک کی دعوت پر شرق اوسط کا دورہ کیا۔ ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ حج وفد کے رکن بنائے گئے۔ آپ پانچ مرتبہ زیارت حرمین کی سعادت حاصل کرچکے تھے۔

تصانیف: میں "ایمان" کالج میں ایمان، مجاہدانہ تقریریں، جہاد، سیرۃ النبیؐ، جواب محضر نامہ کہ مرزائی قطعی کافر اور غیر مسلم اقلیت ہیں۔ صفحات ۲۶۰ ہیں۔

نیز مولانا کی تصانیف میں "اسلام میں غلامی" اور "مسلمہ اصول جنگ" بھی اہم کتب ہیں۔

(بینات ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق مارچ ۱۹۸۱ء)

محمود الملۃ والدّین

حق تعالیٰ شانہٗ نے دین قیم کی خدمت وپاسبانی اور اپنے وعدہ **"انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحافظون"** کی تکمیل کے لئے ہر دور اور ہر صدی میں ایسے مردان حق آگاہ پیدا فرمائے ہیں جنھوں نے سوزدروں اور خون جگر سے گلشن دین کی آبیاری کی۔ اور اسے ہمیشہ تروتازہ، سرسبزوشاداب اور سدا بہار رکھا۔ اور یہ سلسلہ ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔

صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق ظاہرین الی یوم القیامۃ، قال فینزل عیسی بن مریم صلی اللہ علیہ وسلم فیقول امیرھم تعال صل لنا، فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء تکرمۃ اللہ ھذہ الامۃ۔ (صحیح مسلم ج۱ص۸۷ و مسند احمد ج ۳ ص۳۴۵)

"میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی۔ اور وہ قیامت تک غالب رہیں گے۔ پس عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو ان کا امیر عرض کرے گا کہ آیئے ہمیں نماز پڑھایئے وہ فرمائیں گے نہیں! (بلکہ تم ہی نماز پڑھاؤ، کیونکہ) تمہارے بعض بعض پر امیر ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کا اعزاز ہے (کہ ایک جلیل القدر نبی اس امت کی اقتداء میں نماز پڑھیں)"

اور مسند احمد ج ۴ ص۴۲۹ میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت کے بسند صحیح یہ الفاظ ہیں:

لا تزال طائفة من امتي على الحق ظاهرين على من ناواهم حتى يأتي امر الله تبارک وتعالیٰ وینزل عیسی بن مریم علیہ السلام

"میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور وہ اپنے مخالفین پر غالب رہیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم آپہنچے اور عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوجائیں"۔

اس مضمون کی اور بھی متعدد احادیث مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی سربلندی کا تکوینی نظام تا قیامت جاری رہے گا۔ اور یہ کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر ختم ہوگی۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے اس تکوینی نظام کے ذریعہ چودھویں صدی میں ایسے بھی مردان باخدا کو کھڑا کیا جن کے علم وفضل' صلاح وتقویٰ' زہد وقناعت' دعوت وعزیمت اور ہمت وشجاعت نے سلف صالحین کا نمونہ پیش کیا۔ اور جن کے ذریعہ اسلام کی حجت قائم ہوئی۔ اس صدی میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ' حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ' شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ایسے درویشان خدا مست ہوئے جن کے انفاس طیبہ سے جنیدؒ وشبلیؒ کی یادیں تازہ ہوئیں۔ اسی صدی میں امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ' مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ' مفتی کفایت اللہ دہلویؒ' حضرت الشیخ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ' مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ' حضرت الشیخ مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ' مولانا سید محمد یوسف البنوریؒ' مولانا ظفر احمد تھانویؒ' مولانا مفتی محمد شفیعؒ دیوبندی اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ایسے فقہاء ومحدثین ہوئے' جن سے حافظ ابن دقیق العید اور حافظ ابن حجر کی یاد تازہ ہوئی۔ اسی صدی میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایسے کثیر التصنیف بزرگ ہوئے۔ جنہوں نے دینی ضرورت کے ایک ایک گوشہ اور ایک ایک مسئلہ پر قلم اٹھایا۔ اور جن کی سرعت قلم' برکت اوقات' اور کثرت تصنیف سے حافظ ابن جوزیؒ اور حافظ سیوطیؒ کی یاد تازہ ہوگئی۔ اسی دور میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی' مولانا سید حسین احمد مدنی' مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی' مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری' اور مولانا احمد علی لاہوریؒ ایسے مجاہدین اسلام ہوئے جنہوں نے اپنے دور کی سب سے بڑی فرعونی وطاغوتی شہنشاہیت کی سنگینوں کے سائے

میں کلمۂ حق بلند کیا۔ اسی صدی میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ ایسے مصلحین وداعی الی اللہ ہوئے جن کے اخلاص و للّٰہیت اور درد وسوز نے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کردیا اور ان کے ٹوٹے ہوئے رشتۂ ایمان کو پھر سے جوڑ دیا۔ اسی صدی میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ ایسے متکلمین ہوئے جنہوں نے تقریرًا و تحریرًا باطل کو مغلوب وپسپا کیا۔ یہ چند نام محض بطور مثال نوک قلم پر آئے ہیں، ورنہ پاک وہند اور عالم اسلام میں اس سطح کے سینکڑوں نہیں لاکھوں اکابر ہوئے، جنہوں نے چودھویں صدی کی تاریکیوں میں حق وصداقت کی قندیلیں روشن کیں، اور دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی نصرت وحمایت کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے حاملین دین کا ایک جم غفیر نہ کھڑا کردیا ہو۔

چودھویں صدی کے اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی مولانا مفتی محمود صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) کی ذات والاصفات تھی۔

حق تعالیٰ شانہٗ کے لطف وکرم اور اس کی قدرت کاملہ کا تماشا دیکھو کہ تھانہ بھون کے ایک شیخ زادے کو اٹھاتے ہیں اور اسے عرب وعجم کا شیخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بنادیتے ہیں۔ گنگوہ کے ایک انصاری خاندان کے ایک فرد پر نظر عنایت ہوتی ہے اسے قطبیت کبریٰ کے مقام پر فائز کرکے امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی بنا دیا جاتا ہے۔ کشمیر کی سنگلاخ سرزمین سے ایک گمنام خاندان کے ایک فرد کو لایا جاتا ہے اور علوم نبوت کا پورا کتب خانہ اس کے سینے میں انڈیل کر اسے امام العصر مولانا محمد انور شاہ بنادیا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایک گاؤں سے ایک نو مسلم کو لاتے ہیں اور اسے ولایت کبریٰ اور مقام صدیقیت پر فائز کرکے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری بنادیتے ہیں۔ اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک غیر معروف قصبہ سے ایک فرد کو کھینچتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے عالم، حافظ، قاری فقیہ، مفتی، محدث، متکلم اور پھر وزیر اعلیٰ سے لے کر قائد حزب اختلاف تک بنادیتے ہیں۔ اس صدی (اور گذشتہ صدیوں) کے اکابر کے ابتدائی حالات کا مشاہدہ کیجئے تو بظاہر اسباب کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نونہال کا سایہ ایک عالم پر محیط ہوگا۔ اس سے واضح ہوا کہ مشیت الٰہی حفظ دین اور پاسبانیٔ ملت کا انتظام ظاہری اسباب سے بالاتر کرتی ہے، اور لطف الٰہی خود ایسے افراد کا انتخاب کرتا ہے جن سے دین

قیم کی خدمت کا کام لیا جائے۔

حضرت اقدس مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ حرمین شریفین کے لئے عازم سفر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی علالت اور ضعف وناتوانی کے علی الرغم چودھویں صدی کے آخری حج میں شرکت کریں اور خانہ کعبہ جاکر بارگاہ ذوالجلال میں بصد عجز ونیاز یہ التجا کریں کہ پوری صدی میں امت سے جو کوتاہیاں، جو لغزشیں اور جو تقصیریں ہوئی ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ اپنے رحمت بے پایاں اور اپنے محبوب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے امت کے پوری صدی کے گناہوں کو معاف کردیں ۔ لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی مشیت وتکوین شاید یہ چاہتی تھی کہ مفتی محمود کے اس حسن واخلاص اور حسن نیت کی وجہ سے اس صدی کا خاتمہ ہی "محمود" پر کردیا جائے۔ ع: الٰہی عاقبت "محمود" گرداں

اسلئے حرمین شریفین کے لئے پرواز سے ٹھیک ۲۴ گھنٹے پہلے ان کی بے تاب وبے چین روح اس صدی کے مسلمانوں کی سفارش لے کر سیدھی بارگاہ ذوالجلال میں پہنچ گئی۔

یٰاَیَّتُھَا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

---------- ☆☆☆ ---------- ☆☆☆ ----------

حضرت مفتی صاحبؒ ۱۱ اکتوبر یکم ذوالحجہ کو بروز ہفتہ کراچی پہنچے۔ ۱۵ اکتوبر، ۵ ذوالحجہ کی پرواز میں ان کی نشست محفوظ ہوچکی تھی۔ دن کو بیشتر قیام یہاں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مہمان خانہ میں رہتا تھا۔ اور رات کو اپنے مخلص دوست جناب حاجی محمد حنیف صاحب کے یہاں پی ای سی ایچ سوسائٹی میں تشریف لے جاتے تھے۔

۱۴ اکتوبر، ۴ ذوالحجہ کو بروز دوشنبہ صبح غسل فرمایا۔ اور مکان پر بعض سیاسی رفقاء سے ملاقات فرمائی۔ ۱۱ بجے کے قریب مدرسہ تشریف لائے۔ آج حضرت مفتی صاحبؒ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے یاد فرمانے پر جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مہتمم دارالعلوم کراچی اور مولانا محمد تقی عثمانی قانون زکاۃ کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے لئے تشریف لائے اور قریباً ساڑھے بارہ بجے رفیق محترم جناب مولانا محمد جمیل خان صاحب راقم الحروف کو باصرار مفتی صاحبؒ کی خدمت میں لے گئے۔ اس ناکارہ کو ان حضرات کی تشریف آوری کا علم نہیں تھا۔ اور نہ موضوع گفتگو کے بارے میں کچھ خبر تھی۔ اس وقت مجلس میں یہ حضرات موجود تھے۔ .... جناب

مولانا محمد طاسین صاحب ناظم مجلس علمی کراچی، مولانا مفتی احمد الرحمٰن، مولانا محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، صاحبزادہ مولوی محمد بنوری، اور مولانا محمد جمیل خان۔ تھوڑی دیر میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر بھی تشریف لے آئے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ نے بطور خاص یاد فرمایا تھا) کوئی پندرہ بیس منٹ تک لطف ومزاح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران چائے آئی تو صاحبزادہ مولانا محمد رفیع عثمانی اور صاحبزادہ مولانا محمد تقی عثمانی نے چائے سے معذرت کی۔ اور ٹھنڈا مشروب نوش کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا گو میں خود چائے پیتا ہوں مگر جو حضرات نہیں پیتے ان کو بہت اچھا سمجھتا ہوں۔ جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے پان کے بٹوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! ہمارے ساتھ یہ علت لگی ہوئی ہے، فرمایا یہ اس سے بھی بدتر ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے چائے کی پیالی نوش فرمالی تو مولانا محمد تقی عثمانی نے پان پیش کیا، حضرت مفتی صاحبؒ نے قبول فرمالیا۔ ادھر مولانا محمد طاسین صاحب نے دریافت کیا کہ نماز کس وقت ہوگی؟ ڈیڑھ بجے کا وقت بتایا گیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا "پھر میرا خیال ہے کہ تھوڑی سی گفتگو نماز سے پہلے ہوجائے"" پان بمشکل ایک یا دو منٹ منہ میں رہا ہوگا کہ اگالدان میں ڈال دیا۔ خوب کلی کی، اور فرمایا:

"اس وقت ہماری گفتگو خالص شرعی نقطہ نظر سے ہے۔ کوئی سیاسی ذہن یا تعصب اس میں کار فرما نہیں ہونا چاہئے، اور میں اپنی ذات کے بارے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے اپنی غلطی معلوم ہوگئی تو میں اس سے رجوع کرلوں گا"۔

یہ کہہ کر فرمایا کہ آپ حضرات نے میرے فتوے کا جواب لکھا ہے، گو اس میں صراحۃً میری تردید نہیں کی گئی مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میرے فتوے کا جواب ہے، مجھے آپ حضرات پر تین اعتراض ہیں۔

پہلے نکتے کی جو تشریح فرمائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

"آپ حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ بینکوں میں جو روپیہ جمع کردیا جاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اموال ظاہرہ میں داخل ہوجاتا ہے بلکہ وہ اموال ظاہرہ سے بڑھ کر حکومت کی ضمانت وحفاظت میں داخل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ بینک میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے وہ ربوی قرض ہوتا ہے۔ چنانچہ بینک

بھی اس کو قرض سمجھتے ہیں' اور کھاتے دار بھی یہی سمجھتے ہیں' اور قرض کی رقم کا حکم یہ ہے کہ وہ قرض دہندہ کی ملک سے خارج ہو کر مستقرض کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں مالکانہ تصرف کرتا ہے۔ اگر وہ رقم ضائع ہوتی ہے تو مستقرض کی ضائع ہوتی ہے۔ اور فقہ کا ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں جس کے مطابق مستقرض کو قرض دہندہ کی جانب سے اس رقم کی زکاۃ ادا کرنے کا حق حاصل ہو۔ پس جب بینک میں جمع شدہ رقم قرض دہندگان کی ملکیت ہی نہیں۔ بلکہ بینک کی ملکیت ہے تو اس کو اموال ظاہرہ میں کس طرح شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور بینک کو اس رقم پر قرض دہندہ کی طرف سے زکاۃ وضع کرنے کا حق کس شرعی اصول سے دیا جاسکتا ہے؟ یہ رقم اموال ظاہرہ میں شامل ہے یا اموال باطنہ میں؟ یہ بحث تو اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ وہ رقم قرض دہندہ کی ملک میں ہو۔ لیکن جب وہ رقم قرض دہندہ کی ملک سے خارج ہو کر بینک کی ملک میں داخل ہو گئی ہے تو اس رقم پر اموال ظاہرہ یا اموال باطنہ کا اطلاق کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے"۔

حضرت مفتی صاحبؒ ابھی پہلے نکتے کی ہی تشریح فرمارہے تھے ان کی تقریر بڑے ربط و تسلسل سے جاری تھی۔ اس ناکارہ کو حضرت مفتی صاحبؒ کی گفتگو سننے کا موقع پہلے بھی کئی بار ملا لیکن جس حاضر دماغی' جس ربط و سلیقہ اور جس حسن استدلال سے وہ آج اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر رہے تھے' اس کا تجربہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

قریباً دس منٹ تک وہ اس نکتہ پر تقریر فرماتے رہے' درمیان میں نہ کوئی حشو و زائد لفظ آیا' نہ کسی لفظ پر اٹکن یا لکنت محسوس ہوئی۔ خدا جانے وہ پہلے نکتہ کی تشریح مکمل کر چکے تھے یا اس سلسلہ میں ابھی کچھ اور وضاحت فرمانا چاہتے تھے کہ فقرہ مکمل کر کے ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوئے' بایاں ہاتھ پیشانی پر رکھا اور یکایک بائیں پہلو کی طرف مائل پیچھے کو گر گئے۔ اس جانب جناب صاحبزادہ مولوی محمد بنوری بیٹھے ہوئے تھے' ان کی گود میں آرہے۔

ہم نے آج تک کسی کو اتنی آسانی سے مرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کسی کو

وہم بھی نہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحبؒ زبان حال سے "لست علیٰ صحبتکم بحریص(۱)" کہتے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوچکے ہیں۔ ہم سب یہی سمجھے کہ دل کے دورہ کی وجہ سے سکتہ کی سی بے ہوشی ہو گئی ہے۔ اس لئے مولانا محمد طاسین صاحب نے منہ میں پانی ڈالا۔ راقم الحروف نے زور سے مقام قلب کو مسلنا شروع کیا۔ ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب اور مفتی احمد الرحمٰن صاحب نے پاؤں کی مالش شروع کردی۔ مولانا محمد رفیع عثمانی نے زبان کے نیچے وہ دوائی رکھی جو شدید دورۂ قلب میں دی جاتی ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا محمد بنوری اور مولانا محمد جمیل خان ڈاکٹروں کی طرف دوڑے، مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے وقفہ وقفہ سے دو چار ہچکیاں لیں اور ابدی نیند سو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راقم الحروف نے مصنوعی دانت اپنے ہاتھ سے نکالے۔ اور آنکھوں سے چشمے اتارے۔ زندگی کی تمام علامتیں ختم ہوچکی تھیں اور یقین آچکا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی روح پرواز کرچکی ہے۔ لیکن ان کے معالج ڈاکٹر کا اصرار تھا کہ انہیں ہسپتال ضرور لایا جائے۔ چنانچہ ہسپتال لے گئے۔ اور آدھے گھنٹے تک نظام تنفس جاری کرنے کی کوشش کی گئی۔ بالآخر اشک بار آنکھوں سے جناب ڈاکٹر اسلم صاحب اور ان کے رفقاء نے موت کی تصدیق کردی۔ **ان للہ ما اخذ ولہٗ مااعطی وکل عندہٗ باجل مسمیٰ۔**

یوں تو موت سنت بنی آدم ہے۔ اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ یہاں جو بھی آیا جانے ہی کے لئے آیا۔ لیکن بعض حضرات کی زندگی کی طرح ان کی موت بھی لائق رشک ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی موت کئی لحاظ سے حسن خاتمہ کی علامت ہے۔ ایک تو وہ سفر میں تھے اور سفر میں مومن کی موت معنوی شہادت ہے۔ پھر یہ سفر بھی سفر حج تھا۔ گویا یہ موت فی سبیل اللہ تھی۔ پھر ایک دینی و شرعی مسئلہ کی وضاحت و تشریح کرتے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔ دینی مسائل کا مذاکرہ ذکر الٰہی کی ایک فرد ہے۔ پس انکا

....

(۱) سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے تاریخی فقرے کی طرف اشارہ ہے۔ اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے گورنروں اور فوجی حکام کے نام ایک گشتی فرمان لکھا تھا کہ اسلام کے کچھ شرائع اور ارکان ہیں ۔ زندہ رہا تو تمہارے سامنے ان کی تشریح کروں گا۔ لیکن اگر میرا وقت موعود آپہنچا تو تمہارے پاس رہنے کا خواہشمند بھی نہیں ہوں۔

خاتمہ ذکر الٰہی پر ہوا۔ اور مفتی کی حیثیت سے جو خدمت حق تعالیٰ نے ان کو تفویض فرمائی آخری لمحہ تک اس میں مشغول رہے۔ پھر ان کے طائر روح نے جس سرعت سے پرواز کی وہ بجائے خود ایک حیرت انگیز ہے۔ راقم الحروف کا احساس یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ جب فقرہ پورا کر کے خاموش ہوئے تو اسی لمحہ بیٹھے بیٹھے ان کی روح پرواز کر گئی۔ اتنی آسانی سے روح کا قبض ہو جانا اس ناکارہ کے لئے بالکل ہی نیا مشاہدہ تھا، کہ نہ موت سے پہلے کسی تکلیف کی شکایت نہ کسی درد و کرب کا اظہار۔ شیخ عطارؒ کے درویش کا واقعہ کتابوں میں پڑھا سنا تھا کہ ان کی دہلیز پر سر رکھ کر لیٹ گئے اور کہا کہ ہماری روح تو یوں قبض ہو جائے گی۔ مگر اس کا چشم دید مشاہدہ حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال سے ہوا کہ مرنے والے یوں بھی مر کر دکھا دیا کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے کسی کی موت کے لئے جو وقت مقدر فرما رکھا ہے، موت ٹھیک اسی وقت مقرر پر آتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ حق تعالیٰ شانہٗ کے علم میں ہے کہ کسی کی موت کے لئے کون سا وقت موزوں ہے۔ اس لئے کسی کی موت کو "بے وقت کی موت" کہنا بڑا ہی غلط اور جاہلانہ محاورہ ہے۔ اور یہ گویا حق تعالیٰ شانہٗ کے فعل پر اعتراض ہے۔ مومن کی شان تو وہ ہونی چاہئے جس کی تعلیم ایک دعاء کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو فرمائی ہے:

اللّٰهم احینی ما علمت الحیاۃ خیرًا لی۔ وتوفنی اذا علمت الوفاۃ خیرا لی۔

"اے اللہ مجھے زندہ رکھ جب تک آپ کے علم میں زندگی میرے لئے بہتر ہو۔ اور مجھے وفات دے جب آپ کے علم میں وفات میرے لئے بہتر ہے"۔

اس لئے عقلی و ایمانی حیثیت سے مومن کو اس بات کا پورا اطمینان ہونا چاہئے کہ جس شخص کے حق میں موت کا جو وقت مقرر ہے وہی اس کے لئے خیر ہے۔ اور بلاشبہ بحالت ایمان کسی شخص کا اس دنیا سے رخصت ہو جانا اس کے حق میں بڑی نعمت ہے۔ اور دنیا کی ساری لذتیں اور نعمتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ تاہم دنیا سے جانے والے حضرات کی جدائی سے جو خلا پیدا ہو جاتا ہے اس پر رنج و غم اور حسرت و قلق کا ہونا ایک

طبعی چیز ہے۔ خصوصاً اگر رخصت ہونے والے حضرات کا وجود دنیا کے لئے باعث رحمت ہو اور ان کی ذات سے دینی خدمات وابستہ ہوں تو ان کا صدمہ ایک عالم کی بے کسی و محرومی اور یتیمی کا موجب بن جاتا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ ۹۵ھ میں حجاجؒ کے دست جفا سے شہید ہوئے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں ان کے بارے میں حضرت میمون بن مہرانؒ کا قول نقل کیا ہے:

لقد مات سعید بن جبیر وما علیٰ وجہ الارض احد الا وھو محتاج الیٰ علمہ

''سعید بن جبیرؒ'' کا انتقال اس وقت ہوا جب کہ روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو''۔

نیز امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد نقل کیا ہے:

قتل سعید بن جبیر وما علی الارض الا ھو محتاج (او قال مفتقر) الیٰ علمہ۔

''سعید بن جبیرؒ اس وقت شہید ہوئے جب کہ روئے زمین کا کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو''۔

پاکستان کی حد تک یہ فقرہ حضرت مفتی صاحبؒ پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ وہ دنیا سے اس وقت رخصت ہوئے جب اہل علم ان کے علم وفقہ کے محتاج تھے۔ اہل دانش کو ان کے فہم وتدبر کی احتیاج تھی اور اہل سیاست ان کی قیادت وزعامت کے حاجت مند تھے۔ اس لئے ان کی وفات بیک وقت علم ودانش' فقہ وحدیث' سیاست وقیادت' حلم وتدبر' شجاعت وبسالت اور شہامت وزعامت کا ماتم ہے۔ ان کی تنہا ذات سے دین اور خیر کے اتنے شعبے چل رہے تھے کہ ایک جماعت بھی ان کے خلا کو پر کرنے سے قاصر رہے گی۔

فکر وعزیمت کی بلندی حق تعالیٰ شانہٗ کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن جو حضرات اس

نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ قوت برداشت اور صبر و تحمل کے باوجود یہ ان کے لئے امتحان و آزمائش اور عظیم ترین مجاہدہ بن جاتی ہے۔ ابنائے زمانہ ان کی اس بلندی کا ساتھ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور ان حضرات کے لئے ابنائے زمانہ کی پست سطح پر اترنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی کشاکشی ان کے لئے صبر آزما مجاہدہ ثابت ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی روح ایک عرصہ سے اس کشاکشی کو برداشت کررہی تھی۔ وہ اس ملک میں اسلام کو غالب دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے اپنی صحت و طاقت کی ساری پونجی داؤ پر لگادی تھی لیکن دور جدید کی پستی، منافقت اور "یقولون مالا یفعلون" کی پالیسی ان کی عزیمت کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایک عرصہ سے اہل زمانہ کی یہ "جفائے وفانما" ان کے جسم کو گھائل اور ان کی روح کو بے چین کئے ہوئے تھی۔ وہ محسوس کررہے تھے کہ اگر یہ روشنی جاری رہتی ہے تو یہ ملک اسلام کی برکات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائے گا۔ یہی سوز باطن ان کے لئے بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ اللّٰھم لاتحرمنا اجرہ ولاتفتنا بعدہ۔

سیدی و مرشدی حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ

۲۴ر مئی ۱۹۸۲ء (پاکستانی مطلع کے مطابق ۲۹ر رجب المرجب ۱۴۰۲ھ اور سعودی مطلع کے مطابق یکم شعبان ۱۴۰۲ھ کو) بروز دوشنبہ بوقت عصر علم و عمل اور زہد و تقویٰ کا آفتاب غروب ہوگیا۔ یعنی ہمارے شیخ قطب الاقطاب برکۃ العصر حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی نور اللہ مرقدہٗ وقدس سرہ رحلت فرمائے عالم جاوداں ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمّیٰ۔

کسی ایسی شخصیت کے اوصاف و کمالات کے بارے میں قلم اٹھانا جس کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ کا خاص اجتبائی معاملہ ہو' یوں بھی بہت ہی نازک اور کٹھن مرحلہ ہے۔ کہ ناواقف قارئین کو مبالغہ آرائی کا گمان گذرتا ہے۔ اور اہل نظر کو سطحیت کوتاہ بیانی اور مرتبہ ناشناسی کی شکایت رہتی ہے۔ ادھر حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد اس ناکارہ کے ذہن پر جمود و تعطل اور قبض کی ایسی کیفیت طاری ہے کہ احباب اصرار پر اصرار اور تقاضے پر تقاضے کررہے ہیں کہ کچھ لکھو مگر اپنا یہ حال ہے کہ ع

میں خود ہوں کہیں دل ہے کہیں' ہوش کہیں

لکھنے بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ خامہ و قرطاس سے کبھی آشنائی نہ تھی۔ اس ناکارہ کو کم از کم تحریر کے معاملے میں کبھی ایسے صبر آزما مرحلہ سے گزرنا نہیں پڑا جس کا تجربہ پہلی بار حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے سلسلہ میں پیش آیا۔ **ان العین تدمع' والقلب یحزن' ولا نقول الا ما یرضی ربنا' وانا بفراقک یا شیخ لمحزونون۔**

حق تعالیٰ شانہٗ کی عنایت ازلیہ نے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کو بہت سے گوناگوں امتیازی اوصاف و کمالات کا جامع بنایا تھا ' جن کی نظیر گذشتہ صدیوں میں بھی خال ہی خال نظر آتی ہے' بچپن میں آپ کی تعلیم و تربیت بالکل منفرد اور انوکھے انداز سے ہوئی۔ جس کا

اس زمانہ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

"الاعتدال فی مراتب الرجال" میں حضرت تحریر فرماتے ہیں

"میری ابتدائی تربیت جن اصولوں کے تحت ہوئی ہے وہ یہ تھے کہ مجھے سترہ برس کی عمر تک نہ کسی سے بولنے کی اجازت تھی، نہ بلامعیت والد صاحب رحمہ اللہ علیہ یا چچا جان کے کہیں جانے کی اجازت تھی۔ حتیٰ کہ مدرسہ کی جماعت میں سبق بھی ان دو حضرات کے علاوہ کسی مدرس سے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اور اس کی بھی اجازت نہ تھی کہ میں اپنے اکابر کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی مجلس میں بھی بلا والد صاحبؒ یا چچا جان صاحب کے ساتھ ہوئے بیٹھ سکوں کہ مبادا میں سبق کی جماعت میں، حضرت کی مجلس میں، کسی پاس بیٹھنے والے سے کوئی بات کرلوں، مجھے دو تین آدمیوں کے سوا کسی سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تنہا مکان جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں تک کہ جماعت کی نماز میں بھی مخصوص حضرات کی زیر نگرانی شرکت کرتا تھا۔ اس دور کی آپ بیتی اگر میں سناؤں تو الف لیلیٰ بن جائے کہ کس قدر تشدد مجھ پر رہا اور کس قدر سخت قیدیوں کی زندگی گذری۔ مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کے فضل نے مجھے نباہنے کی توفیق عطا فرمائی، جس کی برکات میں اب دنیا میں ہی پا رہا ہوں"۔

آپ بیتی میں اس نوع کے متعدد واقعات لکھوانے کے بعد حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:

"یہ سارے افسانے خواب ہی ہوگئے اور یہ سارے مراحل والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ختم ہوگئے۔ اس کے بعد نگرانی گویا ختم ہوگئی۔ والد صاحبؒ کے انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے یا اس سے بھی کچھ زائد حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ وقدس سرہٗ جن کا شدید اصرار والد صاحب کے بار بار بلانے پر رہتا تھا، ان کے خط کے جواب میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے

میرے ہی قلم سے تحریر فرمایا:

"اب تک عزیز زکریا کی بیڑی میرے پاؤں میں ایسی زنجیر بنی ہوئی تھی کہ میں اس کی وجہ سے کہیں آجا نہیں سکتا تھا' اللہ کا شکر ہے کہ اب اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا"۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی کسی بندے پر سب سے بڑی عنایت یہ ہے کہ اسے اپنے کام کے لئے استعمال فرمائے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ اس عنایت الٰہیہ کے خاص مورد تھے۔ ان کے دم قدم سے دین کے تین شعبے جن پر دین کی بقا کا مدار ہے' بڑی کامیابی وخوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔ ایک دینی علوم کی نشرواشاعت اور درس وتدریس کا شعبہ' دوسرا دعوت و تبلیغ اور تیسرا مجالس ذکر کو زندہ کرنا۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ دوسرے دونوں شعبوں کی سرپرستی کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ دینی مدارس اور اہل مدارس کی ہر نوع کی سرپرستی فرماتے تھے۔

جن حضرات کو حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ سے ذرا بھی قریب ہونے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت دینی مدارس کے فروغ وترقی اوران کے استحکام کے لئے کتنے فکرمند رہتے تھے۔ مدارس اور اہل مدارس کے لئے کتنی دعائیں فرماتے تھے' اور ہر مدرسہ کے احوال سے اس طرح باخبر رہتے تھے گویا مدرسہ کے نظم ونسق اور حل وعقد کی تمام ترذمہ داری حضرت کے کاندھوں پر ہے۔ اہل مدارس کو مشورے دیتے تھے اور مدارس کی خیر وبرکت میں مزید اضافے کے لئے تدبیریں ارشادفرماتے تھے۔ جن ملکوں اور خطوں میں دینی تعلیم کا رواج نہیں تھا وہاں دینی مدارس کے اجراء کی ترغیب دلاتے تھے۔

حضرت شیخ کی ایک اہم ترین خصوصیت حدیث نبویؐ سے ان کا عشق ومحبت اور غیر معمولی شغف تھا۔ علم حدیث ان کے رگ وریشہ میں سرایت کرگیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے انہیں صرف علم حدیث کی خدمت اور اس کی تشریح وترجمانی کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں:

"۱۰ محرم ۳۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد میری مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی۔ والد صاحبؒ نے خود ہی ظہر کی امامت بھی کی تھی' کہ اس زمانے میں نماز وہی پڑھایا کرتے تھے۔ اور نماز کے بعد غسل فرمایا اور اس کے بعد اوپر کے کمرے میں جو آج کل مہمان خانہ ہے اور اس زمانہ میں فارسی

خانہ تھا اور مدرسہ کے اوقات کے علاوہ میرے والد صاحبؒ اور ہم سب کی گویا رہائش گاہ بھی تھا' اس میں اس در کی جانب جو مسجد کی طرف کھلتا ہے اور وہ مدرس اول فارسی کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ان کا گدا وغیرہ وہاں بچھا رہتا تھا' اس پر کچھ بچھاکر دو رکعت نفل پڑھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوکر مشکواۃ شریف کی بسم اللہ اور خطبہ مجھ سے پڑھوایا۔ پھر قبلہ کی جانب متوجہ ہوکر پندرہ بیس منٹ تک بہت سی دعائیں مانگیں۔ لیکن میں اس وقت ان کی معیت میں صرف ایک ہی دعا کرتا رہا کہ یا اللہ! حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا' اس کو اب مرنے تک میرے ساتھ وابستہ رکھیے۔ اللہ جلّ شانہٗ نے میری ناپاکیوں' گندگیوں' سیئات کے باوجود (یہ دعا) ایسی قبول فرمائی کہ محرم ۳۲ھ سے رجب ۹۰ تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ جس میں حدیث پاک کا مشغلہ نہ رہا ہو''۔

قبولیت کا ہی ثمرہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے مدت العمر آپ کو اس خدمت میں مشغول رکھا۔ تقریباً ساٹھ سال تدریس حدیث کے علاوہ بذل المجہود' اوجز المسالک' لامع الدراری' الکوکب الدری' جزء حجتہ الوداع' وعمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم' خصائل نبویؐ اور فضائل ایسی دقیع کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں۔ ان کے علاوہ تقریباً اڑتیس کتابوں کی فہرست آپ بیتی میں درج ہے۔ جو علم حدیث سے متعلق ہیں' اور جو ابھی تک غیر مطبوعہ مسودات کی شکل میں ہیں۔ آخری لمحات حیات میں حضرت مولانا محمد عاقل صاحب زید مجدہم (جو حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے عزیز داماد اور مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس ہیں) حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے حکم سے اور آپ کی نگرانی میں صحیح مسلم کی تقریر پر کام کررہے تھے' اور روز کا کام عشاء کے بعد حضرت شیخؒ کو سناتے تھے۔ اسی ''حدیث یار'' کی تکرار میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کا پیمانۂ حیات لبریز ہوا۔

علم حدیث میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کو ایک امتیاز نصیب ہوا کہ آپؒ کے مرشد و مربی شیخ العالم حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ نے جب مدینہ طیبہ میں مستقل قیام کا ارادہ فرمالیا تو ''مظاہر علوم'' میں اپنی جگہ تدریس حدیث کی خدمت پر

حضرت شیخ کو مامور فرماتے ہوئے ان کو "شیخ الحدیث" کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:

"میری واپسی کے وقت حضرت نے جب عارضی غیبت کے انتظامات کو مکمل فرمایا تو بڑی لمبی تحریر مدرسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں حضرت مولانا سید احمد صاحب سے لکھوائی۔ اس میں اس سیاہ کار کے متعلق دو نمبر لکھوائے۔ ایک یہ کہ زکریا کو حدیث سے جتنی مناسبت ہے میں اسے خوب جانتا ہوں، اس لئے اس کو مدرسہ کا شیخ الحدیث تجویز کرتا ہوں۔ حضرت قدس سرہٗ کی یہ تحریر جب یہاں پہنچی اور حضرات سرپرستاں کے یہاں جب منظوری کے لئے گئی تو اور کون انکار کرتا۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس پر ایک اشکال کیا کہ ان سے پہلے کے اکابر مدرسین مولانا ثابت علی صاحب، مولانا عبداللطیف صاحب وغیرہ موجود ہیں، ان کے لئے یہ تفوق موجب تکدر نہ ہو اس پر غور کرلیا جائے۔ حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کا یہ اشکال میرے حضرت کو لکھا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے جواب میں لکھا کہ اگر اہل مدرسہ کو من حیث المدرسہ، مدرسہ کی طرف سے اس میں کوئی تردد ہے تو میں اپنی طرف سے یہ خطاب اس کو دیتا ہوں۔ حضرت قدس سرہٗ کی برکت سے اس نے ایسی شہرت پائی کہ نام سے بھی زیادہ مشہور ہوگیا"۔ (آپ بیتی)

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی علم حدیث میں مہارت کا ہی نتیجہ تھا کہ اکابر مشائخ حدیث، علم حدیث کی مشکلات میں آپ سے رجوع کرتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے زہد و تقویٰ، خشیت و انابت، عزیمت و توکل، ایثار و قربانی، جود و سخا، وسعت ظرف، علوہمت، محبت و محبوبیت وغیرہ اوصاف و کمالات، جن تک ہم ایسے کوتاہ بینوں کی نظر پہنچ سکتی ہے وہ بھی اس قدر ہیں کہ ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ اور بہت سے کمالات تو ہم ایسوں کی فکری پرواز سے بھی بالاتر ہیں۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

([illegible] شوال ۱۴۰۲ھ مطابق جولائی۔ اگست ۱۹۸۲ء)

حضرت شیخؒ کا رمضان

حق تعالیٰ شانہٗ نے رمضان مبارک میں اپنے مخلص بندوں کے لئے عبادات کا ایک ایسا نظام تجویز فرمایا ہے کہ اگر اس کے صحیح حقوق ادا کئے جائیں تو اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ جس کی طرف قرآن کریم نے "**لعلکم تتقون**" کے بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

اس لئے ہمارے اکابر ومشائخ کو رمضان مبارک کا ہمیشہ سے بہت اہتمام رہا ہے، جس کی تفصیلات حضرت شیخ مدظلہٗ کے رسالہ "اکابر کا رمضان" سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے حضرت اقدس حکیم الامت تھانویؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت اقدس رائے پوریؒ کے یہاں رمضان مبارک میں جو بہار رہا کرتی تھی اسے دیکھنے والی آنکھیں تو ابھی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان اکابر کے یہاں سینکڑوں کی تعداد میں ذاکرین جمع ہوتے تھے اور پورا مہینہ ذکر وشغل، تلاوت قرآن اور انقطاع الی اللہ کی نورانی فضاؤں میں گزرتا تھا۔

قطب الارشاد برکۃ العصر حضرت مولانا الشیخ الحاج الحافظ محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی دامت فیوضہم وبرکاتہم کا (جن کی شخصیت اکابر مشائخ کی نسبتوں کی مجمع البحار ہے) معمول ایک عرصہ سے پورے رمضان المبارک کے اعتکاف کا چلا آتا ہے۔ ماہ رمضان کے بابرکت اوقات کو زیادہ سے زیادہ قیمتی بنانے اور شیخ مدظلہ العالی کے انفاس طیبہ سے مستفید ہونے کی غرض سے حضرت مدظلہ العالی کے بہت سے خدام ومتوسلین بھی آپ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں۔ "ارشاد الملوک" کے مقدمہ میں (جو ربیع الثانی ۸۷ھ میں لکھا گیا) حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"تقریباً تیس سال سے کچھ احباب یہاں رمضان گزارنے آتے ہیں۔۔۔

دو تین سال سے ماہ مبارک میں آنے والوں کا سلسلہ اندازہ سے زیادہ بڑھنے لگا، گزشتہ سال دو سو سے متجاوز ہوگیا اور امسال ماہ مبارک کے ختم پر ساڑھے تین سو سے متجاوز ہوگیا"۔

حضرت شیخ مدظلہٗ کا رمضان ہندوستان میں ہوتا تھا (اور جب سے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی ہے متعدد رمضان وہاں بھی ہوئے) اس لئے پاکستان کے بہت سے خدام اس سعادت سے محروم رہتے تھے۔ اس سال یہ سعادت عظمیٰ پاکستان کے حصہ میں آئی اور یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی چنگاری روشن کرنے کے لئے حضرت شیخ مدظلہ العالی نے باشارۂ غیبی فیصل آباد رمضان گذارنے کا قصد فرمایا۔ چنانچہ مدینہ طیبہ سے ۳؍ جولائی جمعرات کی صبح کو ساڑھے نو بجے سعودی جہاز سے روانگی ہوئی۔ ایک گھنٹہ ریاض ٹھہرتے ہوئے ساڑھے چار بجے کراچی پہنچے، مکی مسجد میں قیام فرمایا۔ ۷؍ جولائی کو ساڑھے آٹھ بجے کراچی سے پرواز ہوئی اور ملتان ایک گھنٹہ ٹھہرتے ہوئے بارہ بجے فیصل آباد پہنچے اور حضرت مفتی زین العابدین صاحب مدظلہ کے دارالعلوم فیصل آباد پیپلز کالونی نمبر۲ میں قیام رہا۔ باتوفیق وسعادت مند حضرات ماہ مبارک شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔ جو حضرات شروع رمضان سے ہی معتکف تھے ان کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ اور آخری عشرہ میں اعتکاف والوں کی تعداد پانچ سو سے متجاوز ہوگئی۔ غیر معتکف حضرات شروع میں پانچ سو کے قریب تھے اور آخری عشرہ میں ان کی تعداد پندرہ سو سے بڑھ گئی تھی۔ روزانہ سینکڑوں آدمیوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس ناکارہ کا عزم پورے ماہ مبارک کی حاضری تھا لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بناء پر یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آخری عشرہ کے اعتکاف کی توفیق عطا فرمادی۔ وہاں انوار وبرکات کا جو فیضان ہورہا تھا اور رحمت وتجلیات کی جو بارش ہورہی تھی اس کا ادراک تو مجھ ایسے کور باطن کو کیا ہوسکتا ہے تاہم ظاہری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس کی منظر کشی بھی اس کوتاہ قلم کے لئے ممکن نہیں۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
لیکن حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

اس منظر کو دیکھتے ہی جو پہلا تاثر قلب پر نقش ہوا وہ یہ تھا کہ گویا نور کا ایک دریا بہہ رہا ہے اور خدا تعالیٰ کے سعادت مند بندے حسب توفیق اس کی غواصی میں مصروف ہیں۔ **فمن مقل و من مکثر**

ذاکرین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد گرامی ہے:

لایقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتھم الملائکۃ وغشیتھم الرحمۃ ونزلت علیھم السکینۃ وذکرھم اللہ فی من عندہ۔

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ شریف ص۱۹۶)

"جب کچھ لوگ ذکر الٰہی کے لئے بیٹھتے ہیں تو فرشتے ان کا گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ رحمت ان کو ڈھانک لیتی ہے۔ سکینت ان پر نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے پاس کے فرشتوں میں فرماتے ہیں"۔

اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو رہا تھا جسے دیکھ کر مجھ جیسے روسیاہ کو بھی **"اولئک قوم لایشقی جلیسھم"** کی آس بندھتی تھی۔ ماہ مبارک کے انوار و تجلیات کا شباب تھا۔ شبانہ روز ذکر و تلاوت کے انوار متعاکسہ فضا کو معمور و منور کر رہے تھے۔ اور حضرت شیخ مدظلہ العالی کی صحبت و توجہ مردہ دلوں کی مسیحائی کا کام کر رہی تھی۔

نظر ہی سے بھر دی رگ و پے میں بجلی
نظر دیدہ برق تپاں ہو رہا ہے

اس سہ آتشہ شراب محبت سے پورا مجمع مست و مخمور نظر آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کاش ہماری دنیا یہاں سمٹ آتی اور اس دولت بے بہا کی بہاریں لوٹ لے جاتی۔

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں راچہ شد

حضرت شیخ مدظلہ العالی کے پورے رمضان مبارک کا روزنامچہ جناب مولانا عبدالحفیظ صاحب (نزیل مدینہ) نے قلمبند کیا ہے۔ یہاں شب و روز کے معمولات کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

افطار کے دس منٹ بعد اذان ہوتی تھی۔ نماز کے پندرہ منٹ بعد دستر خوان لگ جاتا۔ معتکفین کے لئے سحری وافطاری کا انتظام مسجد میں ہوتا تھا اور غیر معتکفین کے لئے مسجد سے باہر مدرسہ کے صحن میں۔

ساڑھے آٹھ بجے حضرت کے معتکف کا دروازہ کھلتا اور بیعت ہوتی۔ بیعت ہونے والے حضرات کا ہجوم مغرب کے بعد ہی سے شروع ہوجاتا۔ اسی وقفہ میں بعض بچے قرآن کریم کے حفظ کا افتتاح بھی کرتے اور پانی یا نمک پر دم کرانے والوں کا بھی خوب زور بندھتا۔

۹ بجے عشاءؔ کی اذان ہوتی اور ساڑھے نو بجے نماز شروع ہوتی۔ تراویح مولانا سلمان صاحب زید مجدہٗ نے (جو حضرت شیخ مدظلہٗ کے عزیز ہیں) پڑھائی ۔ جو خوب صاف اور تیز پڑھتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے کے قریب نماز سے فراغ کے بعد سورۂ یاسین شریف پڑھی جاتی اور طویل دعا ہوتی۔ (جو معمولاً مولانا عبدالحفیظ کے ذمہ تھی) دعا میں پوری امت کے لئے خیر ورشد' دنیا وآخرت کی بھلائی اور ہدایت وتوفیق مانگی جاتی۔ حضرت مدظلہ العالی کے حکم سے حرمین شریفین کی تمام فتنوں سے حفاظت کی دعا کا بہت ہی اہتمام ہوتا۔ دعا سے فراغ کے بعد پہلے درود وسلام کی چہل حدیث پڑھی جاتی (معمولاً یہ مولانا معین الدین مراد آبادی کے ذمہ تھی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں درود وسلام اس طرح پڑھتے کہ سننے والوں کو بھی وجد آجاتا۔ ۲۷ویں شب کو وہ تشریف لے گئے تو ان کے بعد جناب مولانا احسان الحق رائے ونڈ والوں کے ذمہ رہی) اور پھر کتاب فضائل درود شریف پڑھی جاتی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے تک یہ سلسلہ رہتا۔ اس کے بعد بعض حضرات آرام کرتے اور بعض تلاوت میں مشغول ہوجاتے۔ مسجد کا صحن اسی مقصد کے لئے خالی رکھا گیا تھا۔ پانچ سات جگہ قرآن مجید سنا جارہا تھا اور بہت سے حضرات اپنی تلاوت فرماتے۔

رات ۲ بجے سحری کے لئے دستر خوان لگ جاتا اور اڑھائی بجے سونے والوں کو سحری کے لئے اٹھادیا جاتا۔ گویا تہجد اور کھانا بیک وقت چلتے۔ وقت سحر ختم ہوجانے پر اذان ہوتی اور اس کے دس منٹ بعد نماز۔ فجر کی نماز میں قنوت نازلہ ہوتی جس میں افغانستان کے علاوہ حرمین شریفین کی حفاظت کے لئے بطور خاص دعا ہوتی۔ نماز فجر کے بعد نئے آنے والے یا رخصت ہونے والے مہمان حضرت شیخ مدظلہٗ سے مصافحہ کرتے جس کا

سلسلہ کم وبیش آدھ پون گھنٹے تک جاری رہتا (آخری ایام میں ہجوم بہت بڑھ گیا تھا)
نماز فجر کے بعد اکثر حضرات آرام کرتے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اٹھ کر اپنے انفرادی معمولات میں مشغول ہوجاتے۔ ۱۱ بجے مفتی محمود گنگوہی مدظلہ العالی کی سلوک وتصوف کے موضوع پر آدھ گھنٹہ کے قریب تقریر ہوتی (بعض حضرات نے ان تقریروں کا خلاصہ بھی قلمبند کیا اور کچھ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ بھی محفوظ کی گئیں)۔
۱ بجے ظہر کی اذان اور اڑھائی بجے جماعت ہوتی۔ ظہر سے فراغ کے بعد پہلے ختم خواجگاں ہوتا اور پھر طویل دعاء ہوتی (جو مولانا عبدالحفیظ صاحب کے ذمہ تھی) دعا سے فارغ ہوکر ذکر ہوتا۔ جن حضرات کو ذکر بالجہر کی اجازت ہے وہ ذکر جہر کرتے۔ باقی حضرات اپنی تسبیحات و معمولات میں مشغول رہتے۔ ساڑھے پانچ بجے عصر کی نماز ہوتی اور عصر کے بعد مغرب سے آدھ گھنٹہ پہلے تک حضرت کی مجلس میں کتاب پڑھی جاتی۔ آخری عشرہ میں "ارشاد الملوک" ختم ہوکر "اکمال الشیم" شروع ہوئی۔ اس کے بعد نماز مغرب کی تیاری شروع ہوجاتی اور افطار تک دعا واستغفار میں مشغول رہتے۔ جمعہ کے دن عصر کے بعد کتاب سے پہلے اسّی (۸۰) مرتبہ درود شریف (**اللّٰهم صل علٰی سیدنا ومولانا محمدٍ النبی الامی واٰلہٖ وسلم تسلیما**) کا التزام کیا جاتا۔

پانچوں نمازوں کے علاوہ مغرب کے بعد بیعت کی نشست میں اور عصر وعشاء کے بعد کی مجلسوں میں نیز فجر کے بعد مصافحہ میں مشتاقین کو حضرت شیخ مدظلہٗ العالی کی زیارت کا موقع مل جاتا۔ اس کے علاوہ جس شخص کو کچھ عرض معروض کرنا ہوتی یا کچھ دریافت کرنا ہوتا اس کو الگ وقت دیا جاتا۔ مولانا نذیر احمد صاحب استاذ حدیث دارالعلوم فیصل آباد کی تحریک پر علماء کرام کی ایک جماعت کو دو الگ الگ نشستوں میں حدیث کی اجازت بھی مرحمت فرمائی گئی اور انہیں سندیں بھی عطا کی گئیں۔ عید کے دن نماز فجر کے بعد حضرت شیخ مدظلہٗ کی طرف سے کھجور اور پانی کی ضیافت کی گئی اور حدیث مسلسل بیوم العید اور مسلسل بالاسودین سنا کر مسلسلات کی اجازت دی گئی۔

فیصل آباد کے مخلصین نے بڑے خلوص وجفاکشی سے حضرت شیخ مدظلہٗ کے مہمانوں کا اکرام کیا، اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خود بے آرام رہ کر سب مہمانوں کو آرام پہنچایا۔ حضرت کی خوب دعائیں حاصل کیں۔ اتنے بڑے مجمع میں ہر ذوق

ومزاج کے آدمی ہوتے ہیں اور ہر ایک کے ذوق کی رعایت رکھنا بہت ہی صبر آزما کام ہے۔ لیکن انہوں نے بڑی کمال حوصلگی وخندہ پیشانی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ افطاری کے علاوہ دونوں وقت کے کھانے میں متنوع قسم کے سالن اور دیگر ماکولات ہوتے تھے۔ اور دستر خوان کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ بہت ہی معزز ومکرم مہمانوں کو کھانا کھلایا جارہا ہے۔ بڑی بڑی باراتوں کو کھانا کھاتے دیکھا لیکن سکون واطمینان، اعزاز واکرام اور خلوص ومحبت کا یہ نقشہ ان بزرگان دین کے دستر خوان کے سوا کہیں نہیں دیکھا، ہمارے لدھیانہ کے حاجی اسماعیل صاحب (پہلوان) اور حاجی ابراہیم صاحب مع اپنی آل اولاد کے حضرت شیخ مدظلہٗ کے مہمانوں کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ افطاری کے وقت ایک ایک مہمان کے منہ میں خود اپنے ہاتھوں سے کھجور مکھن ڈالتے اور کھانے کے اوقات کے علاوہ بھی معزز مہمانوں کے پاس جاکر ان کی ضروریات کا تتبع کرتے اور فواکہ وغیرہ ہدیہ کرتے۔ حق تعالیٰ شانہٗ، ان سب کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے خلوص میں برکت وترقی عطا فرمائے۔

ہمارے اکابر کے نزدیک علوم ظاہرہ سے فراغ کے بعد کسی صاحب دل وصاحب نظر کی خدمت میں رہ کر نفس کے رذائل کی اصلاح کرانا اور قلب کو یاد الٰہی سے معمور ومنور کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بغیر وہ ظاہری علوم کو برکت سے محروم، نافعیت سے بے بہرہ اور ناقابل اعتماد تصور کرتے تھے۔

بے عنایات حق وخاصان حق
گر ملک باشد سیاہ ہستش ورق

چنانچہ ہمارے بزرگوں میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو کسی شیخ کامل کے دامن سے وابستہ اور سلوک وتصوف کی وادی کا راہ نورد نہ ہو۔ ہمارے اکابر کی یہی خصوصیت تھی جس نے ان کو قال وحال، ظاہر وباطن اور شریعت وطریقت کا جامع بنادیا تھا، ان کے قلوب حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت، عشق نبویؐ، صحابہ کرامؓ اور بعد کے اولیاء اللہؒ سے والہانہ تعلق وعقیدت سے منور تھے، انہیں اتباع سنت نبویؐ کا اہتمام تھا، بدعت سے تنفر تھا، ان کے تمام اعمال میں اخلاص واحسان، تعلق مع اللہ اور نسبت یادداشت کی روح کارفرما تھی۔ تواضع، فنائیت اور اپنے آپ کو ایسا مٹانا کہ اپنی ہستی پر نظر ہی نہ رہے۔ یہ ان کا طغرائے امتیاز تھا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے بارے میں تذکرۃ الرشید" میں لکھا ہے:

"مولانا کی مدتوں یہ عادت رہی کہ جمعہ کے دن علی الصباح دیوبند سے پاپیادہ گنگوہ پہنچتے اور جمعہ کی نماز حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ) کے پیچھے ادا فرماکر رات کو دیوبند آجاتے۔ کیونکہ صبح کو مدرسہ میں درس دینا ہوتا تھا۔ ہر ہفتہ ایک دن میں چالیس کوس کی مسافت طے کرنا جس غلبۂ شوق و محبت میں ہوتا تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ تکان نہ مانتے تھے۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تو چھپ چھپاتے جا پہنچتے اور عام خدام کی طرح بیٹھ جاتے۔ ایک بار حضرت نے آپ کے متعلق یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ "مولوی محمود حسن تو علم کا کٹھلا ہیں" (ص۱۵۵ ج۲)

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے رسالہ "میرے والد ماجد" میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یاسین صاحبؒ کا ایک فقرہ نقل کیا ہے جو ہمارے اکابر کے ذوق و مزاج اور ان کے طریقہ و عمل کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ آخری وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے لے کر ادنیٰ مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم اس زمانہ میں دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔" (ص ۵۲)

حق تعالیٰ ان کے نام لیواؤں کو تعلق مع اللہ کی یہ دولت نصیب فرمائیں۔
وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سید محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ واتباعہٖ اجمعین۔

(اشاعت خاص بینات محرم الحرام ۱۳۹۸ھ مطابق جنوری ۱۹۷۸ء)

مولانا قاری رحیم بخش پانی پتیؒ

۱۱ر۱۲ر ذوالحجہ ۲۹ر۳۰ر ستمبر (بدھ جمعرات) کی درمیانی شب کو ساڑھے دس بجے استاذ القراء حضرت اقدس مولانا الحاج، الحافظ، القاری، المقری رحیم بخشؒ پانی پتی ملتان میں رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ حضرت اقدس مولانا الحاج الحافظ القاری فتح محمد مدظلہٗ العالی کے محبوب ترین شاگرد اور علم تجوید وقرأت میں اپنے وقت کے امام تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے۔ تقسیم سے چند سال قبل مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھری قدس سرہٗ انہیں ملتان لائے، جب کہ حضرت قاری صاحب ابھی سبزہ آغاز تھے، اور "مدرسہ محمدیہ مسجد سراجاں ملتان" میں قرآن کریم کی تعلیم وتدریس اور تحفیظ کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ حضرت قاری صاحبؒ بے حد نازک مزاج تھے، نوعمری کا زمانہ تھا، اور ماحول ان کے لئے یکسر نامانوس تھا، لیکن مولانا محمد علیؒ کے اخلاص وتواضع نے حضرت قاری صاحبؒ کو جمائے رکھا۔ تقسیم کے بعد جب مدرسہ عربی خیر المدارس جالندھر سے ملتان منتقل ہوا تو مولانا محمد علی صاحبؒ نے "مدرسہ محمدیہ" خیر المدارس میں ضم کردیا۔ اب حضرت قاری صاحب استاذ العلماء سیدی ومرشدی حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھری قدس سرہٗ کی سرپرستی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ تاہم مسجد سراجاں بدستور ان کا مستقر اور ان کے فیوض وبرکات کا مرکز رہی۔ آخری لمحہ تک وہ خیر المدارس کے صدر شعبۂ قرأت وتجوید اور مسجد سراجاں کے خطیب رہے۔ گویا پہلے دن جہاں قدم رکھا تھا وہیں سے سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی بعض صفات قابلِ صد رشک اور لائقِ تقلید تھیں، انہیں قرآن کریم سے عشق کی حد تک شغف تھا۔ فرائض شرعیہ او حوائج بشریہ کے

علاوہ شاید ان کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں وہ قرآن کریم کی تعلیم وتدریس یا اپنی تلاوت میں مشغول نہ ہوں' اوقات تدریس کی پابندی ان کی طبیعت کا ثانیہ بن گئی تھی' سردی گرمی' موسمی تغیرات' ضعیفی وکمزوری کوئی چیز ان کے راستہ میں حائل نہیں ہوتی تھی' اور مدرسہ کے وقت سے پہلے وہ درس گاہ میں موجود ہوتے تھے' حج وعمرہ پر تشریف لے جاتے (جو آخری سالوں میں قریباً سالانہ معمول بن گیا تھا) تو واپسی پر کراچی میں ایک رات بھی قیام گوارا نہ فرماتے۔ (حالانکہ یہاں ان کی صاحبزادی اور دیگر اعزہ ہیں) بلکہ آتے ہی ایسی گاڑی سے سفر فرماتے جو صبح سویرے ملتان پہنچادے۔ اور اسٹیشن سے سیدھے خیرالمدارس اپنی درس گاہ میں تشریف لے جاتے اور تعلیم کے اوقات ختم ہونے کے بعد گھر جاتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت قاری صاحبؒ سفرحج سے واپسی پر پہلے گھر تشریف لے گئے ہوں اور وہاں سے درس گاہ تشریف لائے ہوں۔

حضرت قاری صاحب کے یہاں صرف مدرسہ ہی کے اوقات کی پابندی نہ تھی بلکہ ان کی تعلیم کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ عموماً مدرسہ کے گھنٹہ سے آدھ گھنٹہ پہلے گویا فجر کی نماز کے متصل ہی حضرت قاری صاحب کی درس گاہ میں تعلیم شروع ہوجاتی تھی' ہمارے مدارس میں عصر سے مغرب تک کا وقت چھٹی کا ہے لیکن حضرت قاری صاحب کے ہاں اس وقت بھی تعلیم جاری رہتی تھی۔ اور پھر تعلیم وتدریس کے ان طویل ترین اوقات میں حضرت قاری صاحبؒ ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ شخص اتنی طویل نشست پر کیسے قادر ہے؟

حضرت قاری صاحب طلباءؓ کی چھٹی کے قائل نہیں تھے' مریض طلباءؓ کو بھی حکم تھا کہ اگر وہ پڑھنے پر قادر نہیں تو درس گاہ میں آکر لیٹ رہیں، لیکن درس گاہ سے غیر حاضری انہیں گوارا نہ تھی۔ بعض اوقات کسی طالب علم کی بیماری نازک صورت اختیار کرلیتی لیکن حضرت قاری صاحب کو اس کی درس گاہ سے غیر حاضری تب بھی گوارا نہ ہوتی۔ ان کا ارشاد تھا کہ قرآن کریم شفائے مطلق ہے، اگر کسی کو قرآن سے شفا نہیں ہوتی تو اس کا مرنا ہی بہتر ہے۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ حضرت قاری صاحب نے خود راقم الحروف کو سنایا کہ ایک طالب علم کی بیماری کچھ نازک صورت اختیار کرگئی، اس کے اعزہ کو تشویش ہوئی اور انہوں نے اسے ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا، حضرت قاری صاحب نے فرمایا "اگر اسے بچانا ہے تو یہیں درس گاہ میں پڑا رہنے دو اور اگر مارنا ہے تو

ہسپتال لے جاؤ" اس کے اعزہ اسے ہسپتال لے گئے، تین چار دن علاج ہوتا رہا، بالآخر ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کیا۔ لڑکے کے والد اور چچا روتے ہوئے حضرت قاری صاحبؒ کے پاس آئے اور کہا لڑکے کی حالت مایوس کن ہے۔ آپ نے کہہ دیا تھا کہ" اگر مارنا ہے تو ہسپتال لے جاؤ" خدا کے لئے آپ یہ کہہ دیجئے کہ وہ بچ جائے گا۔ حضرت قاری صاحب فرماتے تھے کہ میں نے کہا کہ بندہ خدا! میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تو میں نے یونہی جذبات میں کہہ دیا تھا۔ میرے کہنے سے سچ مچ مر تھوڑی جائے گا۔ مگر وہ بضد ہوئے کہ نہیں! آپ ضرور کہہ دیجئے کہ وہ مرے گا نہیں۔ میں نے کہا اچھا اسے درس گاہ میں لاکر لٹادو، ان شاء اللہ ٹھیک ہوجائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا اس نیم مردہ کو درس گاہ میں لاکر لٹادیا گیا، اور حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے پاک کلام کی برکت سے اسے چند یوم میں صحت عطا فرمادی۔ قرآن کریم حضرت قاری صاحب کے رگ وریشے میں رچ بس گیا تھا اور قرآن کریم کا نور ان کے چہرے میں جھلکتا تھا۔

حضرت قاری صاحب پہلے غالباً حضرت شیخ الاسلام السید الامام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت ہوئے۔ ان کے وصال کے بعد قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے۔ آخر میں قطب العالم سیدی ومرشدی حضرت شیخ مولانا الحاج الحافظ مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے رجوع کیا۔ اور حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی جانب سے اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت قاری صاحب کو رعب وجلال کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ اس کے باوصف ان کی شان مومنین وقانتین کی تھی، اپنے خوردوں کے ساتھ بھی غایت تواضع سے پیش آتے تھے۔ اور بعض اوقات ان کا متواضعانہ برتاؤ ناواقف لوگوں کے لئے حیرت واستعجاب کا موجب ہوتا تھا۔ اپنے شیخ حضرت اقدس قاری فتح محمد صاحب" مدظلہ العالی کے سامنے اس طرح متادب ہوکر بیٹھتے جیسے طالب علم درس گاہ میں استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ اس ناکارہ نے انہیں حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کے سامنے چار زانو بیٹھتے یا کھل کر بولتے نہیں دیکھا۔ ان کی یہی کیفیت دیگر اکابر کے سامنے ہوتی تھی، حضرت اقدس مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ سے انہیں نہ شاگردی کا تعلق تھا نہ بیعت وارادت کا، لیکن ان کا ادب واحترام اسی طرح کرتے تھے جس طرح ایک مرید اپنے شیخ کا کرتا ہے۔

حضرت قاری صاحب اپنے شاگردوں کے لئے جتنے سخت نظر آتے تھے اسی قدر

انہیں اپنے تلامذہ سے محبت وشفقت تھی، اور اس شفقت کا ظہور مختلف انداز سے ہوتا تھا جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جس طالب علم نے ان سے پڑھا ہو اور وہ خیر المدارس میں زیر تعلیم ہو تو مشکواۃ شریف کے درجے تک اس پر پابندی تھی کہ وہ صبح کی منزل حضرت قاری صاحب کی درس گاہ میں آکر پڑھے گا۔ البتہ دورۂ حدیث کے طلباءؒ اس پابندی سے مستثنیٰ تھے۔ حضرت قاری صاحب نے قریباً چالیس برس قرآن کریم کی جس شغف ومحبت سے خدمت کی ہے امید ہے کہ کریم آقا کی بارگاہ میں ضرور قبول ہوئی ہوگی، اور کریم آقا کی جانب سے اس کا بھرپور صلہ ملا ہوگا۔ علاوہ ازیں حضرت قاری صاحب سے ہزاروں طلباءؒ نے قرآن کریم حفظ کیا اور ان میں سینکڑوں حضرات اندرون وبیرون ملک قرآن کریم کی تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ حضرت قاری صاحب کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔ بحمد اللہ آج حرمین شریفین میں بھی ان کے تلامذہ قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حضرت قاری صاحب ایک عرصہ سے علیل چلے آتے تھے کئی بار ان پر دل کا حملہ ہوا لیکن خدا تعالیٰ کی مہربانی کے دنوں میں ان کو بلاوا آگیا۔ اور وہ ۱۱ر۱۲ ذو الحجہ کی درمیانی شب میں جوار رحمت میں منتقل ہوگئے۔ .... جمعرات کو تین بجے نماز جنازہ حضرت مولانا محمد اسلم صاحب مدظلہ العالی خطیب جامع مسجد نشتر کالج نے پڑھائی اور خیر المدارس ملتان کے احاطے میں حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے درمیان تدفین ہوئی۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ داراً خیراً من دارہ واھلاً خیراً من اھلہ۔

(بینات محرم الحرام ۱۴۰۳ھ مطابق نومبر ۱۹۸۲ء)

حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

۶ر شوال المکرم ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار حضرت اقدس حکیم الاسلام مولانا الحاج الحافظ القاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ، ۸۸ سال کی عمر میں عالم فنا سے عالم بقا کی طرف رحلت فرما ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کی عبقری شخصیت گوناگوں فضائل وکمالات کا مجموعہ تھی، وہ اپنے دور کے بہترین قاری، جید حافظ، صاحب کمال عالم، قوی النسبت شیخ طریقت، بے بدل خطیب، صاحب طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادر الکلام شاعر، کامیاب مدرس، شگفتہ قلم مصنف، حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلف کے امین تھے۔

حضرت مرحوم حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ، کے پوتے تھے۔ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں عالم وجود کو رونق بخشی۔ اہل اللہ کی آغوش محبت میں پھلے پھولے۔ قاعدہ بغدادی کی بسم اللہ سے لے کر علوم عالیہ کی تکمیل تک سب کچھ دارالعلوم میں ہی پڑھا۔ دارالعلوم کے اس دور کے خضر صفت اساتذہ نے نہایت محبت وشفقت اور محنت وتوجہ سے پڑھایا۔ حدیث میں امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ قدس سرہٗ سے تلمذ تھا۔ ۱۳۳۷ھ میں سند فراغ حاصل کی۔ اور دارالعلوم ہی میں حسبۃً للہ تدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۸ھ تک اپنے اکابر کی موجودگی میں دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے، اور ۱۳۴۸ھ سے اہتمام کے منصب پر فائز ہوئے۔ قدرت فیاض نے انہیں حسن وجمال اور فضل وکمال کے ساتھ ساتھ عقل ودانش، فہم وفراست، حلم ووقار، حسن تدبیر اور نظم ونسق کی بے پناہ صلاحیتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔

حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ کی مالٹا سے تشریف آوری پر ان سے بیعت ہوئے۔ اور ان کے وصال کے بعد حضرت اقدس حکیم الامت شاہ

اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے سلوک کی تکمیل کی' اور خلافت واجازت سے مشرف ہوئے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو خطابت کا خاص ذوق ' زبان وبیان کا خاص انداز اور افہام وتفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا' اردو' فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے' زبان ایسی صاف اور شستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی ہے اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ حقائق وواقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہوکر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم ومعرفت کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور علوم وہبیہ کا طوفان اُمڈ آیا ہے۔ حضرت مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب کیا ہوگا اور بعض اوقات ایک ایک دن کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر وخطابت کی نوبت بھی آئی لیکن ان کی ہر تقریر کا موضوع منفرد ہوتا تھا، اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف واسرار کے ایسے گل ولالہ بکھیرتے کہ حقائق معارف کے چمنستان میں نئی بہار آجاتی۔ ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو بلا تکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ایک موقع پر یہ مضمون ارشاد فرمارہے تھے کہ مطالب ومعانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں' اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ "کیا بات ہے؟" پیش کیا کہ یہ انکار کے لئے بھی ہے اور اقرار کے لئے بھی' استفہام کے لئے بھی ہے اور اخبار کے لئے بھی' داد وتحسین کے لئے بھی ہے اور تحقیر وتضحیک کے لئے بھی' شاباش اور آفرین کے لئے بھی ہے اور زجر وتوبیخ کے لئے بھی۔

الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک "کیا بات ہے؟" کی تشریح ہوتی رہی اور حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب ولہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے۔ اور مجمع سحر بیان سے عش عش کررہا تھا۔ حضرت مرحوم کی بعض تقریریں وقتاً فوقتاً شائع بھی ہوتی رہیں۔ حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہ (خطیب مسجد غفوریہ' حسن پروانہ کالونی ملتان) نے حضرت کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کرکے "خطبات حکیم الاسلام"

کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں۔ اور اگر یہ محنت و جستجو جاری رہی اور حضرت کی جتنی تقریریں محفوظ کرلی گئیں ہیں وہ سب شائع کردی گئیں تو امت کے لئے حقائق ومعارف اور "کلمات طیبات" کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہوجائے گا۔

تقریر وخطابت کی طرح حضرت مرحوم کا تصنیف و تالیف میں بھی ایک خاص رنگ تھا' جس میں علم و عقل کی ہم آہنگی اور ظاہر وباطن کی یکجائی پائی جاتی تھی' ان کی خداداد حکمت ومعرفت' مسائل کے اسباب وعلل' اسرار و حکم' مبادی وغایات اور اطراف وجوانب کا احاطہ کرلیتی تھی۔ موصوف کو حسین وشیریں الفاظ میں مافی الضمیر ادا کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ دقیق ترین مسائل کو بہت ہی آسان عبارت میں ادا فرماتے تھے۔ اور ایسے ژولیدہ وپیچیدہ مباحث' جن میں برسوں لوگ بھٹکتے ہیں اور انہیں اس کا کوئی سرا نہیں ملتا حضرت" کا قلم حقائق رقم ایسے مباحث کو بڑی سہولت وسلاست سے حل کردیتا تھا' اور ان کی تحریر پڑھ کر آدمی محسوس کرتا کہ اس موضوع پر اس کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں رہی۔ انہوں نے سیرت طیبہ سے لے کر مسئلہ تقدیر تک بڑے نازک مسائل پر قلم اٹھایا مگر ان کا خاص معیاری اسلوب ہر جگہ قائم رہا۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ محض ذہن کی صناعی اور الفاظ کی مینا کاری نہیں بلکہ یہ وہبی علوم ہیں اور ان میں "قاسمی روح" جھلکتی ہے۔

حضرت مرحوم کا ایک عظیم الشان کارنامہ قریباً ساٹھ برس تک مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی انتظامی خدمات ہیں۔ صرف دارالعلوم کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دیگر اداروں میں بھی اتنی طویل مدت تک منصب اہتمام پر فائز رہنے کی مثالیں شاذونادر ہی ملتی ہیں۔ جشن صد سالہ کے بعد بعض خفی وجلی وجوہ واسباب کی بناء پر دارالعلوم میں خلفشار کی صورت پیدا ہوئی اور حضرت مرحوم کے لئے اپنی پیرانہ سالی اور ضعف وانحطاط کی وجہ سے اس کا سلجھانا ممکن نہ رہا۔ اس لئے عمر کے آخری دو سال دارالعلوم کے اہتمام و نظم ونسق سے لاتعلق رہے۔ مگر آپ کا روحانی و قلبی تعلق دارالعلوم سے بدستور قائم رہا اور ہمیشہ دارالعلوم کے لئے خیر طلب اور دعاگو رہے۔ اور وصیت فرمائی کہ آپ کی نماز جنازہ دارالعلوم کے احاطہ میں ہو۔

حضرت کی صحت کافی عرصہ سے کمزور چلی آرہی تھی اور ایک سال سے تو قریباً صاحب فراش تھے۔ بالآخر وہ وقت موعود آپہنچا جس سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں' ان للہ

ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل عندہ باجل مسمیٰ۔

حضرتؒ کی وفات حسرت آیات اہل حق کے لئے عظیم سانحہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہ مرحوم کو درجات عالیہ عطاء فرمائیں اور تمام متعلقین اور پس ماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائیں۔

اللّٰہم اغفرلہ وارحمہ وعافہٖ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس وابدلہ دارا خیرًا من دارہٖ واھلاً خیرًا من اھلہٖ وادخلہ الجنۃ واعذہ من النار ومن فتنہ القبر برحمتک یا ارحم الراحمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد والہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

(بینات ذیقعدہ ۱۴۰۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۳ء)

مولانا لطف اللہ پشاوریؒ

۴ر اگست ۱۹۸۳ء مطابق ۲۵ر شوال ۱۴۰۳ھ شب جمعہ کو حضرت مولانا لطف اللہ پشاوری واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم دارالعلوم دیوبند میں حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے آخری سال دورہ حدیث سے فارغ ہوئے۔ مرحوم نے جو مقالہ حضرت بنوری قدس سرہٗ پر لکھا تھا اس میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ میرے دورے کا سال تھا اور مولانا بنوری کا مشکوٰۃ کا، میں تو امتحان دے کر وطن پشاور آگیا، ادھر دیوبند میں مشہور زمانہ اسٹرائک ہوگئی، جس میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد، مولانا بدر عالم اور مولانا سراج احمد وغیرہ دارالعلوم دیوبند سے ڈابھیل (چلے) گئے۔ (بہت سے طلبہ بھی ان کے ساتھ تھے) ان میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ بھی شامل تھے۔ وہیں آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔"

(بینات بنوری نمبر۲۶ باختصار و تغیر یسیر)

مرحوم ایک جید عالم تھے، حضرت امام العصر کے ممتاز تلامذہ کی صف اول میں شمار ہوتے تھے، ادب عربی میں بلند ذوق رکھتے تھے، تاریخ سے خصوصی شغف تھا، اور تفسیر اور علوم قرآنیہ میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے بیعت وارادات کا تعلق تھا، اور علوم باطنی میں انہی سے اکتساب فیض کیا۔

ہمارے شیخ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ سے محبت ویگانگت کا ایسا خصوصی تعلق تھا جس کی مثال کمیاب ہے، حضرت بنوریؒ سے مرحوم کا رابطہ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے دور میں ہوا، مرحوم اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

"ہم دونوں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے' دونوں چھتہ مسجد کے حجرے میں رہتے تھے' ہماری عمر تقریباً ایک تھی' لیکن مجھے ان کی عفت وپاکبازی' حلم وحیاء اور متانت ووقار نے بہت متاثر کیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس عنفوان شباب میں بھی ان سے کوئی حرکت متانت کے خلاف سرزد ہوئی ہو۔"

چونکہ دونوں کا وطن پشاور تھا اس لئے فراغت کے بعد مودت ورفاقت کا رشتہ مزید مستحکم ہوتا گیا، اور دونوں نے اس دور میں ناقابل فراموش دینی وملی اور سیاسی واجتماعی خدمات انجام دیں، اور اس کے لئے "جمعیت علماء سرحد" کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی' اور اس کے ذریعہ علماء سرحد کی شیرازہ بندی کا وقیع کارنامہ انجام دیا۔

۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۳ء میں جب حضرت بنوری قدس سرہٗ نے کراچی میں جامعہ اسلامیہ کا آغاز کیا تو حضرت مولانا عبدالحق نافع اور حضرت مولانا لطف اللہ پشاوری کو رفاقت کی دعوت دی ، ان دونوں حضرات نے کسمپرسی اور بے سروسامانی کے دور میں حضرت بنوریؒ کی رفاقت کا صحیح حق ادا کیا۔ گویا ہمارے اس مدرسہ کی بنیادوں میں (جو ماشاء اللہ اب جامعہ ہے) حضرت بنوری قدس سرہٗ کے ساتھ حضرت مولانا عبدالحق نافع اور مولانا لطف اللہ پشاوری نور اللہ مرقدہما کا خون جگر اور مجاہدہ واخلاص بھی شامل ہے' اس دور کی عسرو تنگ دستی اور مجاہدہ وتوکل کی داستان بڑی ہی دل دوز اور عبرت آموز ہے' حضرت بنوری قدس سرہ اس دور کے عجیب وغریب واقعات بیان فرمایا کرتے تھے جن سے "والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا" کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا' نامناسب نہ ہوگا اگر ہم حضرت مولانا لطف اللہؒ کی آپ بیتی کا کچھ حصہ خود انہی کی زبانی سنیں۔

حضرت مولانا مرحوم اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

"بالآخر مولانا نے ٹنڈو الہ یار سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنا الگ مدرسہ جاری کرنے کا ارادہ فرمایا' "ہب ندی" کے قریب ایک متروکہ ہندو دھرم سالہ مولانا طفیل صاحب کے زیر قبضہ تھا۔ وہاں پر مولانا بنوریؒ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا' اس وقت صرف دو

جماعتیں تھیں، ایک دورہ حدیث کی اور ایک درجہ تکمیل کی۔ مدرسہ میں چونکہ ابتداً کچھ نہیں تھا۔ اس لئے مولانا نے تعلیمی و تدریسی رفاقت کے لئے اپنے پرانے دوستوں کو دعوت دی اور لکھا کہ فی الحال مدرسہ میں تنخواہ کی گنجائش نہیں ہے۔ توکلاً علی اللہ کام کرنا ہوگا، چنانچہ مولانا کی دعوت پر تین اشخاص نے لبیک کہی۔ ایک تو مردان کے مولانا محمد یوسف تھے، جو بنارس میں حدیث پڑھا چکے تھے، دوسرا راقم الحروف تھا، اور تیسرے مولانا نافع گل صاحب تھے، مولانا محمد یوسف مردانی تو مدرسہ شروع ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد تشریف لے گئے۔ یہاں بے سرو سامانی کا عالم تھا اور کچھ عرصے کے بعد مولانا نافع گل صاحب بھی واپس تشریف لے گئے، اور "حب ندی" کے کنارے ایک ویرانے میں جسے "لال جیوا" کہتے تھے ہم رہ گئے، یہاں ایک عمارت میں (جس میں آج کل مولانا طفیل صاحب نے کوئی بڑی درسگاہ بنائی ہے) ہماری رہائش گاہ تھی، تنخواہ کی تو خیر ہم کو ابتدا سے ہی توقع نہ تھی، لیکن سب سے بڑی مشکل طلبہ کے لئے خورد و نوش اور ضروریات زندگی کا سامان مہیا کرنا تھا، یہ ویرانہ کراچی سے خاصی دور تھا، وہاں کا پانی بڑا کڑوا تھا، پینے کا پانی بھی کراچی سے لانا پڑتا تھا، اس عمارت کے گرد و پیش غلاظت کے ڈھیر تھے، جہاں مکھیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ہم لوگ درخت کے نیچے درس دیتے تھے، اور اس بڑے درخت پر سے ایک قسم کے کیڑے گرتے رہتے تھے، مجھے یاد ہے کہ مولانا مرحوم ایک ہاتھ سے ان کیڑوں کو کتاب بخاری شریف سے ہٹاتے رہتے اور دوسرے ہاتھ سے بخاری شریف کے ورق الٹتے تھے، یہ زمانہ مولانا کے صبر واستقامت کے امتحان کا تھا۔ ان دنوں مولانا مرحوم سراپا بے کسی و بے چارگی کا مجسمہ تھے۔ انہوں نے ان حالات کا بڑی جانکاہی اور پامردی سے مقابلہ کیا۔

مولانا مرحوم عید پر ٹنڈو الہ یار خان اپنے اہل و عیال کے پاس چلے گئے، آپ کے بال بچے وہاں پر تھے، کراچی میں مکان نہیں ملتا تھا، میں

عید الاضحیٰ کے دن طلبہ کے ساتھ کراچی آیا اور مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کی قبر پر فاتحہ پڑھی' واپسی پر ہم لوگ جمشید روڈ کی اس جامع مسجد میں ٹھہرے جہاں آج کل شاندار مدرسہ ہے۔ طلبہ نے عید کے دن نوافل ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا مانگی کہ اے اللہ! ہم بڑے تکلیف دہ مقام میں ہیں ہم کو اس مسجد میں ٹھکانا دے دے۔ بعض وقت استجابت (قبولیت دعا) کا ہوتا ہے۔ دو چار دن بعد جب مولانا گھر سے واپس آئے تو فیصلہ ہوا کہ یہاں کے بجائے مدرسہ کے لئے کوئی اور جگہ ڈھونڈی جائے' چنانچہ مدرسہ کا سامان جو اب تک خریدا جاچکا تھا' وہ مولوی طفیل کے حوالے کردیا' صرف چند کتابیں مدرسہ کو دی گئیں اور جامع مسجد نیو ٹاؤن کی انتظامیہ سے مشورہ کر کے مدرسہ اس مسجد کے احاطے میں منتقل کردیا گیا۔

اس وقت مدرسہ کے نام کی کوئی عمارت نہیں تھی، مسجد ہماری درس گاہ تھی اور وہی طلبہ کی خواب گاہ بھی ، البتہ مسجد کی شمالی جانب ایک حجرہ تھا جس پر ٹین کی چھت تھی۔ اس میں میں نے اور مولانا یوسف نے مختصر سا سامان رکھ دیا' ہم دونوں رات کو سونے کے لئے ایک دوست حاجی یعقوب صاحب دہلی والے کی کوٹھی پر چلے جاتے' صبح چائے بھی ان کے ہاں ہوتی اور دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل وغیرہ میں کھاتے' یہاں پیشاب اور قضائے حاجت کی بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس طرح ہوٹل کے کھانے اور انسانی ضروریات کے فقدان کی وجہ سے میں سخت بیمار پڑ گیا۔

میں نے مولانا بنوری سے کہا کہ مجھے خراب غذا کی وجہ سے اسہال کی تکلیف ہوگئی ہے' مجھے واپس گھر جانے کی اجازت دیدیں' مولانا نے آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ اس طرح میں بالکل تنہا رہ جاؤں گا' مجھ کو دو دن کی مہلت دو میں تمہارا علاج کراتا ہوں' خدانخواستہ تم دو دن میں اچھے نہ ہوئے تو میں ہوائی جہاز سے تمہیں گھر پہنچانے کا انتظام کروں گا' اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں دو دن میں اچھا ہوگیا اور گھر آنے کا ارادہ ترک

کردیا، اور حسب سابق کام شروع کردیا۔

یہاں درس کو جاری ہوئے جب چار مہینے گذر گئے، تو میں نے مولانا سے کہا کہ میری گزر بسر کھیتی باڑی پر ہے (مدرسہ میں تنخواہ کے لئے نہ رقم آئی نہ تنخواہ ملی۔ بس فی سبیل اللہ کام چل رہا تھا اور مولانا مرحوم کہیں سے قرض لے لوا کر اپنا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ چلاتے تھے) میری فصل کی کٹائی کے دن ہیں۔ آپ مجھے ایک ماہ کے لئے گھر جانے کی اجازت دیں تاکہ فصل سمیٹنے کا کچھ بندوبست کر آؤں۔ مولانا مرحوم نے ہنس کر فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ مدرسین کے لئے میرے پاس کچھ رقم آئی ہے، ذرا انتظار کرو، تاکہ تمہارے کرائے وغیرہ کا بندوبست ہوجائے، میں نے ہنسی میں کہا کہ "بلی کو چھیچھڑوں کے خواب آیا کرتے ہیں۔ ایک گھنٹہ بعد مولانا مسکراتے ہوئے میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "لو مولوی صاحب چھیچھڑے آگئے ہیں" کسی صاحب نے (غالباً حاجی وجیہہ الدین مرحوم نے) مدرسہ کو ۶ سو روپے چندہ بھیج دیا تھا۔ یہ مدرسین کے فنڈ میں مدرسہ کا پہلا چندہ تھا۔ اس میں سے مجھ کو بھی دو سو روپیہ دے دیا۔ میں چھٹی پر گھر چلا آیا اور چھٹی گذار کر واپس چلا گیا۔ نیو ٹاؤن کے قیام کے زمانہ میں ایک سال بڑی تنگی اور عسرت کا گزارا۔ تاہم سال کے آخر تک مدرسے کی حالت (مالی طور پر) قدرے اچھی ہوگئی۔

مولانا مرحوم کے تقویٰ اور خدا ترسی کا یہ حال تھا کہ زکاۃ فنڈ صرف طلبہ کے لئے رکھتے، اس کو کبھی کسی حالت میں مدرسین کی تنخواہ، یا مدرسہ کی تعمیرات یا کتابوں وغیرہ کی خرید پر صرف نہیں کرتے تھے، دوسرے سال مدرسہ کی حالت زکاۃ فنڈ میں قابل اطمینان ہوگئی، ایک دفعہ زکاۃ فنڈ میں ۲۵ ہزار روپیہ جمع تھا، مگر غیر زکاۃ کی مد خالی تھی، جب تنخواہ دینے کا وقت آیا تو خزانچی حاجی یعقوب صاحب نے کہا مدرسین کی تنخواہ کے لئے کچھ نہیں، اگر آپ اجازت دیں تو زکاۃ فنڈ میں سے قرض لے کر مدرسین کی تنخواہ ادا کردی جائے، بعد میں زکاۃ فنڈ

میں یہ رقم لوٹادی جائے گی' آپ نے فرمایا: "ہرگز نہیں! میں مدرسین کی آسائش کی خاطر دوزخ کا ایندھن نہیں بننا چاہتا' مدرسین کو صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہئے کہ ان کے فنڈ میں اللہ تعالیٰ کچھ بھیج دے۔ جو مدرس صبر نہیں کرسکتا اس کو اختیار ہے کہ مدرسہ چھوڑ کر چلا جائے"۔

جب کوئی ذی ثروت صاحب خیر مدرسہ کو چندہ دینے آتا تو مولانا اس سے فرماتے کہ "مجھے زکاۃ کی ضرورت نہیں' یہ تو غسالۃ مال ہے' جسے اگلی امتوں میں آگ آسمان سے اتر کر جلا دیا کرتی تھی۔ میرے مدرسے کے مدرسین کے لئے اگر کچھ دینا ہے تو غیر زکاۃ میں سے دو"

الغرض حضرت مرحوم بنوری قدس سرہٗ کے بڑے مخلص رفیق تھے' اپنے مقالہ کے ابتدائی نوٹ میں لکھتے ہیں:

"مولانا مرحوم کے ساتھ میری رفاقت ۱۹۲۷ء سے ہے جب کہ وہ افغانستان سے تشریف لائے اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا تھا' پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک پشاور میں ان کے ساتھ شب و روز رفاقت رہی۔ اور پھر مرحوم نے "مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن" کی بنیاد رکھی تو میں ان کا پہلا رفیق تھا۔ جو سات برس ان کے پاس درس و تدریس میں مصروف رہا۔

ہم دونوں میں بے تکلف دوستی تھی ایک دوسرے سے اپنے تمام احوال و سوانح بیان کیا کرتے تھے"۔

حق تعالیٰ شانہ حضرت مرحوم کو اپنے بے پایاں لطف و کرم سے نوازیں اور اپنے قرب کے درجات عالیہ سے سرفراز فرمائیں۔

اللّٰھم اغفرلہ' وارحمہ' وعافہ' واعف عنہ' واکرم نزلہ' ووسع مدخلہ وابدلہ دارًا خیرًا من دارہ واھلاً خیرًا من اھلہ۔

اوپر حضرت بنوریؒ کی رفاقت کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالحق نافع نور اللہ مرقدہ کا ذکر خیر آیا ہے' یہ حضرت بنوریؒ کے محبوب ترین رفیق تھے۔ ان کا وصال ۱۳ر ذوالحجہ

۱۳۹۳ھ کو ہوا تھا۔ اور محرم ۱۳۹۴ھ کے بصائر و عبر میں حضرت بنوری قدس سرہ نے ان کے بارے میں اپنے تاثرات بڑے والہانہ انداز میں قلمبند فرمائے تھے۔

ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"جب راقم الحروف نے کراچی میں درس گاہ کی بنیاد ڈالی تو کچھ عرصہ (مولانا عبدالحق نافع) میرے رفیق کار رہے، درس بخاری، صدر مدرس کا منصب ان کو حاصل تھا(اور یہ حضرت بنوریؒ کا کمال ایثار واخلاص تھا....ناقل) ضعف اور خانگی ضروریات کی وجہ سے ہم ان کی رفاقت کی نعمت سے محروم رہے۔

مرحوم سے میرا تعلق تقریباً نصف صدی رہا۔ تحابب وتوادد کی اس منزل پر پہنچے جس کی نظیر کم ملے گی۔ میں نے اپنے معاصرین اور حلقہ احباب اور اساتذہ میں باستثناء بعض حضرات ...... ذکاوت طبع، دقت نظر، حسن ذوق، جامعیت مزاج میں ان کی نظیر نہیں دیکھی، میرے والد محترم حضرت مولانا سید محمد زکریا صاحب مدظلہم ودامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ "مشکل سے مشکل مسائل کو آسان وسادہ تعبیر میں حل کرنے والا عالم ان جیسا نہیں دیکھا"۔

(بینات محرم الحرام ۱۴۰۴ھ مطابق نومبر ۱۹۸۳ء)

حضرت مولانا شمس الحق افغانی رح

۶ر ذیقعدہ ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۶ر اگست ۱۹۸۳ء کو بروز سہ شنبہ عالم ربانی حضرت الشیخ العلامہ مولانا سید شمس الحق افغانی پچاسی سال کی عمر میں رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نور اللہ مرقدہٗ وقدس سرہٗ۔

حضرت مرحوم، امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے تلمیذ رشید اور اس آخری دور میں سلطان العلماء تھے، حق تعالیٰ شانہ نے انہیں علم وفضل، حلم ووقار، رزانت ومتانت، حسن وجمال، اور جاہ وجلال سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ ساری عمر گلشن علم کی آبیاری میں گذری، دارالعلوم دیوبند، ڈابھیل اور جامعہ اسلامیہ بہاول پور ایسے وقیع اداروں میں شیخ التفسیر، شیخ الحدیث اور شیخ الجامعہ کی مسند پر رونق افروز، اور وفاق المدارس العربیہ کے صدر نشین رہے، تقسیم سے پہلے ریاست قلات میں وزیر معارف رہے۔ اور اسلام کا نظام عدل صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ خدا کی زمین پر نافذ کرکے دکھایا۔

علوم عقلیہ ونقلیہ میں یکساں مہارت اور فلسفۂ قدیم وجدید کی جو جامعیت حضرت مرحوم میں پائی جاتی تھی اس کی مثالیں اس زمانے میں بہت کمیاب ہیں۔ وفور علم اور کمال تقویٰ کے ساتھ قدرت نے بے نظیر حافظہ، نگہ بلند، فطرت ارجمند، قلب سلیم، اور شاہانہ دماغ عطا فرمایا تھا، جدید مغربیت کے پرستاروں اور اشتراکیت کے مارگزیدوں پر جب تنقید کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ یہ دنیا ان کے شیخ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے بقول واقعی "البیت الحمیر" ہے۔ مرحوم کی تقریر میں علوم ومعارف کا دبستان کھل جاتا تھا، عقلیات اور معلومات جدیدہ کی روشنی میں اسلامی اصول ونظریات کی بالاتری وبالادستی کی ایسی وضاحت فرماتے تھے کہ ایمان تازہ ہوجاتا تھا۔ عربی، اردو، پشتو اور فارسی مادری زبان کی طرح لکھتے اور بولتے تھے۔

متعدد علمی کتابیں بھی حضرت مرحوم کے قلم سے نکلیں، جن میں علوم قرآن، معین القضاۃ والمفتیین اور اسلام اور اشتراکیت زیادہ معروف ہیں۔ ایک زمانے میں سنا تھا کہ ترمذی شریف کی شرح تالیف فرمارہے ہیں مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں تک پہنچی۔ اگرچہ ترمذی شریف پر متعدد کتابیں آچکی ہیں۔ لیکن اگر حضرت افغانیؒ نے اس کی شرح تالیف فرمائی ہو تو بڑی اہم چیز ہوگی۔

اصلاح و تربیت کا تعلق حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ سے تھا۔ حضرتؒ کے بعد ان کے خلیفہ اعظم حضرت مفتی محمد حسن امرتسری قدس سرہٗ سے تعلق قائم کیا۔ اور اجازت و خلافت سے ممتاز ہوئے، حق تعالیٰ شانہ حضرت کے درجات بلند فرمائیں۔ اور اپنے لطف و کرم سے مرحوم کو اپنے خاص مقبول بندوں میں شامل فرمائیں۔

(بینات محرم الحرام ۱۴۰۴ھ مطابق نومبر ۱۹۸۳ء)

حضرت مولانا نور الحسن بخاریؒ

ربیع الاول ۱۴۰۴ھ کی آخری رات ۱۱ جنوری ۱۹۸۴ء بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب کو ۱۱ بجے ملتان میں تنظیم اہل سنت کے بانی حضرت مولانا سید نور الحسن بخاری ۷۴ برس کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا آبائی تعلق ڈیرہ غازی خان کے علاقہ راجن پور سے تھا' ابتدا میں اسکول کی تعلیم کے بعد اپنے علاقہ میں اسکول ٹیچر ہو گئے تھے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تلقین سے دینی علوم کا شوق ہوا' ڈابھیل میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے تلمذ کیا۔ اور حدیث دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام والمسلمین الامام المجاہد فی سبیل اللہ حضرت اقدس مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے پڑھی۔

تکمیل علوم کے بعد "تنظیم اہل سنت" کی بنیاد ڈالی۔ اور ملک میں مسلک اہل سنت کی نشر واشاعت میں تقریرًا و تحریرًا مصروف ہو گئے۔ "تنظیم اہل سنت" اور "دعوت" پرچے جاری کئے۔ اور متعدد وقیع کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔

۳۰ر دسمبر کا جمعہ تنظیم اہل سنت کی مسجد (نواں شہر ملتان) میں پڑھایا۔ یہ مرحوم کی زندگی کا آخری جمعہ تھا۔ تقریر کے دوران فرمایا کہ زندگی کی آخری دو درخواستیں تھیں۔ ایک حرمین شریفین کی حاضری' سو وہ اسی سال اللہ تعالیٰ نے میسر فرمادی۔ دوسری "سیرت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (نامی کتاب) کی تکمیل۔ وہ بھی اس ہفتہ پوری ہو گئی' اب میں فارغ ہوں اور تیار ہوں۔ اس کے پانچ دن بعد بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات عشاء کی نماز خود پڑھائی۔ نماز کے بعد اپنے معمولات ووظائف سے فارغ ہو کر "سیرت اصحاب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم" کے مسودہ پر نظر ثانی کرنے بیٹھ گئے۔ اسی حالت میں

دل کا دورہ ہوا اور داعیٔ اجل کی دعوت پر رخت سفر باندھ لیا۔ حق تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائیں۔ اور عباد اللہ الصالحین کی صف میں شامل فرماکر انہیں رحمت ومغفرت سے ہمکنار فرمائیں۔

(بینات جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ مطابق مارچ ۱۹۸۴ء)

حضرت مولانا تاج محمود صاحبؒ

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۸۴ء کو بروز جمعہ دس بجے مجلس تحفظ ختم نبوت کے راہنما اور ہفت روزہ "لولاک فیصل آباد" کے مدیر حضرت مولانا تاج محمود صاحب فیصل آباد میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے قافلہ احرار کے جانباز سپاہی' تحریک ختم نبوت کے مدبر جرنیل' اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی قائد و راہنما تھے۔ مرحوم کا آبائی وطن ضلع ہزارہ تھا ـــــــ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۳۸ء میں مولانا مفتی محمد یونسؒ کے ایماء پر ریلوے کالونی فیصل آباد کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اور بغیر کسی اجر و مزد کے پوری زندگی وہیں گذار دی' وہیں سے جنازہ اٹھا۔ بقول حضرت مجذوب:

چمن کا رنگ گو تو نے سراسر اے خزاں بدلا
نہ ہم نے شاخ گل چھوڑی نہ ہم نے آشیاں بدلا

مرحوم کی اصلاحی و ملی سرگرمیاں و سرفروشیاں صرف مسجد کے مختصر حلقہ تک محدود نہ تھیں بلکہ انہوں نے اپنی بھرپور جوانی کے زمانے میں تحریک حریت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' انگریز جیسی طاغوتی طاقت کو للکارا' اور ہر خوف و خطرے سے بے نیاز ہو کر قید و بند کی صعوبتوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔

قیام پاکستان کے بعد حضرت امیر شریعتؒ کی قیادت میں انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں ناموس ختم نبوت کی پاسبانی کے لئے وقف کر دیں' ۵۳ء اور ۷۴ء کی تحریکوں میں قائدانہ حصہ لیا' اور آخر دم تک اس محاذ پر مکار دشمن سے برسرپیکار رہے' اور سینکڑوں

طوفانوں کے باوجود ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔

طریق عشق میں گو کارواں پر کارواں بدلے
نہ ہم نے رہ گزر بدلی نہ میر کارواں بدلا

مرحوم زبان وقلم دونوں کے دھنی اور میدان تقریر و تحریر کے یکساں شہسوار تھے' ان کی شعلہ بار تقریر کے شرارے سارقان ختم نبوت کے خرمن امن وسکون کو پھونک ڈالتے تھے' ان کی آواز کی گھن گرج سے بزدل دشمنوں کے دل دہل جاتے تھے' اور اہل ایمان شمع ختم نبوت پر پروانہ وار فدا ہونے کے لئے بے تاب ہوجاتے تھے۔

مرحوم میں جہاں ''اشداء علی الکفار'' (کافروں کے مقابلہ میں سخت) کی جھلک نمایاں نظر آتی تھی' وہاں ''رحماء بینھم'' کا عکس بھی صاف جھلکتا تھا۔ وہ ابلیس کی ذریت کے مقابلہ میں فولاد سے زیادہ سخت تھے، لیکن مسلمانوں کے حق میں ریشم سے زیادہ نرم تھے' اتحاد بین المسلمین کے داعی وعلمبردار تھے اور ختم نبوت کے مرکز ثقل پر تمام اسلامی فرقوں کے جمع ہونے پر مصر تھے۔

مرحوم کو حق تعالیٰ شانہ' نے افہام وتفہیم اور حسن تعبیر کا خاص سلیقہ بخشا تھا' اپنے موقف کی وضاحت اس خوبی سے کرتے تھے کہ منصف ان کے حسن بیان کا قائل ومعترف ہوجاتا تھا۔

مرحوم کا حلقۂ تعارف وتعلق بہت وسیع تھا' اہل علم ودانش' علماء وصلحاء' گریجویٹ' وکلاء وخطباء اور افسران بالا سب سے ان کے دوستانہ مراسم تھے' وہ ہر شخص سے اس کے منصب ومرتبہ کے مطابق تخاطب فرماتے تھے' کثرت احباب وتعلقات کی بناء پر ان کی زندگی بڑی مصروف گذرتی تھی' ضرورت مندوں کی ہر ممکنہ خدمت ومدد ان کے یہاں عبادت سے کم درجہ نہیں رکھتی تھی۔

مولانا مرحوم ایک عرصہ سے ''درد دل'' کی امانت لئے پھرتے تھے، کئی مرتبہ نازک صورت حال پیدا ہوگئی، لیکن لمحات زندگی کچھ باقی تھے، اس لئے گویا موت کے منہ سے نکل آتے تھے۔ اور اب تو طبیعت ماشاء اللہ بہت اچھی ہوگئی تھی' اور خیال ہونے لگا تھا کہ مولانا کا سایہ ابھی کافی دراز رہے گا، لیکن ''درد دل'' کا کیا اعتبار' شب جمعہ کو گیارہ بجے

تک احباب سے فارغ ہو کر آرام کے لئے اندر تشریف لے گئے، صبح اٹھے تو تکلیف تھی، علی الصباح ان کو ہسپتال لے جایا گیا، لیکن وقت موعود آچکا تھا قریباً دس بجے طائر روح قفس عنصری سے آزاد ہو گیا۔

اللّٰھم اغفرلہ، وارحمہ، وعافہ واعف عنہ، واکرم نزلہ، ووسع مدخلہ، ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الابیض من الدنس، وباعد بینہ وبین خطایاہ کما باعدت بین المشرق والمغرب۔ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ اللھم لا تحرمنا اجرہ۔ ولا تفتنا بعدہ۔

ایک حدیث میں ہے کہ مرنے والا جب مرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے آگے کیا بھیجا؟ اور لوگ پوچھتے ہیں کہ اس نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا۔
(مشکوٰۃ ص ۴۴۵ بروایت بیہقی فی شعب الایمان(۱))

مولانا مرحوم کی ساری زندگی بظاہر قلندرانہ شان سے گزری، بظاہر نہ انہوں نے کچھ جمع کیا، نہ پیچھے چھوڑا، جہاں تک آگے بھیجنے کا تعلق ہے اس کی خبر علام الغیوب کو ہے کہ ان کی بارگاہ میں مرحوم کے اعمال کو کیسا شرف قبول حاصل ہوا۔ تاہم علامات وقرائن بہت اچھے ہیں۔ ان کی زندگی کے بیشتر لمحات جہاد ختم نبوت میں گزرے۔ ان کی رحلت جمعہ کے مقدس دن ہوئی۔ ان کے جنازے پر علماء وصلحاء اور دیگر مسلمانوں کا ایسا اجتماع ہوا جو فیصل آباد کی تاریخ میں بے مثال کہا جا سکتا ہے۔ اور ان کی وفات کے بعد بعض صلحاء کو مبشرات ہوئے۔ ایک صاحب نے دیکھا کہ مولانا بہت خوبصورت کپڑوں میں ہیں، پوچھا، کیسے گزری۔ فرمایا: معاملہ تو سخت تھا، مگر میرے ہاتھ پر ایک شخص قادیانیت سے تائب ہو کر مسلمان ہوا تھا۔ اس کی برکت سے بخشش ہو گئی۔ حق تعالیٰ شانہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، ان کے اہل وعیال، دوست احباب اور

---

(۱) وذکر السیوطی فی الجامع الصغیر۔ وعزاہ الی البیہقی فی شعب الایمان ورقم لہ بالضعف۔ وقال المناوی فیہ یحیی بن سلیمان الجعفی، قال النسائی لیس بثقۃ۔ وعبدالرحمان المحاربی لہ مناکیر۔(فیض القدیر ص ۴۳۷ ج ۱)

متعلقین کو ان کے صدمہ پر صبر و اجر عطا فرمائیں۔ اور اللہ تعالیٰ نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کی پاسبانی کے لئے مولانا مرحوم کا بدل امت کو نصیب فرمائے۔

(بینات جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ مطابق مارچ ۱۹۸۴ء)

حضرت مولانا عبدالعزیز رائے پوری رح

مورخہ ۴ر صفرالمظفر ۱۴۰۵ھ مطابق ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۴ء بروز سہ شنبہ حضرت اقدس مولانا عبدالعزیز رائے پوریؒ (چک نمبر ۱۱/ ایل علاقہ چیچہ وطنی ضلع ساہیوال) کا قریباً نوے سال کی عمر میں وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم ولی بن ولی تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد صالح صاحبؒ قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز تھے ، حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ نے اپنے قرآن کریم کے اساتذہ کے تذکرہ میں ان کا ذکر خیر بڑے بلند الفاظ میں فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخؒ "آپ بیتی" میں فرماتے ہیں:

"ایک عرصہ بعد عالی جناب حافظ محمد صالح صاحبؒ نکودر ضلع جالندھر کے رہنے والے ، جو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ نہایت بزرگ، نہایت نیک، نہایت متواضع، نہایت خاشع خاضع، بڑی کثرت سے نفلیں پڑھنے والے ، وہ جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تبرکاً میرے والد صاحبؒ نے مجھے ان کی شاگردی میں بھی حصول برکت کے لئے چند روز رکھا، جب تک حافظ صاحبؒ کا گنگوہ میں قیام رہا۔" (آپ بیتی نمبر ۲ ص ۳۰)

حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی رہائش رائے پور گوجراں، نکودر ضلع جالندھر میں تھی۔ جہاں موصوف نے "مدرسہ رشیدیہ رائے پور گوجراں" کی بنیاد رکھی۔ حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ رائے پوریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، اور مشرقی پنجاب کے بہت سے اکابر علماء ومشائخ اسی مدرسہ کے فیض یافتہ

تھے۔ (تقسیم کے بعد ساہیوال میں جامعہ رشیدیہ کی تاسیس گویا اسی مدرسہ کی نشأۃ ثانیہ تھی)۔

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ کی ولادت مدرسہ رشیدیہ رائے پور گوجراں کے باخدا ملکوتی ماحول میں ہوئی۔ سن ولادت ۱۳۱۶ھ (مطابق ۱۸۹۸ء) ذکر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم سے لے کر موقوف علیہ تک کی تعلیم مدرسہ رشیدیہ میں اپنے والد ماجد کے علاوہ حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب اور مولانا فضل احمد سے حاصل کی۔ حدیث کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور دیگر اکابر سے کی، حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ سے باطنی استفادہ کیا، حضرت شیخ الہند کے بعد حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ سے اصلاح وارادت کا تعلق رہا۔ لیکن سلوک کی تکمیل ان کے خلیفہ ارشد قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ سے ہوئی اور انہی کی طرف سے اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے۔

تعلیم سے فراغ کے بعد مدرسہ رشیدیہ رائے پور گوجراں ہی میں خدمت تدریس کا سلسلہ شروع ہوا جو تقسیم تک جاری رہا۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب سے ہجرت کرکے چیچہ وطنی ضلع ساہیوال کے ایک گاؤں چک نمبر۱۱-۱۱ ایل میں آرہے، یہاں آپ کا معمولی زمینداراہ تھا، یہاں قرآن کریم کا ایک مکتب جاری فرمایا۔ اوراپنے متوسلین اور واردین وصادرین کے لئے ایک چھپرڈال دیا، یہ گویا آپ کی خانقاہ تھی اور یہی مہمان خانہ بھی۔ ساری عمر اسی تجرید وتفرید، انقطاع وتبتل اور گوشہ گمنامی میں گزاردی۔

حضرت مرحوم ایک بلند پایہ عالم، دقیقہ رس مدرس اور استاذ العلماء تھے۔ دوسری طرف صوفی روشن ضمیر، عارف پاک طینت اور صاحب تصرف مرشد کامل تھے۔ لیکن عبدیت وفنائیت کا یہ عالم تھا کہ سوائے شناسا لوگوں کے کسی کو ان کے علمی فضل وکمال یا باطنی رفعت ومرتبت کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ سادگی وبے تکلفی، کم گوئی وبے آزاری اور ہمدردی وخلوص میں قرون اولیٰ کی یادگار تھے۔ اہل بصیرت انہیں "مادر زاد ولی" قرار دیتے تھے۔

میرے ایک عزیز بزرگ نے جو قریب کے ایک گاؤں میں رہتے تھے اور جنہیں اس قرب کے باوجود حضرت مولانا سے عقیدت تو کیا، شناسائی بھی نہیں تھی، راقم الحروف کو اپنی ابتدائی شناسائی وعقیدت مندی کا یہ واقعہ سنایا کہ وہ ایک مرتبہ چیچہ وطنی گئے ہوئے

تھے، اتفاق سے وہاں حضرت مولانا بھی تشریف فرما تھے' ایک صاحب نے حضرت سے عرض کیا کہ مجھے آپ کی دعوت کرنی ہے' فرمایا' آج نہیں۔ پھر کبھی' جب ہم خود فرمائش کریں گے، وہ عزیز بیان کرتے تھے کہ ایک بار پھر شہر جانا ہوا تو حسن اتفاق سے حضرت مولانا اس دفعہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے' ان صاحب سے (جنھوں نے پہلی بار دعوت کا کہا تھا) از خود فرمایا کہ آج دعوت کھلاؤ۔ وہ گھر گیا، کچھ دیر بعد سویوں کا بڑا تسلہ سر پر رکھے واپس آیا۔ اس کا ایک قدم دروازے کے اندر تھا دوسرا باہر' حضرت نے ارشاد فرمایا' اس کو گھر واپس لے جاؤ۔ گھر والوں کو کبھی خیال ہوتا ہے کہ کھانا مہمانوں سے بچ کر آئے گا تو بچوں کو دیں گے' اور کبھی خیال ہوتا ہے کہ مہمانوں کو جو کھانا بھیجا گیا ہے وہ ختم ہو گا تو اور بھجوائیں گے۔ اس میں سے اگر کچھ بچانا مقصود ہے تو ابھی اسے نکال لیں اور اگر کچھ مزید ڈالنا مقصود ہے تو ابھی ڈال دیں۔ چنانچہ وہ شخص واپس گھر گیا' خدا جانے اس کے گھر والوں نے کچھ نکالا یا کچھ اضافہ کیا' بہر حال وہ لے کر واپس آیا تو فرمایا کہ "بس اب یہ ہمارا ہی حصہ ہے نا" اس نے اثبات میں جواب دیا تو حاضرین سے فرمایا بسم اللہ پڑھو' چنانچہ سب نے اسی ایک برتن سے کھایا اور فراغت کے بعد صاحب دعوت کے لئے دعا فرمائی۔ وہ عزیز فرماتے تھے کہ حضرت کی اس سادگی و بے تکلفی کے واقعہ نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ میں نے کہا کہ یہ شخص واقعی باخدا ولی ہے۔

کوہ نور ملز فیصل آباد کے الحاج نصر اللہ خان صاحب حضرت کے معتقد تھے' اور ان کا پورا گھرانا حضرت کے حلقہ ارادت میں شامل تھا' اس لئے کئی سال سے حضرت کا رمضان المبارک کوہ نور ملز میں ہوا کرتا تھا۔ ہمارے حضرت شیخ برکۃ العصر مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی قدس سرہٗ کا ۱۴۰۰ھ کا رمضان المبارک حضرت مولانا زین العابدین صاحب کے مدرسہ میں فیصل آباد ہوا' حضرت مولانا مرحوم حضرت شیخ سے ملنے کے لئے وہاں تشریف لاتے رہے۔ عید کے دن یہ ناکارہ اپنے چند رفقاء کے ساتھ حضرت کی زیارت کے لئے کوہ نور ملز گیا۔ بہت دیر تک مجلس رہی اور مختلف مسائل پر گفتگو رہی' کافی دیر کے بعد اس ناکارہ نے اس خیال سے اجازت چاہی کہ حضرت کو طویل نشست سے گرانی نہ ہو' اور آپ کے ضروری مشاغل میں خلل نہ ہو' لیکن حضرت نے اجازت نہیں دی۔ بلکہ فرمایا "مولوی صاحب! کچھ اور بیٹھ جاؤ۔ محض خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے بہت کم لوگ میرے پاس آتے ہیں۔" چنانچہ جب حضرت خود اٹھے تو مجلس برخاست ہوئی۔

علالت کے آخری ایام میں حضرت کوہ نور ملز میں قیام فرما تھے، وہیں آپ کا وصال ہوا۔ فیصل آباد میں آپ کی نماز جنازہ حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب نے پڑھائی۔ وہاں سے جنازہ چیچہ وطنی لایا گیا اور یہاں آپ کے برادر زادہ عزیز مولانا عبدالعلیم صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ خدا تعالیٰ آپ کو رحمت و رضوان اور بلند ترین انعامات سے نوازیں۔

حضرت کی علالت ووفات کے دنوں میں یہ ناکارہ جنوبی افریقہ کے سفر پر تھا۔ واپسی پر آپ کے وصال کی اطلاع ہوئی لیکن پے درپے عوارض کی وجہ سے "بصائر وعبر" میں آپ کا ذکر خیر آنے میں تاخیر ہوگئی۔

(بینات جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ مطابق مارچ ۱۹۸۵ء)

حافظ حسام الدین صاحبؒ

۲۶ر ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۹۸۵ء بروز ہفتہ پونے سات بجے مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) کے بانی و مہتمم رفیق محترم جناب حافظ حسام الدین صاحبؒ نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم قرآن کریم کے جید حافظ اور جامع مسجد ماموں کانجن کے خطیب تھے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے بیعت تھے۔ اصلاحی تعلق سیدی و مرشدی حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ (بانی جامعہ خیر المدارس ملتان) سے رہا، حضرت تھانویؒ کے مواعظ وملفوظات اور دیگر دینی کتب کے اشتغال کی وجہ سے کوئی شخص ان کے وعظ وتقریر اور درس قرآن کو سن کر یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ اصطلاحی عالم نہیں ہیں۔

۱۹۵۳ء (۱۳۷۳ھ) میں اپنے شیخ و مرشد حضرت جالندھریؒ کے ایماء پر جامع مسجد میں "مدرسہ عربیہ احیاء العلوم" کی بنیاد رکھی۔ اور اپنی زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ یہ ناکارہ بھی تقریباً بارہ سال تک اس مدرسہ میں مرحوم کا رفیق رہا۔

حق تعالیٰ شانہ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائیں اور اس ناکارہ کی طرف سے ان کے حقوق میں جو کوتاہی ہوئی ہو مرحوم کو اس کا بہترین بدل عطا فرمائیں۔

(بینات جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ مطابق مارچ ۱۹۸۵ء)

حضرت مولانا مفتی محمد عبد اللہؒ

۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۵؍ جنوری ۱۹۸۵ء شب جمعہ کو ایک بجے کے قریب حضرت الاستاذ مولانا الحاج الحافظ مفتی محمد عبداللہ صاحبؒ کا ملتان میں وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ڈیرہ غازی خان میں حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ قدس سرہٗ سے سند فراغ حاصل کی۔ فرماتے تھے کہ میں دارالعلوم دیر سے گیا تھا۔ طلبہ کا داخلہ مکمل ہوچکا تھا۔ مجھے اسباق میں شرکت کی اجازت تو مل گئی' لیکن مطبخ سے کھانا جاری نہیں ہوسکا اس لئے پورا سال مطبخ کے بچے کھچے ٹکڑوں پر گزر بسر کی۔ سالانہ امتحان میں اچھے نمبروں پر پاس ہوا تو اکابر نے مجھے مراد آباد مدرس بنا کر بھیج دیا۔ تقسیم سے پہلے حضرت مفتی صاحب تدریس کی خدمات مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں حسبتہً للہ انجام دیتے تھے۔ تقسیم کے بعد جب مدرسہ خیرالمدارس ملتان منتقل ہوا تو حضرت مفتی صاحب کے والد ماجد چونکہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے متوسلین میں سے تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا خیر محمد جالندھری(نور اللہ مرقدہٗ) کے ساتھ کام کریں۔ چنانچہ پہلے سال ان کو ایک کتاب (غالباً ہدایہ) دی گئی' دوسرے سال رمضان المبارک میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ نے حضرت مفتی صاحب کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کون سی کتاب پسند فرمائیں گے' انہوں نے جواباً عرض کیا کہ جو کتاب بھی دے دی جائے' اگر حدیث کی کوئی کتاب ہو تو اچھا ہے۔ چنانچہ اگلے سال صحیح مسلم شریف مفتی صاحب کے سپرد ہوئی۔ اس سے اگلے سال حضرت جالندھریؒ نے پھر دریافت کرایا تو جواب میں فرمایا کہ حدیث کی تدریس کے ساتھ ساتھ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کی مشق شروع کردوں۔ چنانچہ حدیث کی ایک کتاب کے ساتھ حضرت مفتی

صاحب کا ایک گھنٹہ فتویٰ نویسی کے لئے مخصوص کردیا گیا' اور آپ کے ساتھ اس شعبہ میں ایک معاون مقرر کردیا گیا۔ ان دنوں آپ کے تمام فتاویٰ تصدیق کے لئے حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ کی خدمت میں جاتے تھے' مگر مدرسہ کا کتب خانہ ہی دارالافتاء تھا' اگلے سال حضرت مفتی صاحب کے مشورہ سے دارالافتاء کا شعبہ کتب خانہ سے الگ کردیا گیا۔ انہی دنوں حکومت کی طرف سے ۱۳۶ سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ آیا' حضرت مفتی صاحب نے بڑی محنت کے ساتھ جوابات لکھے۔ حضرت اقدس مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ کی خدمت میں وہ جوابات پیش کئے گئے تو حضرت نے ملاحظہ کے بعد فرمایا کہ "اب ہمارے مفتی صاحب' مفتی بن گئے ہیں"۔

راقم الحروف نے خیر المدارس میں دورۂ حدیث ۷۳۔۱۳۷۲ھ میں کیا تھا۔ اس سال ترمذی شریف (جو صحاح ستہ میں مرکزی کتاب شمار کی جاتی ہے) حضرت مفتی صاحب کے پاس تھی۔ اسی طرح حضرت مفتی صاحب کا تعلق خیر المدارس اور قاسم العلوم دونوں کے ساتھ رہا۔ اور دونوں جگہ حسبۃً للہ تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ممکن ہے کسی زمانے میں کچھ معاوضہ بھی قبول فرمایا ہو ورنہ معاشی ضروریات کے لئے ایک کتب خانہ قائم فرما رکھا تھا۔ مگر وہ کاروبار کے آدمی نہیں تھے۔ فرماتے تھے کہ ہم نے تجارتی کتب خانہ محض معاش کی ضرورت کے لئے نہیں بنایا ہے بلکہ لوگوں کو شریعت کے مطابق تجارت سکھانے کی غرض سے بنایا ہے' ایک بار یہ لطیفہ ہوا کہ مفتی صاحب کا کتب خانہ کرائے کی عمارت میں تھا' مالک مکان نے مفتی صاحب کو لکھا کہ مکان خالی کردیجئے' مفتی صاحب نے فوراً کتابیں سمیٹنا شروع کردیں۔ دوست احباب نے عرض کیا کہ حضرت اس کا مقصد مکان خالی کرانا نہیں بلکہ کرایہ بڑھانا ہے' آپ اس کا کرایہ بڑھادیں۔ یہاں سے کتب خانہ اٹھانے میں آپ کو نقصان ہوگا' لیکن مفتی صاحب نہ مانے' بلکہ کتابیں اٹھا کر کسی غیر معروف جگہ رکھوادیں، جگہ خالی کردی گئی، اور فرمایا کہ "شرعی حکم یہ ہے کہ مکان کا مالک جب بھی مکان خالی کرنے کا مطالبہ کرے مکان کا خالی کرنا واجب ہے اور زور زبردستی کے ساتھ وہاں ٹھہرنا حرام اور ناجائز ہے"۔

تدریس و تجارت کے علاوہ مفتی صاحب کا دعوت و تبلیغ سے بھی بہت تعلق رہا' تبلیغی اجتماعات میں حاضر ہوتے' دوسرے لوگوں کو بھی اس کی تلقین فرماتے۔ متعدد بار تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت بھی لگایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرق باطلہ کے خلاف قلمی جہاد

میں بھی حضرت مفتی صاحب نے گراں قدر خدمات انجام دیں' اس مقصد کے لئے ماہنامہ "الصدیق" اردو اور عربی جاری فرمایا۔ جس کی لوح پر یہ شعر ہوتا تھا:

تیغ بُرّاں بہر ہر زندیق باش
اے مسلمان! پیرو صدیق باش

کسی زمانے میں "الصدیق" ہمارے ملک کا نہایت وقیع دینی مجلّہ تھا' جس میں بڑے بڑے اکابر کے مضامین شائع ہوتے تھے' راقم الحروف ان دنوں نو آموز طالب علم تھا' اس کی "مشق تحریر" کا آغاز اسی "الصدیق" سے ہوا تھا۔ اس لئے حضرت مفتی صاحب اس ناکارہ کے حدیث ہی کے استاذ نہیں تحریر کے بھی استاذ و مرشد ہیں ... حضرت مفتی صاحب کے گوناگوں اخلاق وصفات میں ان کی کسر نفسی بلکہ بے نفسی سب سے زیادہ ممتاز تھی ، کبر ونخوت اور خودبینی وخودپسندی کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھیں۔ اپنے خوردوں بلکہ شاگردوں کے شاگردوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ انکساری وفروتنی کا ایسا معاملہ فرماتے تھے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس ناکارہ نے حضرت مفتی صاحب کو سالہاسال میں بھی کبھی غیظ وطیش میں نہیں دیکھا، ایک بار حج پر تشریف لے گئے، ملتزم پر حفظ قرآن کے لئے دعا کی' خواب یا مکاشفہ میں ان کو اشارہ ہوا کہ خیر المدارس ملتان میں حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب کی خدمت مین قرآن کریم یاد کرو۔ واپس آکر حضرت قاری صاحب کی شاگردی قبول کرلی۔ اور چھوٹے بچوں کے ساتھ قرآن کریم یاد کرنے بیٹھنے لگے۔ جب کہ اس وقت اسی خیر المدارس کے شیخ الحدیث اور مفتی اعظم بھی آپ تھے۔ جب تک قرآن کریم کا حفظ مکمل نہیں ہوگیا' وہاں سے نہیں ہٹے۔ ایک بار سبق یاد نہیں ہوسکا تھا حضرت قاری صاحب نے کان پکڑنے کو فرمایا' شیخ الحدیث اور مفتی اعظم فوراً کھڑے ہوگئے☆ حضرت قاری صاحب کی درسگاہ میں پہنچ کر وہ اپنے تئیں واقعۃً طفل مکتب سمجھتے تھے۔ انہیں کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آتا تھا کہ وہ جس مکتب میں معصوم بچے بنے بیٹھے ہیں وہ اس دارالعلوم کا ایک شعبہ ہے جس کے وہ شیخ الحدیث' ناظم تعلیمات اور صدر مفتی ہیں۔ کیا اس بے نفسی کی کوئی مثال اس زمانے میں دیکھی یا سنی جاسکتی ہے؟

☆ اس کے بارے میں ایک ضروری نوٹ ص ۲۴۲ پر ملاحظہ فرمایئے۔

امام بخاریؒ کے ارشاد: قال ابو عبداللّٰہ وبعد ان تسودوا"(۱) پر اگر عمل دیکھا تو حضرت مفتی صاحب کا دیکھا۔

حضرت مفتی صاحب درحقیقت رجال آخرت میں تھے' ان کو جب بھی دیکھا معاشی طور پر تنگ دست ہی دیکھا لیکن وہ اس تنگ دستی کو سرمایہ صد سعادت جانتے تھے۔ جامعہ خیرالمدارس کے ناظم واستاذ حدیث مولانا محمد صدیق صاحب زید مجدھم نے فرمایا کہ ایک بار میں قرض کی وجہ سے پریشان تھا۔ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' انہوں نے پریشانی کا سبب پوچھا' اور جب عرض کیا گیا تو سختی کے ساتھ ہاتھ بھینچ کر نہایت اعتماد ویقین سے فرمایا: "مولوی صاحب! اس سے پریشان نہیں ہونا چاہئے یہ سنت انبیاء ہے"۔ مولانا فرماتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب کے اس فقرے سے میری ساری پریشانی کافور ہو گئی۔

کچھ عرصہ سے حضرت مفتی صاحب پر "جوار مدینہ" کا شوق غالب تھا۔ اور وہ اس کوشش میں تھے کہ انہیں وہاں کا اقامہ مل جائے۔ چنانچہ غیر متوقع طور پر ان کی کوشش بار آور ہوئی اور انہیں رمضان المبارک سے قبل سعودی اقامہ مل گیا تھا' وہ واپسی کا ٹکٹ لے کر یہاں کی ضروریات نمٹانے کے لئے تشریف لائے تھے کہ پاؤں میں معمولی زخم ہو گیا' چونکہ شوگر کی تکلیف تھی اس لئے رفتہ رفتہ زخم نے غیر معمولی شکل اختیار کر لی' قریباً نو مہینے صاحب فراش رہنے کے بعد ۲۵ر جنوری ۱۹۸۵ شب جمعہ کو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔۔۔۔۔۔

مرض الموت کا یہ زمانہ جس حیرت انگیز صبرواستقامت کے ساتھ گذارا وہ خاصان خدا ہی کا حصہ ہے۔ جزع وفزع کا کوئی لفظ زبان سے سرزد نہیں ہوا' بلکہ زبان ہمیشہ شکر وحمد اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتی تھی۔ غنودگی کی حالت میں بھی انگلیوں پر تسبیح شماری جاری رہتی تھی۔ اس پورے عرصہ میں نہ کوئی نماز قضا ہوئی نہ کوئی عمل خلاف سنت ہوا' انتقال سے تھوڑی دیر پہلے پانی طلب فرمایا۔ خدام نے اس خیال سے کہ اٹھانے بٹھانے

---

(۱) امام بخاریؒ نے "باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ" میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے۔ تفقھوا قبل ان تسودوا" (یعنی سرداری اور منصب حاصل ہونے سے پہلے علم حاصل کرلو) اس پر امام بخاریؒ فرماتے ہیں: قال ابو عبداللّٰہ "وبعد ان تسودوا" (یعنی سرداری اور منصب کے بعد بھی)

میں زحمت ہوگی لیٹے لیٹے منہ میں پانی ڈالنا چاہا تو فرمایا "معلوم نہیں کہ لیٹ کر کھانا پینا خلاف سنت ہے، مجھے اٹھا کر بٹھاؤ" چنانچہ اٹھا کر بٹھایا گیا۔ پانی نوش فرمایا، کلمہ شکر ادا کیا۔ اور قبلہ رخ اپنی کروٹ پر لیٹ گئے۔ مرض الموت میں اکثر دعا فرماتے تھے کہ یا اللہ نیند کی حالت میں میری روح قبض کرنا، چنانچہ لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد نیند کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ پاس بیٹھے خدام یہ سمجھے کہ آنکھ لگ گئی ہے۔ ان کو اسی وقت پتہ چلا جب سانس کی آمد وشد یکایک بند ہوگئی اور حضرت مفتی صاحب نے جان، جان آفرین کے سپرد کردی۔

اللّٰھم اغفرلہ، وارحمہ، وعافہ، واعف عنہ، واکرم نزلہ، ووسع مدخلہ، وابدلہ دارًا خیرًا من دارہ واھلاً خیرًا من اھلہ۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

(بینات جمادی الاولی ۱۴۰۵ھ مطابق مارچ ۱۹۸۵ء)

حاشیہ متعلقہ ص ۲۴۰

"بینات" میں میں نے جو الفاظ لکھے تھے مجھے یہی روایت پہنچی تھی۔ لیکن حضرت قاری صاحبؒ کے تلمیذ قاری محمد شفیق الحسن (سول ہسپتال گوجرہ) نے ایک مکتوب میں اس واقعہ کی صحیح نوعیت بیان فرمائی۔ (ان کا یہ مکتوب بینات بابت ماہ رمضان ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوچکا ہے) اس کا ضروری اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:

"میں نے ۱۹۴۵ء میں امام القراء حضرت قاری رحیم بخش صاحبؒ سے گردان قرآن کریم مکمل کیا۔ اور غالباً ۱۹۴۶ء میں سند فراغت حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوا تو مسجد سراجاں میں حضرت قاری صاحبؒ کے پاس اور صاحب بھی موجود تھے۔ باتوں باتوں میں حضرت مفتی محمد عبداللہ صاحبؒ کا ذکر ہوا تو حضرتؒ (قاری صاحب) نے فرمایا۔ کہ مفتی صاحبؒ کو حرم کعبہ میں بحالت نیند ارشاد ہوا۔ کہ مجھے (قاری صاحب) قرآن کریم سنائیں۔ چنانچہ واپسی پر حضرت مفتی صاحبؒ نے باقاعدہ وقت دینا شروع کیا۔ تو فرمانے لگے کہ چونکہ میری درسگاہ کا اصول ہے کہ جس طالب علم کو نیند آئے وہ ازخود کھڑا ہوجاتا ہے۔ بصورت دیگر اسے کان پکڑنے پڑتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ سارے دن کی تھکاوٹ سے چکنا چور ایک روز آئے۔ اور دوران تعلیم انہیں نیند نے گھیرلیا، مفتی صاحبؒ ازخود کھڑے ہوگئے۔ میں نے انہیں قطعاً نہ کھڑے ہونے کو کہا۔ اور نہ کان پکڑنے کو مگر طلباء میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ قاری صاحبؒ نے مفتی صاحبؒ کو کھڑا کردیا۔"

حضرت مولانا محمد شریف جالندھریؒ

(سابق ناظم اعلیٰ مجلس تحفظ ختم نبوت)

۱۵ر فروری ۱۹۸۵ء مطابق ۲۴ر جمادی الاول ۱۴۰۵ھ شب جمعہ کو اذان عشاء کے وقت ختم نبوت کے حُدی خواں مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد شریف جالندھریؒ صاحب رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم، امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے جانثار رفیق، تحریک آزادی کے نڈر سپاہی اور تحریک ختم نبوت کے صف اول کے قائد تھے، مجلس تحفظ ختم نبوت کے یوم تاسیس سے اس کے اہم ترین رکن چلے آرہے تھے اور جب ۷۴ھ میں شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر منتخب ہوئے تو مولانا مرحوم کو جماعت کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا اور جماعت کے نظم ونسق کی تمام ذمہ داری مرحوم کے سپرد کردی گئی۔

ان کے نظامت علیا کے عہدے پر فائز ہونے کے کچھ ہی دن بعد قادیانیوں نے ربوہ اسٹیشن پر ایک حادثہ برپا کردیا۔ جس کے نتیجہ میں ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے تحریک ختم نبوت کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور قادیانیوں کو خارج از ملت قرار دے دیا گیا۔

حضرت بنوریؒ کے بعد قطب العارفین حضرت اقدس مولانا خواجہ خان محمد صاحب مجددی نقشبندی مدظلہٗ (سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں ضلع میانوالی) جماعت کے قائد وامیر منتخب ہوئے۔ تو اس بار بھی جماعت کے ناظم اعلیٰ مولانا مرحوم ہی مقرر ہوئے

اور اس دوسرے دور میں پھر قادیانیوں نے ایک حماقت کی کہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے مبلغ مولانا محمد اسلم قریشی کو سیالکوٹ سے اغوا کرلیا(جن کا سراغ لگانے میں پنجاب پولیس اب تک ناکام ہے) اس کے نتیجہ میں قادیانیوں کے خلاف پھر اشتعال پیدا ہوا۔ جس نے تحریک ختم نبوت ۱۹۸۴ کی شکل اختیار کرلی' یہ موقع بے حد نازک تھا۔ مارشل لاء کے دور میں کسی تحریک کی کامیابی کی گنجائش نہیں تھی۔ قادیانی لابی کی خواہش تھی کہ اس تحریک میں مسلمانوں کا مارشل لاء حکومت سے تصادم ہوجائے جس سے تحریک اور حکومت دونوں بھک سے اڑ جائیں۔ "بیک کرشمہ دو کار" .... اس تصادم کے خطرات شدید سے شدید تر ہوتے جارہے تھے۔ اس موقعہ پر مولانا مرحوم کا صبرو تحمل اور فہم وتدبر کام آیا۔ انہوں نے جماعت کے جوشیلے ہمدردوں کی خواہش کے علی الرغم صدر مملکت سے ملاقات کی۔ اور نہایت متانت وسنجیدگی سے اس مسئلہ پر توجہ کرنے کی گذارش کی۔ اللہ تعالیٰ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے اس مرد قلندر کی گذارشات کو پذیرائی بخشی۔ اور "امتناع قادیانیت آرڈی نینس ۸۴ء" جاری کرکے قادیانیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل واحسان سے اپنے ایک مخلص بندے کی لاج رکھ لی اور اس نازک موقع پر ملت اسلامیہ کو ایک شدید خطرے سے بچالیا۔ مولانا مرحوم اس اعتبار سے بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کی نظامت کے دور میں دونوں موقعوں پر اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ اور ان کو اور ان کی جماعت کو شدید اور نازک ترین امتحانات سے سرخرو نکالا .... فالحمد للہ۔

راقم الحروف کو نہ صرف مولانا مرحوم کی ماتحتی میں ایک عرصہ تک کام کرنے کا موقع ملا ہے بلکہ کئی سال تک ان کی ہمسائیگی کا شرف بھی حاصل رہا ہے' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بہتر جانتے ہیں۔ "ولا ازکی علی اللہ احداً" لیکن اس ناکارہ کو حضرت مولانا مرحوم کی سیرت واخلاق کے جن دقیق پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع ملا' اور ان کی نیکی وپارسائی' ان کے صبرواستقلال' ان کے حلم وبردباری' ان کی انکساری وفروتنی بلکہ خود فراموشی کے جو تجربات مسلسل ہوتے رہے ان سے ان کی عند اللہ قبولیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ شب خیزی کے عادی تھے۔ ذکر وتلاوت کے پابند تھے۔ میں نے انہیں بارہا آہ سحر گاہی میں مشغول اور رات کی تاریکی میں اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتے پایا ہے' وہ خدا

کے سامنے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے۔ اور یہ ایک ایسا وصف ہے جو جدید دور میں بہت ہی کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ اور جسے محاورے کی زبان میں چراغ لے کر ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سوزوگداز کی کیفیت اور "جان قربت دیدہ" کی مستی کا خمار بسا اوقات دن چڑھے تک باقی رہتا تھا۔ اور تاڑنے والی نگاہیں اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہتی تھیں۔ انہیں ذات رسالت ماب(بآبائنا وامھاتنا صلی اللہ علیہ وسلم) سے بے پناہ عشق تھا۔ آپؐ کی ختم نبوت کی پاسبانی ان کے نزدیک اعلیٰ ترین عبادت اور مقدس فریضہ تھا' اور ذکر حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا ساغر محبت اکثر چھلک جاتا تھا۔

اپنے اکابر کے ساتھ ان کا برتاؤ ایسا نیاز مندانہ و خوردانہ تھا جیسے ایک معصوم بچہ ہو جو بات تک نہیں کرنا جانتا' وہ جب اپنی رائے پیش کرتے تھے تو ایسے دھیمے اور ملتجیانہ لہجے میں جیسے کوئی مجرم اپنے قصور کی معافی مانگ رہا ہو۔ مگر رائے ایسی صائب ہوتی تھی کہ اکابر کو اکثر و بیشتر اسی کے مطابق فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس خود فراموشی و خود افگنی کی مثالیں بھی ان گنہ گار آنکھوں نے بہت ہی کم دیکھی ہیں۔ اس ناکارہ کا تاثر یہ ہے کہ ان کی یہ کیفیت ان کے شیخ و مرشد قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی نسبت کا اثر تھا۔

جن حضرات نے ان کے ساتھ برسہا برس کام کیا ہے وہ گواہی دیں گے کہ اپنے رفقاء اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ برادرانہ نہیں بلکہ عاجزانہ ہی رہا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو بڑا بنانے کے عادی تھے۔ ان کی کسی ادا سے یہ محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ بڑے ہیں۔

بچوں کے ساتھ ان کی شفقت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ان کے اپنے بچے ہیں۔ راقم الحروف نے انہیں کبھی کسی بچے کو ڈانٹتے جھڑکتے نہیں دیکھا۔

ان کا خمیر محبت سے اٹھایا گیا تھا۔ وہ سراپا محبت تھے اور مخلوق کی ہمدردی ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ وہ ہر ایک کے کام کو اپنا کام اور ہر ایک کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے۔ انہیں اپنے مخدوم و مرشد سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی طرح صرف دو چیزوں سے نفرت تھی' ایک انگریز دوسرے قادیانیت...... اور یہ نفرت بھی محض عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھی۔ وہ انگریز کو ملت اسلامیہ کا قاتل اور قادیانیت کو نبوت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیمات) کا خبیث ترین حریف تصور کرتے

تھے۔ اور یہ دونوں جرم ان کے حساس دل کے لئے ناقابل برداشت تھے۔

ان کی زندگی کی طرح ان کی موت بھی قابل رشک ہوئی' مرحوم کچھ عرصہ سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ کافی دنوں کی علالت کے بعد قریباً ایک مہینے سے دفتر تشریف لانے لگے تھے۔ جمعرات کو حسب معمول دفتر تشریف لائے اور آج معمول سے زیادہ وقت دفتر میں گذرا' عصر کے بعد ایک صاحب کو ساتھ لے کر کسی صاحب سے ملنے چلے گئے۔ مغرب کے قریب گھر لوٹے۔ مغرب کے بعد سینے میں قدرے تکلیف کا احساس ہوا مگر اس کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ جب درد کچھ زیادہ محسوس ہونے لگا تو ڈاکٹر کو بلایا۔ لیکن ڈاکٹر کے آنے میں تاخیر ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو انہوں نے معائنہ میں کافی دیر لگائی۔ بالآخر مشورہ دیا کہ انہیں ہسپتال پہنچایا جائے۔ بالاخانے سے ان کو نیچے اتارا گیا تو مرحوم نے خود کھڑے ہو کر اپنی لنگی ٹھیک کی۔ لنگی درست کر کے چارپائی پر بیٹھنے لگے تھے کہ نزع کا عالم شروع ہوگیا اور چند لمحوں میں جان جاں آفرین کے سپرد کردی' اور ستر سالہ تھکے ماندے مسافر نے اپنی منزل پالی۔

صد شکر کہ آپہنچا لب گور جنازہ
لو بحر محبت کا کنارا نظر آیا

لائق رشک بات یہ ہے کہ نزع کے دوران مرحوم کے لب مسلسل ذکر میں مصروف رہے۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔ وابدلہ داراً خیراً من دارہ واھلاً خیراً من اھلہ' اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

اگلے دن جمعہ کو نماز جنازہ ساڑھے دس بجے عید گاہ قبرستان ملتان میں حضرت مولانا خان محمد صاحب مدظلہ العالی نے پڑھائی۔ اور ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ ...... جنازہ کے بعد مرحوم کی میت ان کے گاؤں آٹھ کسی تحصیل کبیر والا لے جائی گئی۔ وہاں ان کے وارثوں نے دوبارہ نماز جنازہ پڑھی۔ امامت کے فرائض حضرت اقدس سید نفیس رقم الحسینی مدظلہٗ نے (جو مرحوم کے پیر بھائی اور قطب الارشاد حضرت رائے پوری ؒ کے جلیل

القدر خلیفہ ہیں) پڑھائی...... ملک کے دور دراز مقامات کے وہ حضرات جو ملتان میں شریک جنازہ نہیں ہوسکے تھے انہوں نے وہاں شرکت فرمائی۔ یہ ناکارہ تمام تر کوشش کے باوجود مرحوم کے جنازے میں شریک نہ ہوسکا۔ اگلے دن برادرم عبدالرحمٰن یعقوب باوا اور مولانا عزیز الرحمٰن صاحب زید مجدہٗ کی معیت میں ان کے گاؤں پہنچے' اعزہ کو پرسا دیا اور قبر پر فاتحہ پڑھی گویا مرحوم فرمارہے تھے

"بجنازہ گر نہ نیائی بمزار خواہی آمد"

(بینات جمادی الاخری ۱۴۰۵ھ مطابق اپریل ۱۹۸۵ء)

حضرت حاجی محمد شریف صاحبؒ ہوشیار پوری

۱۹؍ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۱؍ اپریل ۱۹۸۵ء بروز پنج شنبہ غروب آفتاب کے وقت حضرت اقدس حاجی محمد شریف صاحب ہوشیار پوری کا ملتان میں انتقال ہوا' انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے تھے' اسکول کی تعلیم کے بعد' اسکول ہی میں معلم ہوگئے تھے' اسی دوران حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے تعلق ہوا' بالآخر حضرتؒ سے اجازت وخلافت کی دولت میسر آئی۔

حضرت مرحوم پر محبت' فنائیت اور خود فراموشی وخود انکاری کا رنگ بہت ہی غالب تھا' ان کی ہر ادا سے محبت وتواضع ٹپکتی تھی۔ شیخ ومرشد حضرت حکیم الامتؒ کے ساتھ انہیں ایسی والہانہ محبت وعقیدت تھی جس کی مثالیں بہت کمیاب ہیں' اور جب شیخؒ کی جانب سے اجازت وخلافت کی "بشارت" دی گئی تو حاجی صاحب نے جواب میں لکھا:

"حضرت کے ارشاد کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ خدا کی قسم! میں اس قابل ہوں کہ گندی نالی میں پھینک دیا جاؤں اور ہر شخص مجھ پر تھوک تھوک کر جائے"۔

حضرت حکیم الامتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"بس میں اپنے دوستوں کے لئے اسی حالت کا انتظار کیا کرتا ہوں اور وقوع سے مسرور ہوتا ہوں مبارک ہو"۔

حضرت حاجی مرحوم نے اپنی جو کیفیت حضرت حکیم الامتؒ کو لکھی وہ واقعۃً ان کا ملکہ راسخہ بن چکا تھا' ان کی فنائیت' بے نفسی اور خود شکنی کا یہ عالم تھا کہ وہ سکول ماسٹری کے زمانے میں اپنے نوعمر شاگردوں کو بلاتکلف فرمادیتے کہ اگر مجھ میں کوئی عیب دیکھو تو مجھے

اس کی اطلاع ضرور کردو' میں ناراض نہیں ہوں گا' بلکہ خوش ہوں گا' ان کی اس فرمائش پر کسی طالب علم نے اپنے فہم کے مطابق ان کے عیب کی نشاندہی کی تو طالب علم کو شاباش دی' اور شاگردوں کی صف میں برملا اپنے اس "عیب" کا اقرار کرلیا....... ہمارے دینی مدارس کے ایک نوعمر مبتدی طالب علم کو ان کے والد ماجد نے نصیحت کی کہ کبھی موقع ملے تو حضرت حاجی محمد شریف صاحب کی خدمت میں حاضری دیا کرو۔ وہ طالب علم حاجی صاحب" کی خدمت میں گیا تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں کیسا خوش قسمت ہوں کہ ایک طالب علم میرے پاس آیا ہے۔

ان کی فنائیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ حضرت حکیم الامت" کی بارگاہ سے خلافت واجازت کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مبتدی سالک سمجھا اور حضرت حکیم الامت" کے بعد ان کے خلفاء سے اپنا "اصلاحی تعلق" رکھا' پہلے حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب" سے' ان کے بعد حضرت اقدس مفتی محمد حسن امرتسری" سے' ان کے بعد سیدی ومرشدی حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھری" سے' اور ان کے بعد ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی مدظلہم العالی سے' اور یہ تعلق بھی محض رسمی واسمی نہیں بلکہ کامل سپردگی کے ساتھ۔ جس طرح ایک مبتدی قدم قدم پر اپنے شیخ" سے اصلاحی مشوروں کا طالب ہوتا ہے۔ اور اپنے تمام ارادوں کو فنا کرکے شیخ کامل کی اطاعت وانقیاد میں لذت محسوس کرتا ہے' حضرت حاجی صاحب کا اسی نوعیت کا تعلق ان اکابر کے ساتھ رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس فنائیت کی مثالیں اس دور میں بہت ہی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

حضرت مرحوم نے حضرت حکیم الامت" کے وہ گرامی نامے جو ان کے یا ان کی اہلیہ کے نام تھے کچھ عرصہ پہلے "مکتوبات اشرفیہ" کے نام سے شائع کئے تھے جن میں ضمناً ان کے حالات بھی آگئے۔ اور مذکورہ بالا اکابر کے ساتھ ان کے تعلق کی بھی قدرے تفصیل اسی کتاب میں آگئی ہے۔ سالکین کے لئے ان کا مرتب کردہ یہ مجموعہ بہت ہی مفید اور لائق قدر ہے۔

اسی کتاب کے آخر میں انہوں نے اپنا وصیت نامہ بھی تحریر فرمایا ہے وہ بھی لائق دید ہے' اس کا ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے جو بہت ہی نصیحت آموز ہے:

"میرے ایصال ثواب کے لئے کبھی جمع نہ ہوں' نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام۔ ہر شخص منفرداً خود جس کا دل چاہے دعا وصدقہ اور عبادت

نافلہ سے نفع پہنچائے۔ کم از کم تین بار سورۂ اخلاص ہی بخش دیا کریں۔ ان شاء اللہ یہ عمل خود ان کے حق میں بھی بہت نافع ہوگا۔ جس شہر یا گاؤں میں میرا انتقال ہو مجھے وہیں کے عام قبرستان میں دفن کیا جائے۔ کسی دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے اور نہ ہی میرے لئے عام قبرستان سے الگ کوئی جگہ منتخب کی جائے۔ اگر ملتان میں انتقال ہو تو ہماری مسجد کے ساتھ جو قبور کے لئے جگہ ہے وہاں نہ دفن کیا جائے۔

میرے جنازہ میں شرکت کے لئے کسی رشتہ دار یا کسی بزرگ کا انتظار نہ کیا جائے اور نہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرایا جائے۔ وقت پر جتنے افراد موجود ہوں نماز جنازہ پڑھ کر جلد از جلد قبرستان پہنچانے کی کوشش کریں، بے تکلف مخلص احباب جو فوراً پہنچ سکیں ان کو اطلاع کا مضائقہ نہیں"۔ (مکتوبات اشرفیہ ۲۳۹)

افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے یکے بعد دیگرے رخصت ہو رہے ہیں اور دنیا کی تاریکی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ مرحوم کے درجات بلند فرمائیں اور ان کے ساتھ ان کے متعلقین ومتوسلین اور محبین سے بھی رحمت ورأفت کا خاص معاملہ فرمائیں۔

ان سطور کے بعد حضرت حاجی صاحب کے مسترشد قاری محمد اسحاق صاحب کا ایک مضمون (جو موصوف نے اس ناکارہ کی فرمائش پر لکھا تھا) موصول ہوا۔ اس کو اسی کے ساتھ شامل کرنا مناسب معلوم ہوا۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

وقت کی اہمیت : وقت زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے اس کی بہت قدر کرنا چاہئے اسے ضائع نہ کرو۔ مجمعوں میں، حویلیوں میں بیٹھ کر لایعنی باتوں میں وقت گزارنا بہت بڑا خسارہ ہے۔ ہمارے حضرت کو وقت کی بہت قدر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حضرت کی فطرت ہی میں وقت کی اہمیت کو مضمر کردیا تھا۔ حضرت کو ابتداء ہی سے وقت کے ایک ایک لمحہ کو صحیح اور برمحل استعمال کرنے کا اہتمام تھا۔ چنانچہ اسی کی برکت

ہے کہ حضرت رحمہ اللہ علیہ نے رشد وہدایت اور علوم دین کی تبلیغ اور اشاعت کا ایک بہت گراں قدر اور بہت بڑا ذخیرہ ہمارے لئے اور آئندہ نسلوں کے لئے مہیا فرمادیا ہے' ہر وقت حضرت کی نظر گھڑی پر رہتی تھی اور نہایت سہولت اور بے تکلفی سے ہر کام کو وقت پر انجام دیتے تھے۔ ساری عمر اپنے تمام معمولات اور ضروریات زندگی کو مقررہ اوقات میں ایک ہی انداز میں ڈھال لیا تھا۔ فرماتے کسی کام کو اس امید پر ملتوی کرنا کہ پھر کسی فرصت کے وقت اطمینان سے پورا کرلیں گے سخت غلطی ہے۔ اس کو اسی وقت انجام دینا چاہئے۔ کام کو وقت پر پورا نہ کرنے سے اکثر ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ وقت بڑے قدر کی چیز ہے۔ دین ودنیا کی دولت یہی ہے۔ حضرت کو فراغت قلب بہت عزیز تھی۔ فرماتے مجھے وقت کی ناقدری سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ نہ میں کسی کو کسی معاملہ میں منتظر رکھتا ہوں نہ انتظار کی تکلیف برداشت کرسکتا ہوں۔ میں ہر کام سے وقت پر فارغ ہوجاتا ہوں۔ فرماتے میں یہ نہیں کہتا کہ میں ہروقت ذکر اللہ میں مشغول رہتا ہوں مگر دل یہ چاہتا ہے کہ قلب فارغ ہو اگر ذکر اللہ کرنا چاہوں تو موانع تو نہ ہوں۔ میں جو بعض لوگوں سے الجھتا ہوں وجہ یہ ہے کہ لوگ بات صاف نہیں کرتے وقت ضائع ہوتا ہے۔ مجھے ایک لمحہ کا ضائع ہونا سخت ناگوار ہے۔ مجھے فراغ قلب بہت عزیز ہے۔ میری طبیعت میں گرمی ہے اور یہ گرمی انجن کا کام دیتی ہے۔ ہروقت تقاضا ہوتا ہے کہ جلدی کرو جلدی کرو کام کو ختم کرو۔ جب میں کسی کام کو شروع کرتا ہوں اسی وقت سے تقاضا شروع ہوجاتا ہے کہ کام کو ختم کرو۔ متواتر کام پر لگا رہتا ہوں اور ختم کے قریب تو میرا حال یہ ہوتا ہے کہ ساری رات لکھتا رہتا ہوں ایک منٹ بھی نہیں سوتا۔ کام ختم کرکے ہی دم لیتا ہوں۔

ہر روز کی ڈاک اسی دن ختم کرتا ہوں' اس کی دو وجہ ہیں۔ میں اپنے قلب کو فارغ کرنا چاہتا ہوں' اور یہ چاہتا ہوں کہ ہر ایک کو اس کا خط وقت پر ملے اسے انتظار کی تکلیف نہ ہو۔

فرمایا مجھے ذرا سی بات بھی اگر فضول ہو تو اس سے نہایت انقباض ہوتا ہے۔

یہ عمر رأس المال ہے کہ ہر سانس ایک بیش قیمت جوہر اور گویا بھرپور خزانہ ہے جس سے ابدی سعادت حاصل ہوسکتی ہے' اور جب عمر پوری ہوگئی تو تجارت ختم ہوگئی پھر غفلت میں گزرے ہوئے وقت پر حسرت ہوگی مگر یہ حسرت کام نہ آئے گی۔ اب دارالعمل نہیں اب دارالحساب ہوگا۔ اس لئے فرصت کو غنیمت جانو اور حساب کی تیاری کرلو۔

جب آدمی مرجاتا ہے تو ایک ایک نیکی کے لئے ترستا ہے۔ اہل قبور پاس سے گذرنے والوں سے تمنا کرتے ہیں کہ کوئی ایک دفعہ سبحان اللہ یا الحمد پڑھ کر ثواب بخش دے۔

اے کہ برما ے روی دامن کشاں
از سر اخلاص الحمدے بخواں

جب ایک ایک نیکی کے لئے آدمی ٹکریں مارے گا تو اب وقت ہے جتنی چاہو نیکیاں کمالو۔ مرنے کے بعد اگر حسرت کرے گا تو اس سے کیا نفع ہوگا' ایک ایک سانس غنیمت اور بے بہا موتی ہے' اس کی قدر پہچانو' آج کا کام کل پر کبھی نہ ڈالو آج ہی کرو۔ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" جو کچھ ہونا تھا ہو چکتا ہے' غفلت میں گذرے ہوئے وقت پر حسرت ہوگی مگر یہ حسرت نفع نہ دے گی۔

جس کو مقصود حضرت حق ہوں اس کو اور فضول خرافات سے اور فضول جھگڑوں کی کہاں فرصت یہ تو انہیں کا کام ہے جو آخرت سے بے فکر ہیں۔ دوسرے کی فکر تو وہ کرے جو اپنے سے فارغ ہو۔

عبدیت وفنائیت:

ارشاد فرمایا کہ میں ہر روز تہجد کے وقت اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر یہ دعا کرتا ہوں۔

"یا اللہ! آپ نے قیامت کے روز جتنے مجھ سے سوال کرنے ہوں' میں ابھی سے اس کا جواب دیئے دیتا ہوں کہ میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں اس لئے محض اپنے فضل وکرم سے معاف فرمادیجئو "

حضرت رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ مسجد میں پہلی صف میں ہمیشہ بائیں طرف بیٹھتے تھے۔

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آپ ہمیشہ پہلی صف میں بائیں طرف بیٹھتے ہیں جب کہ دائیں طرف بیٹھنے میں بہت فضیلت حدیث شریف میں آئی ہے۔

تو حضرت نے ارشاد فرمایا:

"مجھے بھی معلوم ہے کہ دائیں طرف بہت فضیلت ہے' لیکن میں یہ جگہ یعنی دائیں طرف نیک لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہوں' اور میں اپنے آپ کو سب میں ذلیل ترین دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میں بائیں طرف رہوں"۔

ایک دفعہ احقر نے لکھ کر دیا کہ حضرت کے جو ملفوظات ہوتے ہیں دل چاہتا ہے کہ اسی وقت نوٹ کرلیا کروں' بعد میں بعینہ وہی الفاظ نوٹ کرنا دشوار ہوتے ہیں اس لئے اجازت عطا فرمائی جائے کہ احقر مجلس ہی میں نوٹ کرلیا کرے' اس کے جواب میں حضرتؒ کے تحریر فرمودہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"میں تو نالائق دربار اشرف ہوں' اس لئے شرم دامن گیر ہوگی۔ ایسا نہ کریں"

ایک دفعہ ارشاد فرمایا:

"کہ کوئی شخص آکر مجھ سے بیعت کی درخواست کرتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے چڑا رہا ہے' زیادہ اصرار کرتا ہے تو حضرتؒ کا حکم سمجھ کر بیعت کرلیتا ہوں"۔

ایک متعلق نے حضرتؒ کی خدمت میں اپنے بیٹے کی نافرمانیوں کا حال لکھا اور اپنی بہت زیادہ پریشانی کا اظہار کیا تو حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"کہ حالات کو پڑھ کر بہت صدمہ ہوا' کاش وہ لڑکا میرے سامنے ہوتا تو میں اپنی پگڑی اس کے پاؤں پر رکھ دیتا' یہ خط جب واپس پہنچا تو لڑکے کے والد صاحب یہ خط پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے' اسی نافرمان لڑکے نے آکر پوچھا کہ ابا کیا بات ہے؟ آپ رو رہے ہیں تو باپ نے وہ خط سامنے کردیا' خط پڑھتے ہی لڑکے کی حالت بدل گئی اور وہ فرماں بردار بن گیا"۔

حضرت اپنی مسجد میں امامت کے فرائض خود انجام دیتے تھے' اور صبح کو کتاب پڑھ کر سناتے تھے' پیرانہ سالی کی وجہ سے حضرت رحمہ اللہ نے امامت اور کتاب سنانے کی خدمت میرے متعلق کردی۔ حضرتؒ کے حکم سے کتاب میں سنانے لگا۔ چند احباب نے

تقاضا کیا کہ میرے کتاب سنانے کے بجائے حضرتؒ خود چند کلمات فرمادیا کریں لیکن منظور نہیں فرمایا۔ ایک صاحب نے چند رفقاء کے ساتھ تحریری طور پر حضرت کی خدمت میں درخواست کی۔ اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ

محترم و مکرم جناب خان صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

جناب کے جذبات محبت اور دعاؤں سے یہ ناکارہ بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ایک کیف و سرور کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ خان صاحب! بات اصل میں یہ تھی کہ نماز کے بعد امام کی جگہ فوراً بیٹھنا اور بجائے امام کے کچھ بیان کرنے میں دعویٰ اور امتیاز کی سی صورت تھی۔ جو مجھے پسند نہ تھا۔ دعویٰ اور امتیاز میں بڑے مفاسد ہیں اور عبادت کا حاصل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے مٹنا ہے۔ اور دعویٰ اور امتیاز اس کی ضد ہے جو مہلک ہے۔

لیکن محبت میں ایسی کشش ہے جیسی مقناطیس میں ہوتی ہے کہ وہ لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔ میں لوہے سے بدتر ہوں' لیکن آپ کی محبت نے مجھے کھینچ لیا۔ انکار کی گنجائش وہمت نہیں پاتا اور پھر یہ محبت و تمنا صرف آپ کی نہیں سب احباب کی ہے اس لئے بھی مجھے خود رائی نہیں کرنا چاہئے۔ سر تسلیم خم ہے ان شاء اللہ کچھ کہہ دیا کروں گا۔ چونکہ مجھے ہر ایک کی آزادی محبوب ہے۔ میں کسی کو مقید رکھنا نہیں چاہتا اور بعض حضرات کو ضروری کام ہوتے ہیں میں ان کا حرج نہیں کرنا چاہتا' اس لئے امام کی دعا کے بعد کچھ کہا کروں گا' تاکہ ہر ایک کی آزادی برقرار رہے۔ جو چاہے چلا جاوے۔ آپ حضرات کی دعاؤں کا ممنون۔

احقر محمد شریف عفی عنہ

۷۰۹ ۔ نواں شہر ملتان

ہمارے والد صاحب کبھی کبھی صبح کی نماز حضرت والا کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت میری فلاں بات آپ اگر والد صاحب کو کہہ دیں تو والد صاحب مان جائیں گے تو حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ جب آئیں گے تو کہہ دوں گا۔ اس کے بعد میں نے جاکر والد صاحب سے عرض کیا کہ حضرتؒ نے آپ سے کوئی بات کرنی ہے آپ صبح کی نماز میں آجائیں' تو والد صاحب صبح کی نماز میں آگئے۔ حضرت نے میری وہ بات والد صاحب سے کہہ دی۔ والد صاحب کے چلے جانے کے بعد حضرت والاؒ نے مجھ سے دریافت فرمایا' کیا تم نے تو والد صاحب کو جاکر یہ نہیں کہا میرے ہاں کا کہ وہاں جاؤ کوئی بات کرنی ہے۔.....

میں نے عرض کیا کہ کہا تھا یہ بات سُنی تھی کہ حضرت بے تاب ہوگئے' فرمایا کہ تم نے کیوں کہا میں نے کہا تھا کہ وہ جب آئیں گے تو میں کہہ دوں گا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ بیٹھو میں تمہیں خط لکھ کر دیتا ہوں اس پر ان سے لکھوا کر لاؤ کہ معاف کردیا اور مندرجہ ذیل خط لکھ دیا۔

محترم و مکرم جناب عبدالقیوم صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ صبح آپ کو ضروری کام تھا' آپ حرج کرکے مجھے ملنے آئے' اور محمد اسحاق کے تقاضا پر تشریف لائے۔ میں نے آپ کو نہیں بلایا تھا صرف یہ کہا تھا کہ جب ملنا ہوگا کہوں گا کہ اسحاق کو میں نے سمجھا دیا ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو مجھے خود آپ کی خدمت میں آنا چاہیئے تھا۔ مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ میں یہ کہوں کہ آپ آئیں۔ بہرحال میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔ میں معافی چاہتا ہوں مجھے معاف فرمادیں۔ یقین جانیں میں جو کچھ کہتا ہوں آپ سے ہمدردی اور آپ سے محبت کی وجہ سے کہتا ہوں' دل چاہتا ہے آپ سب آرام سے رہیں' کیونکہ یہ غلطی اسحاق نے کرائی مگر میری وجہ سے ہوئی اس لئے معافی چاہتا ہوں' کوئی بات خلاف مزاج میں نے کہی ہو اس کی بھی معافی چاہتا ہوں۔ اس پرچہ پر دستخط کرکے مجھے بھیج دیں۔ یہ بھی تحریر فرمادیں کہ

معاف کردیا ہے۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔

۲۷ر صفر ۱۳۹۸ھ

دعاگو

احقر محمد شریف عفی عنہ

۷۰۹ نواں شہر۔ ملتان

(بینات رمضان ۱۴۰۵ھ مطابق جون ۱۹۸۵ء)

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ

یہ خبر قارئین کے علم میں آچکی ہوگی کہ جمعیتہ علماء اسلام پاکستان کے صدر اور انجمن خدام الدین لاہور کے امیر حضرت مولانا عبید اللہ انورؔ بتاریخ ۷ر شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۸ر اپریل ۱۹۸۵ء بروز اتوار صبح ساڑھے سات بجے رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ مرحوم امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے نواسے اور قطب الارشاد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلف الرشید وجانشین تھے ' دینی علوم کی تکمیل ازہر الہند دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے کی تھی' مرحوم کا شمار علمائے دیوبند کی صف اول کے حضرات میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے والد ماجد اور مرشد ومربی حضرت لاہوری قدس سرہٗ کے بعد ان کے پورے کام کو سنبھالا' مدرسہ قاسم العلوم ' انجمن خدام الدین' ہفت روزہ خدام الدین' ذکرو شغل اور اصلاح وارشاد کے سلسلہ کو بڑی خوش اسلوبی سے چلایا۔

حضرت مرحوم' فہم ودانش' حلم وتدبر' صبرواستقامت' اعتدال پسندی اور تواضع میں بہت ممتاز تھے۔ اپنے والد صاحب کے نقش قدم ظاہر وباطن کے جامع اور مجاہدہ وجہاد دونوں کے شہسوار تھے۔ جمعیتہ علمائے اسلام کے روح رواں تھے۔ اور ان کی قائدانہ صلاحیتیں ملک وملت کے لئے وقف تھیں۔ حضرت مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہٗ کے بعد ان کی وفات جمعیتہ علماء اسلام' اہل حق اور ملک وقوم کے لئے غالباً سب سے بڑا سانحہ ہے۔

مرحوم ایوب خان کے دور میں پولیس کے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنے' جس سے ان کی ریڑھ کی ہڈی کو صدمہ پہنچا' انہوں نے جواں ہمتی کے ساتھ اس صدمہ کو برداشت تو کرلیا' اور اپنے معمولات ومشاغل بدستور جاری رکھے لیکن ان کی صحت پوری طرح بحال نہ ہوسکی' بلکہ اس میں تدریجی انحطاط جاری رہا' وفات سے ایک ہفتہ پہلے انہیں بے

ہوشی کی حالت میں میو ہسپتال لایا گیا۔ طبی تشخیص کے مطابق ان کے جگر کا فعل بند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے علاج معالجہ کی اپنی سی کوشش کی' لیکن وقت موعود آچکا تھا۔ اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ ۲۸ر اپریل کو ساڑھے سات بجے جان کی امانت جان آفریں کے سپرد کردی .... اور **یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** کے مصداق ابدی راحتوں سے سرفراز ہوئے۔ وفات کے بعد چہرۂ انور پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں نماز جنازہ حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مدظلہم نے پڑھائی' اور میانی صاحب کے قبرستان میں حضرت اقدس مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ کے پہلو میں انہیں سپردِ خاک کیا گیا' حق تعالیٰ شانہٗ ان کی بال بال مغفرت فرمائیں۔ اور رحمت و رضوان کے درجات عالیہ نصیب فرمائیں' حضرت مرحوم کے صاحب زادہ جناب مولانا اجمل قادری صاحب اور ان کے دیگر اعزہ کو صبر جمیل نصیب فرمائیں۔

(بینات رمضان ۱۴۰۵ھ مطابق جون ۱۹۸۵ء)

حضرت الاستاذ شیخ الحدیث

مولانا محمد عبد اللہ رائے پوریؒ

۲۶ر رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۶ر جون ۱۹۸۵ء یک شنبہ کا آفتاب غروب ہونے کے ساتھ ہی علم و عمل، زہد و تقویٰ، ورع و احتیاط اور بے نفسی و تواضع کا آفتاب بھی غروب ہوا، یعنی جامعہ رشیدیہ ساہی وال کے شیخ الحدیث سیدی و سندی و استاذی حضرت اقدس مولانا محمد عبداللہ رائے پوری واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس ناکارہ کو جو تعلق حضرت الاستاذ (نور اللہ مرقدہ) سے تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت کی وفات کی خبر سنتے ہی ماہنامہ بینات میں قلم کے دو چار آنسو بہا کر اپنے نیاز مندانہ تلمذ کا حق ادا کرتا، لیکن قضا وقدر کے فیصلوں کے آگے انسانی تدبیر سپر انداز ہے۔ رمضان مبارک کے بعد مسلسل عوارض پیش آتے گئے اور پھر اسفار کا طویل سلسلہ شروع ہوا اس دوران قلم و قرطاس سے ایسی ناآشنائی رہی کہ کسی کو اطمینان سے خط لکھنے کا موقع بھی میسر نہ آسکا۔

حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ سے اس ناکارہ کا پہلا تعارف شوال ۱۳۶۸ھ میں اس وقت ہوا جب میں حضرت مولانا قاری لطف اللہ شہیدؒ سے تلمذ کے شوق میں مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی ضلع بہاولنگر پہنچا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حضرت قاری صاحب مرحوم تقسیم سے قبل ایک سال مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے مدرسہ انوریہ شاہی مسجد کمیٹی باغ لدھیانہ میں مدرس رہے تھے اور وہاں اس ناکارہ کو ان سے ابتدائی عربی (نحو میر، شرح مائۃ عامل) پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ ان کا طرز تفہیم ایسا دلکش تھا کہ میں ان کا گرویدہ ہو کر رہ گیا، قیام پاکستان کے بعد میں ان کا متلاشی رہا۔ پہلی بار غالباً رمضان ۱۳۶۸ھ میں پتہ چلا کہ وہ مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی میں مدرس ہیں وہاں جا کر معلوم ہوا کہ "بڑے مولانا" حضرت قاری صاحب کے برادر اکبر حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب

ہیں۔ اسباق تقسیم ہوئے تو ترجمہ قرآن کریم اور مختصر المعانی کے اسباق "بڑے مولانا" کے پاس گئے۔ ہدایہ اولین میرے محبوب استاذ حضرت قاری صاحب مرحوم کے پاس اور نور الانوار حضرت مولانا مفتی عبداللطیف صاحب مدظلہ العالی کے پاس گئی۔

حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ واقعتاً استاذ تھے۔ اور تدریس کا حق ادا فرماتے تھے۔ ترجمہ قرآن' مختصر معانی' شرح جامی اور مشکواۃ شریف میں ان کا خاص شہرہ تھا۔ اسی سال مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری (قدس سرہ) تشریف لائے تو ہم لوگ ان کی خدمت پر مامور ہوئے' حضرت امیر شریعتؒ نے ازراہ تلطف اسباق دریافت فرمائے تو عرض کیا گیا کہ ترجمہ قرآن کریم اور مختصر معانی حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے پاس ہیں۔ شاہ جیؒ نے فرمایا:

"خدا کا شکر کرو کہ تم ترجمہ قرآن مولانا عبداللہ سے پڑھتے ہو"۔

حضرت کے کمالات کا اندازہ ہم ایسے نو آموز طلبہ کو کیا ہو سکتا تھا' ہم تو بس ان کے لطف و کرم' ان کی شفقت و محبت اور ان کے انداز تدریس پر فریفتہ تھے۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے حضرت الاستاذ کی عظمت کا نقش میرے دل پر قائم ہوا' اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔ ہوا یہ کہ حضرت مولانا اور ہمارے مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا فضل محمد صاحب مرحوم کے درمیان کچھ رنجش ہوگئی جس سے باہمی تعلقات ناخوشگوار ہوگئے۔ اس ناکارہ کو تو اپنی نوعمری کی وجہ سے اس کا علم بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ میں حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ کے کمرہ کے سامنے سے گذر رہا تھا' موصوف نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے حاضرین سے فرمایا کہ "یہ بھی انہی (حضرت مولاناؒ) کی پارٹی کا ہے"۔ (چونکہ اس ناکارہ کو حضرت الاستاذ سے بہت ہی اخلاص تھا اس لئے حضرت مہتمم صاحب کا یہ سمجھنا اپنی جگہ بالکل صحیح تھا مگر اس ناکارہ کو نہ ان اکابر کی رنجش کا علم تھا' نہ حضرت الاستاذ نے اپنی مجلس میں کبھی اس کا تذکرہ فرمایا تھا) اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں مجھے حضرت مہتمم صاحب کے اس فقرہ پر بہت غصہ آیا اور میں نے اپنے کمرہ میں آکر ان کی خدمت میں بہت ہی لمبا خط لکھا۔ اب یاد نہیں کہ اس میں کیا اناپ شناپ لکھا ہوگا' مگر خلاصہ مضمون یہ تھا کہ بڑوں کی لڑائی میں چھوٹوں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں' اس لئے آپ کا یہ سمجھنا کہ میں حضرت الاستاذ کی پارٹی میں ہوں اور آپ کا مخالف ہوں' قطعاً غلط فہمی ہے' میرے نزدیک اپنی رنجش کے باوجود آپ دونوں

بزرگ لائق احترام ہیں۔ اور میرے دل میں واقعۃً دونوں کا یکساں احترام ہے۔ مگر چونکہ میں حضرت مولانا کا شاگرد ہوں اس لئے قدرتی طور پر ان سے زیادہ تعلق ہے اور ان کی خدمت میں حاضری بھی زیادہ ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ شانہ، حضرت مہتمم صاحب کے بہت ہی درجات بلند فرمائیں اور ناکارہ کی گستاخیوں کو معاف فرمائیں۔ حضرت مہتمم صاحب خط پڑھ کر بہت ہی خوش ہوئے....... اور یاد پڑتا ہے کہ مجھے بلا کر انعام بھی دیا۔ اگلے دن اس ناکارہ نے تنہائی میں حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ سے عرض کیا کہ آپ کی اور حضرت مہتمم صاحب کی رنجش ہے اور اس سے ہم خوردوں کے لئے بڑی مشکل درپیش ہے، اگر ایک کے پاس جاتے ہیں تو دوسرے کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ یہ ان کا ہے ہمارا نہیں ہے۔ حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ میری اس بات کو سن کر خاموش رہے کچھ نہیں فرمایا لیکن اگلے ہی دن حضرت مہتمم صاحب سے صلح صفائی کرلی، یہ ناکارہ حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک صاحب نے کہا کیا مہتمم صاحب سے آپ کی صلح ہوگئی ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا:

> "جب دو شخصوں کے درمیان رنجش ہوتی ہے تو ہر فریق یہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور دوسرا فریق قصوروار ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں خود ہی کو قصوروار سمجھ کر مہتمم صاحب سے معذرت کرلوں"۔

ترمذی شریف کی یہ حدیث تو ہم نے بہت بعد میں پڑھی کہ "جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے اس کے لئے جنت کے وسط میں گھر بنایا جاتا ہے اور جو شخص ناحق ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے اس کے لئے جنت کے اطراف میں گھر بنایا جاتا ہے(۱) لیکن اس حدیث کا عملی نمونہ پہلی بار حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں دیکھنے کا موقعہ ملا

فقیروالی میں کسی صاحب کے پاس قادیانیوں کا پرچہ "الفضل" آتا تھا، اب یاد نہیں

---

(۱) عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ترک الکذب وھو باطل بنی لہ فی ربض الجنۃ ومن ترک المراء وھو محق بنی لہ فی وسطھا (الحدیث) وقال الترمذی ھذا حدیث حسن لانعرفہ الا من حدیث سلمۃ بن وردان عن انس۔

(جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی المراء ص۲۰ ج۲)

پارہ: 8
سورۃ الاعراف
آیت نمبر 35

کہ وہ پرچہ میرے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ اس میں قادیانیوں کے اس عقیدے پر کہ "نبوت اب بھی جاری ہے" قرآن کریم کی آیت "**یا بنی اٰدم اما یاتینکم رسل منکم**" آلایۃ سے استدلال کیا گیا تھا۔ میں اسے پڑھ کر بہت پریشان ہوا' وہ پرچہ لے کر حضرت الاستاذ (نور اللہ مرقدہٗ) کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ نے سن کر فرمایا کہ یہ تو قادیانیوں کا مشہور استدلال ہے۔ اور پھر روح المعانی سے نکال کر دکھایا کہ یہ میثاق عالم ارواح میں لیا گیا تھا۔ مناسب ہوگا کہ یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے فوائد کی عبارت نقل کردی جائے وہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"ابن جریر نے ابو یسار سلمی سے نقل کیا ہے کہ یہ خطاب **یا بنی اٰدم اما یاتینکم** الخ کل اولاد آدم کو عالم ارواح میں ہوا تھا۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے **قلنا اھبطوا منھا جمیعا فاما یاتینکم منی ھدًی** الخ اور بعض محققین کے نزدیک جو خطاب ہر زمانہ میں ہر قوم کو ہوتا رہا۔ یہ اس کی حکایت ہے میرے نزدیک دو رکوع پہلے سے جو مضمون چلا آرہا ہے اس کی ترتیب وتنسیق خود ظاہر کرتی ہے کہ جب آدم وحوا اپنے اصلی مسکن (جنت) جہاں ان کو آزادی اور فراخی کے ساتھ بلا روک ٹوک زندگی بسر کرنے کا حکم دیا جاچکا تھا، عارضی طور پر محروم کردیئے گئے تو ان کی مخلصانہ توبہ وانابت پر نظر کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ اس حرمان کی تلافی اور تمام اولاد آدم کو اپنی آبائی میراث واپس دلانے کے لئے کچھ ہدایات کی جائیں۔ چنانچہ ہبوط آدم کا قصہ ختم کرنے کے بعد معا **یابنی اٰدم قد انزلنا علیکم لباسًا** الخ سے خطاب شروع فرما کر تین چار رکوع تک ان ہی ہدایات کا مسلسل بیان ہوا ہے۔ ان آیات میں اولاد آدم کو گویا بیک وقت موجود تسلیم کرکے عام خطاب کیا گیا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد ہم نے بہشتی لباس وطعام کی جگہ تمہارے لئے زمینی لباس وطعام کی تدبیر فرمادی۔ گو جنت کی خوشحالی اور بے فکری یہاں میسر نہیں تاہم ہر قسم کی راحت و آسائش کے سامان سے منتفع ہونے کا تم کو موقع دیا تاکہ تم یہاں رہ کر اطمینان سے اپنا مسکن اصلی اور آبائی ترکہ واپس لینے کی تدبیر کرسکو۔ چاہئے کہ شیطان لعین کے مکر وفریب سے ہوشیار رہو کہیں ہمیشہ کے لئے تم کو اس میراث سے محروم نہ کردے۔ بے حیائی اور اثم وعدوان سے بچو۔ اخلاص وعبودیت کا راستہ اختیار کرو۔ خدا کی نعمتوں سے تمتع کرو مگر جو حدود وقیود مالک حقیقی نے عائد کردی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ پھر دیکھو ہر قوم اپنی مدت موعودہ پوری کرکے کس طرح اپنے

ٹھکانے پر پہنچ جاتی ہے۔ اس اثناء میں اگر خدا کسی وقت تم ہی میں سے اپنے پیغمبر مبعوث فرمائے جو خدا کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے تم کو اپنے باپ کی اصل میراث (جنت) حاصل کرنے کی ترغیب و تذکیر ہو اور مالک حقیقی کی خوشنودی کی راہیں معلوم ہوں ان کی پیروی اور مدد کرو۔ خدا سے ڈر کر برے کاموں کو چھوڑو اور اعمال صالحہ اختیار کرو تو پھر تمہارا مستقبل بے خوف و خطر ہے تم ایسے مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں سکھ اور امن واطمینان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہاں اگر ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان پر عمل کرنے سے کترائے تو مسکن اصلی اور آبائی میراث سے دائمی محرومی اور ابدی عذاب وہلاکت کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ بہرحال جو لوگ اس آیت سے ختم نبوت کی نصوص قطعیہ کے خلاف قیامت تک کے لئے انبیاء و رسل کی آمد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس جگہ کوئی موقعہ اپنی مطلب براری کا نہیں"۔ (حاشیہ ترجمہ حضرت شیخ الہند ص ۲۰۰)

فقیروالی کے ایک سالہ قیام کے بعض اور واقعات بھی ابھی تک لوح حافظہ پر ثبت ہیں، لیکن مضمون کی طوالت کے اندیشہ سے ان کو قلم زد کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ حضرت الاستاذ سے تلمذ کا سلسلہ ایک سال سے زیادہ نہ رہ سکا۔ آئندہ سال یہ حضرات جامعہ رشیدیہ تشریف لے گئے، اور یہ ناکارہ بعض رفقائے درس کی عنایت سے وہاں نہ جاسکا بلکہ مادر علمی خیر المدارس ملتان چلا گیا۔ خیر المدارس کے چار سالہ زمانۂ طالب علمی کے دوران حضرت الاستاذ کی تشریف آوری یہاں کثرت سے ہوتی رہی، اور ہر بار کی زیارت میں ان سے محبت و عقیدت میں اضافہ ہوتا رہا۔ خیر المدارس میں میرا دورۂ حدیث کا سال تھا۔ حضرت الاستاذ ملتان تشریف لائے۔ کسی دوست سے ملاقات کے لئے چوک شہیداں تشریف لے گئے۔ یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا۔ راستہ میں مجھ سے فرمایا آئندہ کا کیا ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی تو کوئی بات ذہن میں نہیں۔ فرمایا مولوی فاضل کر کے کسی اسکول میں ملازمت کرلی جائے اور یہ نیت کرلی جائے کہ اگر میں اس جگہ کو پر نہیں کروں گا تو ہوسکتا ہے کہ کوئی ملحد، بے دین، قادیانی، اور رافضی اس کو پر کرے، امت کو ایسے لوگوں کے فتنہ سے بچانے کی نیت سے اسکول کی ملازمت کرنا بھی ایک دینی خدمت اور کار ثواب ہے ...... حضرت کی اس گفتگو پر مجھے بہت حیرت ہوئی، کیونکہ میں انہی سے کئی بار نو آموز اہل علم کی شکایت سن چکا تھا کہ لوگ آٹھ دس سال دینی مدارس میں پڑھتے ہیں پھر مولوی فاضل کر کے سکولوں میں چلے جاتے ہیں اور جو

کچھ پڑھا پڑھایا تھا سب غارت کردیتے ہیں۔ حضرت الاستاذ کی اس بار بار کی تلقین سے مجھے اس لائن سے نفرت ہوگئی تھی کہ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضرت جس چیز کی بڑی شدومد سے مخالفت کیا کرتے ہیں آج خود ہی اس کی ترغیب دے رہے ہیں' میں ادباً خاموش رہا۔ صرف اتنا عرض کیا کہ اسکول کی ملازمت کا تو خیال نہیں۔ "مولوی فاضل" کے سلسلہ کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد ہم خیر المدارس میں "تکمیل" کے درجہ میں تھے۔ میرے دو تین رفقاء نے اسی سال "مولوی فاضل" کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ اور وہ بلطائف الحیل مجھے بھی اس کی ترغیب دلاتے اور میں کوئی نہ کوئی عذر کردیتا۔ ایک دن جب انہوں نے بہت زور باندھا تو میں نے پھر عذر کرتے ہوئے کہا کہ بھائی میں فقیر آدمی ہوں' میرے پاس داخلہ فیس کہاں سے آئے گی؟ ان میں سے ایک دوست بولے' آپ اس پر آمادہ ہوں تو آپ کی فیس داخلہ میرے ذمہ رہی' میں نے کہا واقعی آپ فیس ادا کریں گے؟ انہوں نے بڑے وثوق سے اطمینان دلایا کہ تم تیار ہو تو فیس میرے ذمہ .... میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو اب اصل عذر عرض کئے دیتا ہوں۔ اگر یونیورسٹی کی طرف سے مجھے یہ خط آئے کہ تم "مولوی فاضل" کے امتحان میں آکر بیٹھ جاؤ۔ اور ایک حرف لکھے بغیر خالی کاغذ چھوڑ کر چلے جاؤ' ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں سب سے اول درجہ میں کامیاب قرار دیا جائے گا تب بھی میں "مولوی فاضل" کی امتحان گاہ میں قدم رکھنے پر آمادہ نہیں ہوں گا' کیونکہ میں اس امتحان گاہ میں جانے کو اہل علم کی توہین سمجھتا ہوں' یہ سن کر تمام رفقاء خاموش ہوگئے' اس کے بعد انہوں نے مجھے ترغیب دینے کا خیال ترک کردیا ....

"مولوی فاضل" سے یہ انتہا پسندانہ نفرت حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کی تعلیم و تلقین کا فیض تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس ناکارہ کے بہت سے عزیز "مولوی فاضل" کے بعد نہ جانے کیا سے کیا ہوگئے مگر یہ ناکارہ کورے کا کورا ہی رہا۔ .... حق تعالیٰ شانہٗ حضرت الاستاذ کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے کہ "مولوی فاضل" کے بارے میں اس ناکارہ کا دقیانوسی ذہن آج تک تو بدلا نہیں اور شاید مرتے دم تک نہ بدلے۔

روح پدرم شاد کہ بگفت باستاذ
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

شوال ۱۳۸۷ھ سے شعبان ۱۳۹۳ھ تک راقم الحروف کو حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کے زیر سایہ' جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں تدریسی خدمات کا موقع میسر آیا' ان دنوں مدرسہ کی فضا اور اس کا ماحول حضرت الاستاذؒ کی برکت سے ایک خاص امتیاز رکھتا تھا' ایک دو کے سوا باقی تمام اساتذہ حضرتؒ کے شاگرد تھے۔ سب ہی اساتذہ حافظ قرآن تھے۔ باہمی الفت و محبت اور یگانگت کے لحاظ سے "یک جان چند قالب" یا حدیث شریف کے الفاظ میں "**علیٰ قلب رجل واحد**" تھے۔ مدرسہ میں حضرت الاستاذ "بڑے مولانا" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ لیکن حضرتؒ کی کسی ادا سے مترشح نہیں ہوتا تھا کہ وہ "بڑے مولانا" ہیں۔ اس ناکارہ کا تاثر جب بھی تھا اور اب بھی ہے کہ حضرتؒ کو شفقت و عنایت کا سب سے زیادہ تعلق اس ناکارہ سے تھا' ہمارے دوسرے رفقاء میں سے ہر ایک کا تاثر بھی یقیناً یہی ہوگا۔ یاد نہیں پڑتا کہ اس پورے ہفت سالہ دور میں کبھی کشاکشی کی نوبت آئی ہو۔ اساتذہ کے درمیان باہمی الفت و محبت کی یہ فضا حضرت الاستاذ کے انفاس طیبہ اور توجہات عالیہ کا کرشمہ تھی۔ اور اس کی شہ کلید حضرتؒ کی تواضع کے ساتھ پدرانہ شفقت تھی۔ اس ماحول کو اب آنکھیں ترسا کریں گی' مگر توقع نہیں کہ یہ رنگ پھر دیکھنا نصیب ہو۔

دار بھاکنا وکنا نحبھا
اذا الناس ناس والزمان زمان

ورع و احتیاط حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کا ایسا امتیازی وصف تھا جو دور جدید میں کمیاب بلکہ نایاب ہے (الا ماشاء اللہ) یہ ناکارہ ایسی چھوٹی چھوٹی جزئیات میں بھی حضرتؒ کے شدید ورع و احتیاط کا مشاہدہ کرتا تھا جن کی طرف عموماً التفات ہی نہیں ہوتا' یہاں بے ساختہ اس سلسلہ کی چند باتیں یاد آگئیں۔

۱.......... انہیں اپنے اکابر سے والہانہ عشق تھا۔ ان کے حافظہ میں اکابر کے بے شمار حالات و واقعات محفوظ تھے۔ اور ان کی ہر محفل ان واقعات کے تذکرہ سے معمور ہوتی تھی۔ لیکن جب درخواست کی جاتی کہ ان کو قلمبند کرا دیجئے تو یہ کہہ کر عذر کر دیتے کہ "مبادا حافظہ خطا کر جائے اور کوئی بات خلاف واقعہ نقل ہو جائے۔ اس لئے قلمبند کرنے کی اجازت نہیں"۔

۲............ ایک بار حافظ ابو بکر ابن العربی کے رسالہ ''العواصم من القواصم'' کا نیا نسخہ چھپ کر آیا تو راقم الحروف نے حضرت الاستاذ کی محفل میں پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ شروع کے ''عواصم'' کو تو بہت پسند فرمایا لیکن جب بات ''حسینؓ ویزید'' تک پہنچی تو مسکراتے ہوئے فرمایا: ''بس بس اتنا ہی کافی ہے۔ آگے مت پڑھو''۔ یہ کہہ کر کتاب بند کرادی۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات تھی جس کی طرف ممکن ہے کسی کو التفات بھی نہ ہوا ہو لیکن غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس واقعہ میں حضرت الاستاذ کی شدت ورع کار فرما تھی۔ حافظ ابو بکر ابن العربی جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ نے تصریح کی ہے۔ ناصبیت کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اس لئے حضرتؒ کو نہ ایسی تحریر کا سننا گوارا ہوا جو اکابر اہل سنت کے مسلک سے ہٹی ہوئی ہو اور نہ حافظ ابو بکر ابن العربی کے اس ''علمی شذوذ'' اور ''زلّت'' پر کوئی تبصرہ فرمایا۔ بلکہ ان کی شدت ورع واحتیاط کا فتویٰ یہ تھا کہ اس ''مزلۃ الاقدام'' میں گھسنے ہی سے پرہیز کیا جائے تاکہ اس پر بحث و تمحیص کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ ایسے ''علمی شذوذ'' پر باقاعدہ اکھاڑا جمتا ہے۔ کوئی مصنف کی طرف داری کرتے ہوئے جمہور اہل سنت کے مسلک پر نکتہ چینی کرتا ہے اور کوئی مصنف کے خلاف زبان طعن دراز کرتا ہے۔ لیکن حضرت الاستاذؒ ایسے ''اقوال شاذہ'' کو لائق التفات ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کے زیر بحث لانے کو خلاف احتیاط تصور فرماتے تھے۔ کیونکہ اس قسم کی بحثوں سے افراط و تفریط کی راہیں کھلتی ہیں اور اعتدال پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی بحثوں کا نتیجہ امت کے ذہنی انتشار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

۳............ حضرت الاستاذؒ کے ورع واحتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی عامی کی طرف سے کوئی اشکال یا شبہ پیش کیا جاتا تو استاذ الاساتذہ ہونے کے باوجود اس کے حل کی طرف پیش قدمی نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ اگر وہاں کوئی ان کا شاگرد موجود ہوتا تو اس کی طرف محول فرمادیتے تھے۔ بعد میں اگر ضرورت محسوس ہوتی تو کوئی مختصر سی بات خود بھی ارشاد فرمادیتے۔ ایک دفعہ راقم الحروف کی موجودگی میں ایک صاحب نے آیۃ کریمہ: ''وتراھم ینظرون الیک وھم لایبصرون'' کے بارے میں استفسار کیا کہ اس میں ''نظر'' کا اثبات کیا گیا ہے اور ''ابصار'' کی نفی کی گئی ہے۔ حالانکہ نظر اور ابصار کا ایک ہی مفہوم ہے۔ حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ نے حسب عادت خود جواب دینے کے بجائے اس ناکارہ

کی طرف اشارہ فرمادیا۔ راقم الحروف نے تعمیل ارشاد میں عرض کیا کہ آیت کریمہ میں "وتراھم ینظرون الیک" فرمایا ہے۔ یعنی بادی النظر میں تمہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو نظر نہیں آتا' کیونکہ ان کی آنکھوں میں بینائی نہیں پس نظر کا اثبات مخاطب کے احساس کے لحاظ سے ہے۔ اور ابصار کی نفی حقیقت الامر کے لحاظ سے ہے' لہٰذا نفی واثبات میں کوئی تعارض نہیں۔ حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ نے سن کر بس اتنا فرمایا کہ۔ تفسیر کی کوئی کتاب دیکھ لینی چاہئے(۱) یہ ناکارہ حضرتؒ کے اس ارشاد سے ایسا منفعل ہوا کہ آج تک یہ بات نہیں بھولی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی باکمال شخصیت' جن کی ساری عمر ترجمہ و تفسیر کے درس وتدریس اور تفاسیر کے مطالعہ میں گزری وہ ایک معمولی اشکال کے جواب میں بھی کس قدر ورع واحتیاط کا مظاہرہ فرمارہے ہیں کہ مبادا کوئی ایسی بات سرزد ہوجائے جو تفسیر بالرائے کے زمرے میں آتی ہو۔ قرآن کریم کی تشریح و تفسیر میں اس قدر شدید احتیاط کی مثال اپنے اساتذہ ومعاصرین میں کسی اور جگہ نہیں دیکھی۔

۴......... حضرتؒ کے ورع واحتیاط ہی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ صحیح بخاری شریف کے درس کے دوران کوئی علمی اشکال سامنے آجاتا تو محض اپنے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے گذرنے کی کوشش نہ کرتے بلکہ دوسرے مدرسین (جو حضرتؒ کے تلامذہ تھے) ان کے سامنے اس اشکال کو پیش کرکے ان کی رائے معلوم کرکے اطمینان فرماتے' جامعہ رشیدیہ کے اس دور کے صدر المدرسین علامہ غلام رسول صاحب اور اس ناکارہ کو متعدد بار اس کا سابقہ پیش آیا' حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کا یہ طرز عمل جہاں ان کی

---

(۱) تفسیر نسفی میں ہے: وتراھم ینظرون الیک یشبھون الناظرین الیک لانھم صوروا اصنامھم بصورۃ من قلب حدقتہ الی الشئی ینظر الیہ وھم لایبصرون المرئی (تفسیر مدارک ص ۲۹ ج ۲)

ٹھیک یہی عبارت تفسیر کشاف کی ہے۔ اور قریب قریب یہی مضمون دوسری تفاسیر کا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی " "فوائد القرآن" میں فرماتے ہیں: "یعنی بظاہر آنکھیں بنی ہوئی ہیں پر ان میں بینائی کہاں؟" (ص ۲۲۷)

شدّت احتیاط اور غایت تواضع کا مظہر تھا وہاں ہم ایسے نو آموز طلبہ کے لئے درس موعظت بھی تھا۔ ورنہ عام طور سے مدرسین حضرات' اپنے شاگردوں سے تو کجا؟ اپنے بڑوں سے بھی کچھ دریافت کرنا موجب عار اور کسر شان سمجھتے ہیں' اور کسی مقام کو نہ سمجھنے کے باوجود محض سخن سازی کے ذریعہ طلبہ کو چلتا کردیتے ہیں۔

مالیات کے معاملے میں حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کے ورع واحتیاط کی کوئی رئیس نہیں تھی۔ مدرسہ کی جانب سے ان کا جو مشاہرہ مقرر تھا اس میں کمی کا مطالبہ تو ان کی طرف سے بارہا ہوتا رہا۔ لیکن تنخواہ میں ترقی واضافہ کا خیال بھی ان کے دل میں کبھی نہیں آیا۔ ان کا مشاہرہ قوت لایموت سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گزرا ہو جس میں انہوں نے اپنا پورا مشاہرہ وصول کیا ہو۔ مرض اور سفر کی وجہ سے ان کے جو ناغے ہوجاتے تھے ان کی تنخواہ ہمیشہ کٹوادیا کرتے تھے' اوقات تعلیم میں واردین وصادرین کی آمد ورفت کی وجہ سے اسباق کا جو حرج ہوجاتا اس کا بھی باقاعدہ حساب رکھتے تھے اور مہینے کے ختم پر اس کا حساب لگا کر اس کی تنخواہ کٹوادیا کرتے تھے۔ آخر میں جب اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا تو یہ کہہ کر تنخواہ بند کردی کہ اب میں اکیلا ہوں' تنخواہ لے کر کیا کروں گا' اور کون حساب رکھتا پھرے گا' بس یہ سلسلہ ختم کردو۔ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ تنخواہ نہیں لیتے تھے بلکہ مدرسہ کی رہائش اور بجلی وغیرہ کے کرائے کی مد میں ایک معتدبہ رقم ہر مہینے جمع کراتے رہے۔

ع "خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را"

دینی مدارس کے امتحانات اور جلسوں میں شرکت کا معمول کثرت سے تھا۔ لیکن سفر خرچ کے طور پر واجبی کرایہ وغیرہ سے زیادہ وصول کرنے کے روادار نہ تھے۔ اگر اہل مدارس کچھ زیادہ پیش کرتے تو کبھی تو ٹوک دیتے کہ تمہیں مدرسہ کے مال میں ضرورت سے زیادہ تصرف کا کیا حق ہے؟ اور کہیں اس طرح ٹوکنا خلاف مصلحت ہوتا تو مدرسہ کے چندہ کی مد میں رقم واپس فرمادیتے' اسی طرح مدرسہ کے خرچ سے پر تکلف کھانوں کی تیاری پر ناگواری کا اظہار فرماتے' اور بعض بے تکلف دوستوں سے تو یہاں تک فرمادیتے کہ آئندہ تمہارے مدرسہ کے امتحان کے لئے نہیں آؤں گا کیونکہ تم لوگ کھانے پر مدرسہ کا ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہو۔ جن احباب کو حضرتؒ کا مزاج معلوم ہوتا وہ

کھانے کا اہتمام اپنے ذاتی مصارف سے کرتے تھے۔ مدرسہ کی طرف سے کھانا تیار نہیں کراتے تھے۔ حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کے اس زہد و تقشف اور ورع واحتیاط ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کے گھر کا معیار زندگی بہت سادہ تھا۔ آج ہمارے گھروں میں سجی ہوئی انواع واقسام کی اشیاء فرش وفروش اور ظروف وغیرہ پر نظر ڈالئے تو نگاہیں خیرہ رہ جاتی ہیں۔ اور گھر پر نگار خانے یا عجائب خانے کا گمان گزرتا ہے۔ مرزا صائب کے بقول:

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش
آنچہ مادر کارداریم، اکثرے درکار نیست

لیکن حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کے گھر پر نظر ڈالنے سے قرون اولیٰ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا تھا۔ بس ضرورت کی چند چیزیں اور وہ بھی بہت کم قیمت، آرائش وزیبائش کی وہاں گذر ہی کہاں تھی۔

نہ گردد اہل باطن در پئے آرائش ظاہر
بہ خط وخال ورنگ وبو چہ حاجت روئے زیبارا

انکا سفری سامان بھی مرقع زہد ہوتا تھا، ایک معمولی تھیلا جس میں لوٹا، مصلّٰی اور طہارت ووضو کا ضروری سامان ہوتا۔ اور چھوٹا سا شکستہ ودریدہ بیگ، جس میں ایک آدھ جوڑا کپڑوں کا اور کچھ ذخیرہ ادویات (جو ایک عرصہ سے گویا لازمۂ حیات بن گیا تھا) بس یہ تھی ان کی کل کائنات۔ گویا حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کی زندگی، حدیث نبوی ﷺ: "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

بے نفسی وتواضع میں ان پر اپنے شیخ حضرت قطب العالم شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کا رنگ غالب تھا۔ اپنے آپ کو ایسا مٹایا تھا کہ "خبرے نیست کہ ہست" کا مضمون صادق آتا تھا۔ وہ رائپوری سلسلہ میں بھی مجاز تھے۔ اور حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ سے بھی انہیں خلافت واجازت تھی، لیکن ان کے یہاں مشیخت نام کی کوئی چیز سرے سے نہیں تھی بلکہ ان کا مذاق یہ تھا کہ:

احمد تو عاشقی بہ مشیخت تراچہ کار
دیوانہ باش، سلسلہ شدشد نہ شد نہ شد

ہم ایسے عامی انہیں بس ایک "مولوی" سمجھا کئے۔ تعلق مع اللہ کی جو دولت سینہ بے کینہ میں چھپائے بیٹھے تھے کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ تمام ظاہری وباطنی کمالات کے باوجود انہیں اپنی بے کمالی کا ایسا استحضار تھا کہ اپنے آپ کو ہیچ درہیچ سمجھتے تھے' بے کمالی کا یہی استحضار ان کا حقیقی کمال تھا' "تحفہ سعدیہ"میں حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب لدھیانویؒ کے حالات میں لکھا ہے:

> "حضرت رائے پوریؒ سے آپ کا رابطۂ جانی اس قدر مستحکم تھا کہ اگر حضرت رائے پوریؒ خانقاہ شریف سے قریب کسی جگہ قیام فرماتے تو آپ ان سے ملنے کے لئے ضرور تشریف لے جایا کرتے۔ اس قسم کی ایک ملاقات کے دوران حضرت رائے پوریؒ نے اپنے خدام کو کمرہ سے باہر چلے جانے کا اشارہ فرمایا۔ چنانچہ دونوں حضرات کے درمیان خلوت میں فقرودرویشی کے بعض اسرار ورموز پر گفتگو ہوتی رہی۔ جن میں ایک یہ بات تھی کہ حضرت رائے پوریؒ نے آپ سے دریافت فرمایا' "مولانا! کمال کسے کہتے ہیں؟ ہمیں تو اس راہ میں تگ ودو کرتے ہوئے اتنا عرصہ گذر چکا ہے' مگر کمال کا کہیں پتہ نہیں چلتا"۔ آپ نے ارشاد فرمایا' "حضرت! بس یہی کمال ہے۔۔

> "ولی عارف زہر اندیشہ خالی است
> کمال عشق اندر بے کمالی است"

اور اس کے حاشیہ میں لکھا ہے: حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کا قول ہے: "دریں طریق کمال در بے کمالی است وحاصل در بے حاصلی"۔

(تحفہ سعدیہ ص ۳۱۴)

حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کو واقعۃً "کمال در بے کمالی" کا مرتبہ عطا کیا گیا تھا۔

حضرت الاستاذؒ کا ایک امتیازی وصف ان کا ذہنی اعتدال اور ادب مع الاکابر تھا جو درحقیقت ان کے ورع واحتیاط اور فنائیت کا ثمرہ تھا۔ سیاسی ہنگامے بہت سے لوگوں کے لئے ذہنی تموج وانتشار کا موجب ہوتے ہیں۔ جس فرد یا گروہ کے سیاسی نظریات سے اتفاق نہ ہو اس کی عزت وآبرو کو شیر مادر سمجھ لیا جاتا ہے۔ نجی محفلوں میں اس کی غیبت

دہ گوئی تو ایک معمولی بات ہے۔ اخبارات و رسائل تک میں اس کے خلاف غیر ذمہ دارانہ تبصروں اور الزام تراشیوں سے بھی کوئی باک محسوس نہیں کیا جاتا۔ لیکن حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کی پوری زندگی میں کبھی کسی نے کسی شخصیت کے بارے میں محض سیاسی اختلاف کی بناپر آپ سے کوئی تنقیدی فقرہ نہیں سنا ہوگا' ان کا اپنا سیاسی رجحان خواہ کسی طرف بھی ہو' لیکن ان کا قلب سلیم تمام اکابر اور تمام اہل علم کے لئے یکساں کشادہ تھا' وہ ہر ایک کی خوبیوں کے یکساں معترف اور سب کی مدح و ستائش میں رطب اللسان تھے۔ جن دنوں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہما کے سیاسی اختلافات کا گھر گھر چرچا تھا' بہت سے لوگ ایک طرف کے ہو کر نعوذ باللہ دوسری طرف کی توہین و تنقیص کے وبال میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو دوسری طرف کی تنقیص تو نہیں کرتے تھے مگر ان سے خوش نہیں تھے اور ان کی عظمت ان لوگوں کے دلوں سے نکل گئی تھی۔

سیاست کے اس طوفان میں بہت سے لوگ سفینۂ ادب کو غرق کر بیٹھے' اور اعتدال کا رستہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ہمارے شیخ حضرت اقدس مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہٗ نے اسی زمانہ میں ''الاعتدال فی مراتب الرجال'' لکھ کر دونوں طرف کے اکابر کے ادب و احترام کی تلقین فرمائی۔ اور حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ اپنی مجالس میں دونوں طرف کے اکابر کی عظمت و رفعت بیان فرماتے۔ حضرت الاستاذؒ انہی مشائخ کے مسلک اعتدال پر قائم اور ان کے نقش قدم پر گامزن تھے۔ انہیں حکیم الامت تھانوی اور حضرت شیخ الاسلام مدنی (قدس سرہما) دونوں سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ دونوں کے اوصاف و کمالات بڑے ہی والہانہ انداز میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان کا یہی طرز عمل بعد کے اکابر کے بارے میں رہا۔ ان کے دل میں سب کا احترام تھا اور سیاسی نفرت کے کانٹوں سے ان کا ذہن بالکل پاک تھا۔ ؎

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن
کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

حضرت الاستاذ کو حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے قافلۂ حریت اور ان کی جماعت عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت سے خاص عقیدت تھی۔ شاہ جیؒ

کے بہت سے واقعات مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے' فرماتے تھے کہ قادیانیوں کے خلاف مجلس احرار اسلام کے ایک جلسہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ نے قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

یاایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللّٰہ بقوم یحبھم ویحبونہٗ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ واسع علیم۔(المائدۃ)

"اے ایمان والو جو کوئی تم میں سے پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب لادیگا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں' نرم دل ہیں مسلمانوں پر' زبردست ہیں کافروں پر' لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے۔ یہ فضل ہے اللہ کا دیگا جس کو چاہے اور اللہ کشائش والا ہے خبردار"۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

حضرت عثمانیؒ نے اس آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس آیت میں مرتدین کے مقابلہ میں جس جماعت کو کھڑا کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ ہمارے اس دور میں اس کا مصداق سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کی جماعت ہے۔"

حضرت الاستاذ تاصحت مجلس تحفظ ختم نبوت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے' قادیانیوں کے خلاف تحریکات میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اور ان کا مدرسہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال ان تحریکات کا اہم ترین مرکز رہا۔ جس کی وجہ سے مدرسہ اور اہل مدرسہ کو امتحان وابتلاء کے بہت سے مراحل سے گذرنا پڑا۔ **فجزاھم اللّٰہ عن الاسلام والمسلمین۔**

مجدد تبلیغ حضرت اقدس مولانا محمد الیاس کاندھلوی ثم دہلوی قدس سرہٗ کی دینی دعوت سے بھی خصوصی شغف تھا۔ ان کے صاحبزادہ گرامی قدر حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی(قدس سرہٗ) کے بارے میں بہت ہی بلند کلمات ارشاد فرماتے تھے ایک موقعہ

پر فرمایا کہ توکل میں ہم سب کی گاڑی اٹک جاتی ہے۔ مگر ان کی گاڑی نہیں اٹکتی۔

صحت وجوانی کے زمانے میں جماعتوں میں نکلنے کا معمول بھی رہا۔ اس سلسلہ میں بعض دل چسپ قصے بھی سنایا کرتے تھے۔ اب ایک طویل عرصے سے یہ سلسلہ تو متروک تھا تاہم مرکز دعوت و تبلیغ رائے ونڈ اور اکابر تبلیغ سے گہرا ربط و تعلق تھا۔ رائے ونڈ کے عربی مدرسہ کے امتحانات میں بڑے التزام سے شریک ہوتے تھے۔

جب سے جامعہ رشیدیہ ساہی وال میں دورۂ حدیث کا آغاز ہوا تب سے رائے ونڈ کے منتہی طلبہ درس حدیث کے لئے حضرت الاستاذؒ ہی کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے۔ مرض الموت میں طویل طویل وقفوں کے لئے رائے ونڈ میں ہی قیام رہا۔

حضرت الاستاذؒ قرآن کریم کے پختہ حافظ اور جید قاری تھے۔ بہت سے مکاتب قرآنیہ کے مستقل ممتحن رہے' قرأت میں معروف لہجوں کے بجائے ان کا اپنا ایک منفرد لہجہ تھا (جسے میں رائے پوری لہجہ کہا کرتا ہوں) قرآن کریم کی تلاوت ایسے ترنم اور درد سے فرماتے تھے کہ سن کر واقعۃً رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ سالہاسال تک اپنے شیخ حضرت اقدس رائے پوریؒ کے یہاں تراویح سناتے رہے۔ لیکن آخری سالوں میں غلبۂ ریاح کی وجہ سے امامت نہیں فرماتے تھے۔ ان کی تلاوت قرآن کا ایک لطیفہ جو غالباً خود انہی سے سنا تھا' یاد آیا ایک زمانے میں حضرت اقدس سیدی و مرشدی مولانا خیر محمد جالندھری نور اللہ مرقدہٗ غیر مقلدوں کے مقابلے میں مناظرے کیا کرتے تھے اور حضرت الاستاذ معین کی حیثیت سے حضرتؒ کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ کسی مناظرے کے نتیجے میں عدالت میں مقدمہ ہوگیا۔ عدالت کا جج ایک سکھ تھا۔ عدالت میں حضرت الاستاذ کا بھی بیان ہوا۔ بیان کے دوران آپ نے اپنے مخصوص انداز میں قرآن کریم کی آیت تلاوت فرمائی۔ جج آپ کی تلاوت پر عش عش کرنے لگا اور بولا' مولوی صاحب! مقدمہ تو پھر ہوتا رہے گا۔ آج تو آپ مجھے قرآن کریم سنایئے۔

آپ کی تقریر نہایت عالمانہ و مصلحانہ ہوتی تھی' آپ تقریر میں بھی آیات و احادیث و اشعار اپنے مخصوص انداز میں ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے بہت سے دل گداز اور بہت سی آنکھیں اشک بار ہوجاتی تھیں۔

آخر میں حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مکتوب' جو قطب العالم حضرت شیخ

الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی قدس سرہٗ کی خدمت میں اپنے والد ماجد حضرت اقدس مفتی فقیر اللہ صاحب رحمہ اللہ کے حکم سے تحریر فرمایا تھا۔ درج کرتا ہوں۔ یہ مکتوب جناب صوفی محمد اقبال مدنی زید مجدہم نے اپنے رسالہ محبوب العارفین میں شائع کردیا ہے۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ جامعہ رشیدیہ ساہی وال کے ابتدائی سالوں میں مدرسہ کی روئیداد میں مودودی صاحب اور امین احسن اصلاحی کا نام مدرسہ میں تشریف لانے والے علماء کی فہرست میں چھپ گیا تھا' اس پر حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی طرف سے عتاب نامہ آیا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ حضرت اقدس مفتی صاحب رحمہ اللہ کو اس کا علم ہوا تو بے چین ہو گئے' اور اپنے فرزند اکبر (حضرت الاستاذ مولانا محمد عبداللہ صاحب رائے پوری ؒ) کو حکم فرمایا کہ فوراً شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں معذرت نامہ لکھیں' ان کے حکم پر حضرت الاستاذؒ نے یہ عریضہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت عالیہ میں تحریر فرمایا:

"بخدمت سیدی و مولائی و محترمی! دامت برکاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا والا نامہ بنام برادر عزیز مولوی حبیب اللہ ناظم مدرسہ پڑھا' اور حضرت والد صاحب کو بھی سنایا' حضرت والد صاحب نے سنتے ہی فرمایا کہ حضرت شیخ کو جلدی جواب لکھو۔

امتثالاً للامر یہ عریضہ لکھ رہا ہوں' مدرسہ کی روداد مرتب کرتے وقت برادر عزیز نے ہم دونوں سے مشورہ نہیں کیا' صفحہ چھیالیس پر مودودی اور امین احسن اصلاحی کا نام شائع کرنے میں ہم نے سخت غلطی کی' آپ حضرات کو یقیناً سخت صدمہ ہوا ہوگا' ہم معافی کے طلب گار ہیں۔

ہمارا رشتہ تو آپ حضرات سے ہی ہے۔ ہمارا اسلام' ہمارا مسلک' ہمارا اعتقاد تو واللہ العظیم بالکل تقلیدی ہے' آپ حضرات کے مسلک سے الگ ہو کر ہمارا کہاں ٹھکانہ ہوگا' ہم امید کرتے ہیں

کہ آئندہ بھی ہماری کوتاہیوں پر ہم کو متنبہ فرماتے رہیں گے"۔
(محبوب العارفین ص ۶۳)

حضرت الاستاذؒ کا یہ فقرہ کہ "ہمارا اسلام' ہمارا مسلک' ہمارا اعتقاد تو واللہ العظیم بالکل تقلیدی ہے"۔ اس کی شرح ایک مبسوط مقالے کا موضوع ہے۔ مختصر یہ کہ علم کی آفات میں سے ایک مہلک آفت اعجاب بالرائے اور علمی پندار ہے۔ اور اس دور میں ناپختہ علم کے ساتھ خودرائی وخود روی کا جو مرض عام ہوتا جارہا ہے وہ اسی اعجاب بالرائے کی پیداوار ہے۔ جس کے نشہ میں مست ہوکر اپنے اکابر اور سلف صالحین پر تنقید کی جاتی ہے اور اپنے علم وفہم اور وسعت معلومات کے مقابلہ میں اکابر کے علم وفہم کو ہیچ سمجھا جاتا ہے' اور جو مسائل اکابر کے زمانے میں طے کردیئے گئے تھے ان پر ازسرنو طبع آزمائی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے' اسی اعجاب بالرائے کے نتیجے میں امت نئے نئے فتنوں اور نئے نئے نظریات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے' حضرت الاستاذؒ اکابر کے مقابلے میں "جدید تحقیقات" کو خطرۂ ایمان تصور فرماتے تھے' اور تمام امور میں سلف صالحین اور اکابر امت کی اتباع وتقلید کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ حضرت الاستاذؒ کو رحمت ورضوان کے درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ' وابدلہ دارًا خیرًا من دارہ' واھلاً خیرًا من اھلہ۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

(بینات ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق جنوری ۱۹۸۶ء) ●

جناب ڈاکٹر عبد الرزاق کے والد ماجد

سکندر خان صاحب رح

۱۰ر ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۷ر اگست ۱۹۸۵ پیر اور منگل کی درمیانی شب کو رات کے دس بجے رفیق محترم جناب مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق صاحب زید مجدہم کے والد گرامی جناب سکندر خان ولد خان زمان صاحب رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اپنے حلقہ میں بڑے باوجاہت تھے، خاندان اور گاؤں کے تنازعات میں ان سے رجوع کیا جاتا تھا، جنہیں وہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا کرتے تھے، بچپن ہی سے علماء وصلحاء سے گہرا تعلق تھا جس کا اثر ان کی زندگی پر نمایاں تھا۔ نماز باجماعت کی پابندی، تلاوت قرآن مجید، ذکر الٰہی، صلہ رحمی، اصلاح ذات البین، رافت وشفقت اور ضعفاء کی خبرگیری، ان کے خصوصی اوصاف تھے، مسجد کی خدمت وتعمیر سے بہت شغف تھا، یہ مرحوم کے دینی جذبہ کا مظہر ہے کہ اپنے چھوٹے صاحبزادے ہمارے رفیق محترم جناب مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق صاحب کو اسکول سے اٹھا کر دینی تعلیم کے لئے وقف کردیا۔ جو ان شاء اللہ ان کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔

مرحوم بغرض علاج جناب ڈاکٹر صاحب کے پاس کراچی آئے ہوئے تھے، یہیں ان کا انتقال ہوا۔ اور بقر عید کی شب میں کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے روح پرواز کرگئی۔ میت بذریعہ ہوائی جہاز آبائی گاؤں کوکل ضلع ایبٹ آباد لے جائی گئی، حق تعالیٰ شانہ، مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور ہمارے ڈاکٹر صاحب اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(بینات ربیع الاول ۱۴۰۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء)

جناب قیصر صاحب کی والدہ محترمہ

۲۵ر محرم الحرام ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۵ء بروز جمعہ ہمارے مخدوم و معظم جناب نواب عشرت علی خان قیصر صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ کا بیعت وارادت کا تعلق حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ' سے تھا۔ تلاوت ونوافل' اوراد واشغال' معمولات کی پابندی' اتباع سنت' دوام ذکر' جود وسخاوت اور داد ودہش کی بناء پر "رابعۂ دوراں" کہلانے کی مستحق تھیں۔ اس ناکارہ کی جناب قیصر صاحب سے ملاقات ہوتی تو والدہ ماجدہ کی صحت کے بارے میں استفسار کرتا اور ان کی خدمت میں سلام ودعا کی درخواست کے لئے ضرور عرض کرتا۔ افسوس ہے کہ مرحومہ کے انتقال سے ان دعوات صالحہ کا سلسلہ منقطع ہوگیا' جناب قیصر صاحب زید مجدہم نے اس ناکارہ کی درخواست پر مرحومہ کے کچھ حالات قلمبند فرمائے ہیں جو موصوف ہی کے الفاظ میں ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ مرحومہ کو رحمت ورضوان کے درجات عالیہ نصیب فرمائیں' اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

۲۵ر محرم ۱۴۰۶ھ بروز جمعۃ وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تقریباً ۹۳ سال اس دار فانی میں گذارے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد وقتاً فوقتاً پاکستان والد مرحوم کے ہمراہ آتی رہیں لیکن گزشتہ گیارہ سال سے مستقل قیام کراچی میں تھا۔ علالت کا ایک طویل عرصہ گذرا۔ مختلف مہلک اور تکلیف دہ امراض کے شدائد میں مبتلا رہیں' بایں ہمہ صبر وشکر وتحمل کے ساتھ ہر تکلیف برداشت کی۔ جب بھی قلب کا انجائنا کا دورہ ہوتا تھا تو زبان سے ذکر اللہ جاری ہوجاتا تھا۔ وفات سے آٹھ سال قبل سیدھی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے ہڈی کو میخ

سے جوڑنے کے لئے آپریشن تجویز کیا لیکن باوجود شرعی رخصت کے عزیمت پر عمل کیا بوجہ قوت ایمانی حجاب مانع تھا' فرماتی تھیں کہ بقیہ زندگی ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے گذارنا منظور ہے لیکن ڈاکٹر کے سامنے جسم کا کھلنا کسی طرح منظور نہیں ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا صوم وصلاۃ اور تلاوت قرآن کی پابند تھیں' تہجد کی نماز پر مداومت مثل فرض نماز کے تھی۔ آخر شب کی نفلیں کبھی ترک نہیں ہوئیں' حتیٰ کہ جس رات کو سر میں شدید ضرب آئی تہجد کی نیت سے اٹھی تھیں وضو کیا لوٹا ہاتھ میں تھا کہ گر پڑیں جب بستر پر لٹایا تو یہی دھن تھی کہ دو رکعت نفل پڑھوں گی لیکن صدمہ سے دماغ کی رگ پھٹ چکی تھی۔ آخری نماز عشاء کی پڑھی تھی اور صبح صادق سے قبل ہی بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ڈھائی دن غشی کی حالت رہی البتہ دوران بے ہوشی ایک دن جب ان کے سرہانے کلمہ طیبہ اور کلمۂ شہادت کا ورد ہو رہا تھا تو انہوں نے ایک دفعہ شہادت کی انگلی اٹھائی یہ آخری عمل دیکھنے میں آیا۔

حکیم الامت مجدد الملت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے بیعت تھیں۔ اور تقریباً ۱۵ سال اصلاحی تعلق رہا۔ حضرت والا رحمتہ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات کثرت سے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ کے وصال سے ایک سال قبل خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ حضرت والا رحمتہ اللہ علیہ کے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ پھولپوری کے بارہ میں ان کی وفات سے تین ماہ قبل علی گڑھ میں خواب دیکھا تھا کہ ماہتاب غروب ہو رہا ہے۔ مولانا حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم نے اپنی مرتب کردہ کتاب "معرفت الٰہیہ" میں ان خوابوں کو قلمبند کیا ہے۔ مرحومہ کا کشف آخری عمر میں بڑھ گیا تھا بشارات منامیہ بھی بکثرت دیکھتی تھیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف بارہا نصیب ہوا۔ حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی مجالس میں فرمایا کرتے تھے کہ کشف وکرامت والی بی بی ہیں۔

ہندوستان کے دوران قیام اپنی جائے رہائش پر بچیوں کو قرآن شریف اور بہشتی زیور مدت تک پڑھاتی رہیں' قرآن پاک کی تلاوت سے بے حد شغف تھا' ماہ رمضان المبارک میں تین روز میں ایک قرآن شریف ختم کرنے کا معمول تھا۔ باوجود اس قدر بیماری'

معذوری اور ضعیفی کے ایک منزل روزانہ قرآن شریف کی تلاوت کرتی تھیں۔ چھ سات روز میں ایک قرآن پاک ختم کر لیتی تھیں اور یہ معمول انتقال سے چند ہفتے قبل تک رہا، بعض دفعہ پوری پوری رات قرآن شریف کی تلاوت میں بسر ہو جاتی تھی۔ **اٰناء الیل والنہار**۔ قرآن پاک کی معیت نصیب تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کلام الٰہی کے انوار وتجلیات اپنے گرد وپیش مشاہدہ کرتی تھیں، فرمایا کرتی تھیں کہ جب بستر پر لیٹتی ہوں تو اپنے جسم کے چاروں طرف قرآن پاک کی آیات نہایت نفیس ومنور نقش ونگار کے ساتھ متشکل دیکھتی ہوں، اس قدر کثرت سے نمودار ہوتی ہیں کہ مجھے بوجۂ ادب اپنے پاؤں بستر پر سکیڑنے پڑتے ہیں۔ کمرہ کے در ودیوار اور چھت آیات کریمہ سے مزین ومنور ہو جاتے ہیں۔ **ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء**۔ آنکھ کی بینائی بوجہ موتیا بند کے نہایت کمزور ہو گئی تھی لیکن قرآن پاک کی تلاوت بغیر چشمہ کے کرتی تھیں۔

الحمد للہ تین بار سعادت حج اور زیارت روضۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مشرف ہوئیں۔ رمضان المبارک کا عمرہ بھی نصیب ہوا۔ ماہ صیام کی آمد کا بڑی بے تابی وشوق سے انتظار کرتی تھیں، باوجود نقاہت وعلالت کے گذشتہ ماہ رمضان المبارک میں سوائے پانچ چھ ایام کے تمام روزے رکھے۔ یہ ان کی کرامت تھی کہ عزیمت پر عمل کی توفیق ہو جاتی تھی۔ اپنی زکاۃ اور قربانی کا باقاعدہ حساب لکھواتی تھیں۔ صدقہ وخیرات ماشاء اللہ دل کھول کر کرتی تھیں۔ بارہا ان کی زبان سے یہ مصرعہ سنا۔

ع پھر نکلنا گور سے ہاتھوں کا ممکن ہی نہیں

فرمایا کرتی تھیں کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے اپنے ہاتھ سے دیجاؤں۔ ان کی ایک بیوہ خادمہ جو گذشتہ تیس سال سے ان کی خدمت کرتی رہیں۔ سفر ہو یا حضر ہر دم ان کو ساتھ رکھتی تھیں۔ جو خود کھاتیں اور پہنتیں وہی ان کو دیتی تھیں۔ وہ خادمہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر چند روز کے لئے قلب کے ہسپتال میں داخل ہوئی تھیں ان کی عیادت کو تین بار بوجہ معذوری پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر ہسپتال تشریف لے گئیں غرضیکہ ہر طرح سے مساویانہ اور حُسنِ سلوک کا برتاؤ رہتا تھا۔

اپنے پیر ومرشد حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد حضرت مولانا

مفتی محمد حسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم کرلیا۔ ان کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے رجوع کرتی تھیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی دوران علالت دارالعلوم کورنگی بغرض عیادت تشریف لے جاتی تھیں۔ حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ کی مرحومہ پر جو خصوصی عنایت تھی اور توجہ تھی اس کا علم حضرت والا قدس سرہٗ کے اجل خلفاء کو تھا' اس نسبت سے یہ حضرات بھی مرحومہ کی عزت واحترام فرماتے تھے۔ عارف باللہ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحئیؒ صاحب دامت برکاتہم کے حق میں بہت دعائیں کیا کرتی تھیں' ان میں سے ایک دعا یہ بھی تھی کہ اے اللہ ان سے تیری مخلوق کو فائدہ پہنچ رہا ہے تو ان کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر زندہ وسلامت رکھ' انتقال سے دو تین روز قبل کئی بار حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ العالی کو یاد کیا۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحب دامت برکاتہم جب بھی کراچی تشریف لاتے اور مرحومہ کی عیادت کو جاتے تو حضرت مولانا دامت برکاتہم سے یہ دعا ضرور کراتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ حلاوت ایمان اور حسن خاتمہ نصیب کرے۔ سکرات موت آسان ہوجائے۔ چنانچہ الحمد للہ آخر بہت اچھا ہوا' مرحومہ کی یہ تمنا عمر بھر رہی کہ جمعہ کے روز دنیا سے سفر آخرت کریں' اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمنا پوری فرمائی' جمعہ کی اذان کے وقت داعئ اجل کو لبیک کہا' دو گھنٹے کے اندر مرحومہ کے غسل وتجہیز وتکفین سے فراغت ہوئی' اور غروب آفتاب سے قبل تدفین انجام پائی۔ حدیث شریف میں جمعہ کی موت کی جو بشارت وارد ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اس کا مورد بنائے۔ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور بلا پرسش وحساب مغفرت فرمائے۔ آمین

(بینات ربیع الاول ۱۴۰۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء)

میرے والد ماجدؒ

۲۵؍ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۷۵ء شب جمعہ کو میرے آقا و مربی' میرے والد ماجد حضرت الحاج چودھری اللہ بخش عالم جاودانی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ' واعف عنہ' واکرم نزلہ' ووسع مدخلہ' وابدلہ داراً خیراً من دارہ' واھلاً خیراً من اھلہ' اللھم لاتحرمنا اجرہ' ولاتفتنا بعدہ۔

حضرت والد مرحوم کو حق تعالیٰ شانہ نے بہت سی سعادتوں سے نوازا تھا۔ عقل ودانش' فہم و فراست' صلاح و تقویٰ' اخلاص وایثار' اخلاق و مروت' مہمان نوازی' غریب پروری' کرم گستری اور خلق خدا کی نفع رسانی کی بناء پر بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے پیری تک وہ اپنے حلقہ تعارف میں محبوب و معظم رہے۔

حضرت والد مرحوم نے اپنی حیاتِ مستعار کا آغاز نہایت بے کسی و کسمپرسی اور ناتوانی کی حالت میں کیا تھا' بساط حیات پر ابھی قدم نہ رکھا تھا کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا اور عین شیر خوارگی کی حالت میں آغوشِ مادر چھن گئی' عالمِ اسباب میں اس یتیم کا سوائے دہ سالہ ہمشیرہ کے کوئی کفیل نہ تھا۔ نہ کوئی تایا' نہ چچا' نہ کوئی بھائی' نہ ماموں' نہ کوئی خویش و قریب' لیکن مالک کی قدرت کے قربان جایئے کہ یہی نادار اور بے کس یتیم بچہ ابھی اٹھارہ بیس کے سن کو نہیں پہنچا تھا کہ علاقے بھر کی پنچایتی عدالتوں میں اسے "سرپنچ" تسلیم کرلیا گیا اور پیچیدہ سے پیچیدہ تنازعات میں' اس کے فیصلے قبول کیے جانے لگے۔ اس کا فیصلہ فہم وتدبر اور عقل ودانش کا آئینہ دار ہوتا تھا' جس سے مقدمہ کے دونوں فریق مطمئن ہوجاتے' پورے علاقے میں یہ فیصلے ایسی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے کہ ان کے بعد لوگوں کو کسی معاملہ میں تھانے اور عدالت سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

حضرت والد مرحوم کی تعلیم معمولی نوشت و خواند تک محدود تھی' قرآن مجید پرانی وضع پر میاں جی صاحب سے پڑھا تھا۔ لیکن فطری سلامتی' علو استعداد اور اہل اللہ کی جوتیوں میں بیٹھنے کی وجہ سے دینی معلومات میں وہ مجھ جیسے فارغ التحصیل علماء سے بدرجہا فائق تھے۔ کوئی عالم صحیح مسئلہ بیان کرے وہ اس پر اطمینانِ قلب اورانشراحِ صدر کا اظہار فرماتے اور اگر کبھی مسئلہ شرعی کے بیان میں غلطی ہوجاتی تو والد مرحوم کا قلبِ صافی اسے قبول کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتا۔ خود راقم الحروف کو اس نوعیت کے کئی واقعات پیش آئے۔ ایسے مواقع پر یہ ناکارہ اپنے احباب سے کہا کرتا تھا کہ بھئی ہمارا علم کتابی واکتسابی ہے۔ کتاب کو صحیح سمجھا تو مسئلہ صحیح بتادیا' غلط سمجھا تو بیان میں بھی غلطی ہوئی لیکن حضرت والد صاحب کا علم کتابی نہیں' بلکہ اہل اللہ کی صحبت سے ان کا آئینۂ قلب مجلی ہے' اس لئے کسی غلط مسئلے کو ان کا قلب قبول ہی نہیں کرتا۔

حضرت والد مرحوم کو بچپن سے ہی بدعات سے نفرت تھی' سنت نبویؐ سے عشق تھا۔ دس بارہ برس کی عمر سے تہجد وشب خیزی کی عادت تھی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی آخری نماز بھی تہجد ہوئی۔ ان کی فطرتِ سلیمہ نے اہل اللہ سے محبت والفت کی طرف راہنمائی کی۔ قطب العالم حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے بیعت وارادت کا تعلق تھا' اوراد ووظائف کے پابند تھے۔ سحری کے وقت ذکر بالجہر کرتے ہوئے قلب پر اِلَّا اللہ کی ضرب کچھ ایسے انداز سے لگاتے کہ سننے والوں کے دل ہل جاتے۔ اشراق' اوّابین' حزب اعظم اور تلاوتِ قرآن مجید تو گویا ان کی غذا بن گئے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ تقسیم سے پہلے میرے ایک دوست' جو مودودی صاحب سے متاثر تھے' وہ مجھے مودودی صاحب کی کتابیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے تھے۔ اور میں مودودی صاحب کی تحریر سے بہت ہی لطف اندوز ہوتا۔ پاکستان آکر حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مواعظ پڑھنا شروع کئے۔ اس وقت مجھے حضرت تھانویؒ کے مواعظ کے سوا کسی کی تحریر میں لذت نہیں آتی تھی اور اب تو قرآن مجید کے سوا کسی اور چیز میں لذت نہیں رہی۔ اس ناکارہ نے بارہا دیکھا کہ دور دراز کے سفر سے تھکے ماندے تشریف لائے ہیں' لیکن بجائے آرام واستراحت کے سیدھے مسجد میں پہنچے اور قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہوگئے۔ ان کی استقامت

ورسوخ فی العبادت کا یہ عالم تھا کہ ۱۳۸۸ھ میں انہیں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ روسیاہ بھی دفع نظرِ بد کے لئے ساتھ تھا' اپنی تو ممکن ہے کبھی جماعت بھی رہ گئی ہو ورنہ ایک دو رکعتیں تو کئی بار جماعت سے فوت ہوئیں۔ لیکن اس چار ماہ کے طویل سفر میں ملتان واپسی تک حضرت والد مرحوم کی ایک بار بھی تکبیرِ اولیٰ فوت نہ ہوئی' حرمین شریفین میں کثرتِ اژدھام کے باوجود وہ اکثر صفِ اول میں امام کے پیچھے ہوتے تھے۔ ان دنوں پندرہ پارے یومیہ تلاوت کا معمول تھا۔ سردرد کی شکایت ہوگئی تو اس ناکارہ کے عرض کرنے پر پندرہ کے بجائے دس پارے کردیئے۔

ہماری بستی میں کوئی حافظ نہیں تھا۔ رمضان المبارک میں تراویح کے لئے حافظ کی تلاش میں ہمیشہ پریشانی ہوتی۔ بڑی حسرت کے ساتھ اس ناکارہ کو فرماتے کہ تو خود ہی قرآن کیوں حفظ نہیں کرلیتا۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت والد مرحوم کی تمنا پوری فرمادی' ان کی ترغیب و تحریص اور دعا وبرکت سے اس روسیاہ کو بھی کچا پکا یاد ہوگیا' اور پھر رمضان المبارک میں اس ناکارہ نے ہمیشہ خود ہی سنانے کا التزام کیا' جس سے حضرت والد مرحوم کو بہت ہی قلبی راحت نصیب ہوئی۔

حضرت والد ماجدؒ کا قرآن کریم سے شغف بلکہ عشق دراصل "رائے پوری نسبت" کا اثر تھا' جو ان کے دادا پیر حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری سے متواتر چلی آرہی ہے' یہ ناکارہ جب بھی رمضان گزارنے کے لئے ان کی خدمت میں اپنے گاؤں جاتا(یہ ان کا حکم تھا کہ تو پورا سال تو مدرسے میں رہتا ہے' کم سے کم رمضان المبارک کا مہینہ تو میرے پاس گزارا کر' اور یہ ناکارہ ان کے حکم کی تعمیل میں رمضان المبارک ان کے پاس گزارنے کا التزام کرتا) وہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب! یہاں گاؤں میں حفظ قرآن کا مدرسہ بناؤ' یہ ناکارہ عرض کرتا کہ گاؤں میں مدرسہ کا کامیاب ہونا مشکل ہوتا ہے' دیہاتیوں کی آپس میں پارٹی بازی چلتی ہے تو نزلہ مسجد کے مولوی یا مدرسہ کے مدرس پر گرا کرتا ہے' ایک سال میں رمضانِ مبارک کے قریب حاضر ہوا تو جناب والد صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم نے گاؤں میں مدرسہ شروع کردیا ہے' اس ناکارہ نے عرض کیا کہ اگر آپ نے شروع کردیا ہے تو اللہ تعالیٰ مبارک کرے' چنانچہ حضرت والد صاحبؒ تاحیات اس مدرسہ کے کفیل رہے' کام کا آدمی ملنا مشکل ہوتا ہے' اس لئے کئی سال کافی پریشانی رہی' بعد میں

برادری ہی کے ایک حافظ کو، (جو ماشاء اللہ فارغ التحصیل عالم بھی ہیں اور حضرت اقدس قاری رحیم بخش پانی پتیؒ کے شاگرد ہیں) اس خدمت پر لگادیا، بحمد اللہ! حضرت والد مرحوم کے حسنِ اخلاق کی برکت سے یہ مدرسہ تحفیظ القرآن بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور قریباً پچاس بچے قرآن کریم حفظ کرچکے ہیں۔ حضرت والد صاحب کی وفات کے بعد اس ناکارہ نے عرض کیا کہ اس مدرسہ کے لئے چندہ نہیں کیا جائے گا اور کوئی شخص اس میں دخل دینے کا مجاز نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ والد مرحوم کا یہ صدقہ جاریہ قائم ودائم رکھیں۔ اس ناکارہ نے حضرت والد ماجدؒ کو بارہا دیکھا کہ وہ سجدے میں پڑے حق تعالیٰ شانہ سے دعائیں کرتے رہتے تھے، یہ انہی کی دعواتِ صالحہ اور توجہاتِ عالیہ کا اثر ہے کہ ان کی اولاد بحمد اللہ دین سے وابستہ ہے، کوئی دس پندرہ حافظ قرآن اور فارغ التحصیل عالم خود اپنی اولاد اور دیگر عزیزوں میں دیکھ کر گئے ہیں۔

والد مرحوم دیکھنے میں ایک دنیا دار چوہدری تھے، مگر انہوں نے دنیا کے لئے نہ جائیداد بنائی، نہ دکان، نہ مکان۔ جو کچھ بنایا دین کے لئے بنایا۔

انسانی زندگی نشیب وفراز سے عبارت ہے۔ ان کی زندگی کا نصف اول بڑی تنگی وعُسرت میں گزرا، اور نصف آخر میں حق تعالیٰ شانہ نے رزق کی بڑی فراوانی عطا فرمائی، لیکن ان کے انداز بود وباش میں کبھی فرق نہیں آیا۔ جب ان کے پاس کچھ نہیں تھا وہ تب بھی سفید پوش تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا تب بھی انہوں نے اپنی یا اپنی اولاد کی آسائش کے لئے کچھ نہیں کیا، بلکہ جو کچھ آتا مہمان نوازی اور غریب پروری میں صرف ہوجاتا تھا۔ وہ فرشتہ نہیں تھے لیکن یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فرشتہ سیرت تھے۔ ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوتی تھیں۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے کہ "اے اللہ اگر آپ بخش دیں تو سب کچھ معاف کرسکتے ہیں اور آپ کا ایسا بندہ کون ہے جس نے کوئی کوتاہی نہ کی ہو"۔)

تاہم حضرت والد مرحوم کے حق میں ان کے جاننے والوں کی متفقہ شہادت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ کسی سے زیادتی نہیں کی۔ کسی کا حق نہیں دبایا۔ کسی کو نہیں ستایا اور کبھی کسی کو غلط مشورہ نہیں دیا۔ جہاں تک بس چلتا ہر ایک کی خیر خواہی فرماتے۔ ہر ایک کو مشفقانہ مشورہ دیتے۔ ہر ایک سے حسنِ سلوک کی تلقین فرماتے۔

حضرت والد ماجدؒ ایک لطیفہ ہمیشہ سنایا کرتے تھے کہ "ان کے بزرگوں میں ایک صاحب تھے جو اپنے باپ دادے کے کارنامے بڑے مزے سے سنایا کرتے تھے' وہ اتنا کھاتے تھے' اتنا دوڑتے تھے' اتنا بوجھ اٹھالیا کرتے تھے' اتنے بہادر تھے' اتنے طاقتور تھے وغیرہ' وغیرہ۔ ان صاحب کی داستان سرائی کی تان اس پر ٹوٹا کرتی تھی کہ باپ دادوں کا تذکرہ کرکے آخر میں یہ کہا کرتے کہ اگر سچ پوچھو تو ہم ان کی اولاد ہی نہیں' کیونکہ ہمارا ان سے کوئی مقابلہ نہیں' کوئی نسبت ہی نہیں"۔ اس ناکارہ کو اس لطیفہ سے ہمیشہ عبرت ہوا کرتی ہے' واقعہ یہ ہے کہ اگر اپنے اسلاف کے حالات و کمالات کو دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ ان کی اولاد ہی نہیں۔

حضرت مرحوم ایک عرصہ سے بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ جس سے صحت کافی کمزور ہوگئی تھی۔ رمضان المبارک سے ایک مہینہ قبل ہی مسجد کے نمازیوں سے فرمانے لگے کہ رمضان شریف آرہا ہے روزہ رکھنے کی ہمت نہیں اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ رمضان کا بابرکت مہینہ ہو اور میں بغیر روزے کے رہوں۔ اس لئے آپ حضرات دعا فرمائیں۔ چنانچہ ہر نماز کے بعد التزام سے یہ دعا کراتے کہ میں روزے رکھ سکوں۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ پورے رمضان کے روزے رکھے۔ تراویح میں قرآن مجید سنا اور مغرب کے نوافل میں بھی قرآن کریم سنا' اور معمول کے مطابق اعتکاف بھی کیا۔ ماہ مبارک میں ان کی صحت بہت ہی اچھی ہوگئی۔ عید کے ایک ہفتہ بعد ملتان تشریف لے آئے۔ راقم الحروف کی اور چھوٹے بھائی کی رہائش ملتان میں تھی۔ نہایت ہشاش بشاش تھے۔ ۱۸ر شوال کا جمعہ (جو ان کی زندگی کا آخری جمعہ تھا) پڑھا۔ رات کو حسبِ معمول نمازِ تہجد کے لئے اٹھے' نماز سے فارغ ہوئے تو مرض کا حملہ ہوا' بے ہوش ہوگئے' علاج معالجہ کی تدابیر کی گئیں' لیکن افاقہ نہ ہوا۔ منگل کی رات کو ہم لوگ انہیں گاؤں لے گئے۔ بالآخر جمعہ کی شب کو عشاء کی اذان سن کر روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی اور اپنے آقا کا یہ وفادار بندہ اور جادۂ حیات کا یہ تھکا ماندہ مسافر اس جہان والوں کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا۔

صد شکر کہ آپہنچا لبِ گور جنازہ
لو بحرِ محبت کا کنارہ نظر آیا

حضرت والد مرحوم کا سنت کے موافق یہ دائمی معمول تھا کہ وہ عشاء کے بعد فوراً سوجاتے تھے۔ وہ آج بھی عشاء کی اذان سن کر سوئے' مگر ایسا سوئے کہ صبحِ قیامت سے پہلے انہیں کوئی نہیں جگائے گا۔

یہ ناکارہ اپنے تمام اکابر واحباب کا شکریہ ادا کرتا ہے' جنہوں نے زبانی یا خطوط کے ذریعہ تعزیت فرمائی اور یہ استدعا کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حضرت والد مرحوم کے لئے دعا واستغفار اور ایصالِ ثواب سے دریغ نہ فرمایا جائے کہ اس ناکارہ کی یہی سب سے بڑی تعزیت ہے۔

ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما
یرضٰی ربنا وانا بفراقک یا ابانا لمحزونون

غمزدہ
محمد یوسف لدھیانوی
خادم مجلس تحفظ ختم نبوت' ملتان

(ہفت روزہ "لولاک" فیصل آباد ۲۸ر نومبر ۱۹۷۵ء)

مولانا حافظ حبیب اللہ فاضل رشیدی

۲۳‘۲۴ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ مطابق ۷‘۸ دسمبر ۱۹۸۵ء ہفتہ واتوار کی درمیانی شب جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے صدر مہتمم حضرت مولانا الحاج الحافظ حبیب اللہ فاضل رشیدی قریباً ۷۵ سال کی عمر میں رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی بعض خوبیاں لائق رشک تھیں۔ وہ میدان خطابت کے شہسوار تھے۔ عزیمت اور آہنی عزم کے مالک تھے‘ عقیدہ ختم نبوت کے لئے جانبازی وجانثاری کا جذبہ ان کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ وہ ہر تحریک‘ جو احیائے دین کے لئے اٹھی اس کے ہراول دستہ میں شامل رہے۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں انہیں اور ان کے برادر اکبر حضرۃ الاستاذ مولانا محمد عبداللہ رائپوری“ کو نہ صرف پابند سلاسل کیا گیا بلکہ مرحوم کے قائم کردہ ادارہ جامعہ رشیدیہ کی املاک تک ضبط کرلی گئیں جو آج تک واپس نہ ہوئیں۔ اسی طرح تحریک ۷۴ء اور تحریک نظام مصطفیؐ ۷۷ء میں بھی ان کو قید وبند کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ان کی تقریروں پر مقدمات‘ سزائیں‘ اور زبان بندی تو ان کا گویا لازمہ حیات بن گئی تھی۔ وہ اپنے خطبات جمعہ میں بڑے جوش اور مجاہدانہ شوکت وصولت کے ساتھ اس آیت کی تلاوت فرمایا کرتے تھے:

انفروا خفافا وثقالا وجاهدوا باموالكم وانفسكم فی سبيل الله (الایہ‘ التوبہ)

”نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں“۔ ترجمہ: حضرت شیخ الہندؒ)

ان کی زبان سے اس آیت کریمہ کی تلاوت سنتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آیت

کریمہ کی دعوت ان کا حال بن چکی ہے۔ باطل کے مقابلہ میں فولاد سے زیادہ سخت تھے، خاموشی اور کم گوئی ان کا خاص وصف تھا۔ مزاج میں تواضع ہی نہیں بلکہ مسکنت پائی جاتی تھی۔ زندگی نہایت سادہ بلکہ فقیرانہ وقلندرانہ تھی۔ سج دھج سے کوسوں دور و نفور تھے۔ اکابر کے سامنے ایسے خاموش بیٹھنے کے عادی تھے گویا انہیں بولنا ہی نہیں آتا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی۔ اسی "حسینی نسبت" کا اثر تھا کہ انہیں مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے والہانہ عشق اور ماثر اکابر کے احیاء سے خاص شغف تھا۔ ماہنامہ "الرشید" کے (جو ان کی ادارت میں نکلتا تھا) "دارالعلوم دیوبند نمبر" "مدنی واقبال نمبر" "تاریخ دارالعلوم" اور "فیضان دارالعلوم نمبر" ان کے اسی شغف کے مظہر ہیں۔ حق یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی اس پہلو سے جتنی خدمت ان کے ادارے نے کی ہے' پاکستان میں اور کسی نے نہیں کی۔

پاکستان میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے وہی علمبردار تھے۔ جمعیت علمائے اسلام کے صف اول کے قائدین میں سے تھے' وفاق المدارس العربیہ کے رکن رکین تھے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کی مجلس شوریٰ کے ایک عرصہ تک رکن رہے۔ اہل حق کی تمام تنظیموں اور جماعتوں سے انہیں تعلق خاطر تھا۔ وہ سب کو اپنا سمجھتے تھے۔ سب سے محبت ویگانگت تھی۔ انہیں بیر تھا تو قادیانیوں اور دیگر ملاحدہ سے۔

حق تعالیٰ شانہ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے' اور تمام لغزشوں کو معاف فرماکر رحمت ورضوان کے درجات عالیہ نصیب فرمائے۔ آمین یا رب العالمین.

(بینات جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ مطابق فروری ۱۹۸۶ء)

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی اہلیہ محترمہ

۴ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو بروز چہار شنبہ حضرت اقدس مجدد مولانا شاہ محمد الیاس دہلوی قدس سرہ کی صاحبزادی اور ہمارے شیخ حضرت قطب الاقطاب برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی نور اللہ مرقدہ کی اہلیہ محترمہ کا دہلی میں انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صبر و شکر، زہد و قناعت، دعا و التجاء، تقویٰ و طہارت اور تعلق مع اللہ میں وہ "خاندان کاندھلہ" کی خواتین کی نمائندہ تھیں۔ جن کا نقشہ حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی مدفیوضہم نے "سوانح مولانا محمد الیاس" میں کھینچا ہے۔ حضرت اماں جی مرحومہ کافی عرصہ سے علیل تھیں، ڈاکٹروں نے کینسر تشخیص کیا، اور علاج کے لئے ہسپتال میں داخلے کا مشورہ دیا۔ مگر آپ نے ہسپتال جانے سے قطعی انکار کردیا، اور فرمایا اگر گھر پر باپردہ علاج ہوسکے تو ٹھیک ہے ورنہ ہسپتال اور بے پردگی کے علاج سے مرجانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب مدظلہ العالی انہیں دلی لے گئے۔ تین چار مہینے تک گھر پر اچھے سے اچھا علاج ہوتا رہا لیکن وقت موعود آپہنچا تھا اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ حضرت اماں جی رحمہا اللہ نے ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ کو گھر کے تمام افکار سے یکسر فارغ کر رکھا تھا اس لئے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی اصلاحی، دعوتی، علمی و تصنیفی خدمات میں حضرت اماں جی رحمہا اللہ کا بڑا حصہ تھا۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کے تمام متوسلین اور وہ تمام حضرات جو حضرتؒ کی تصنیفات سے استفادہ کرتے ہیں، ان کے ذمہ حق شناسی کا تقاضا ہے کہ اماں جی مرحومہ کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام کریں۔

وصلی اللہ علی خیر خلقہ صفوۃ [illegible] سیدنا ومولانا

محمد وعلی آلہ [illegible] اجمعین الی یوم الدین۔

حضرت مولانا عبدالحنان صاحبؒ

مدنی تقویم کے مطابق ۶ر جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ (مطابق ۱۵ر فروری ۱۹۸۶ء) کو مدینہ طیبہ میں محدث کبیر حضرت مولانا عبدالحنان صاحب کیمبل پوری کا وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی، حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور قطب الاقطاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ کے شاگرد تھے۔ علاقہ چھچھ کے حضرت مولانا قطب الدین صاحبؒ حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت مرحوم کو مولانا قطب الدین صاحبؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا۔ گویا مرحوم 'بیک واسطہ حضرت مولانا عبدالحئ لکھنویؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالقدیر کیمبل پوری ایسے اکابر علماء ان کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ حضرت اقدس بنوری رحمہ اللہ کا بہت ہی اکرام فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ان سے فرمایا کہ میں آپ کے ہاتھ دھلاؤں گا کیونکہ معاصرت اپنی جگہ، مگر آپ کو دیکھ کر ہمیں اپنے اکابر یاد آجاتے ہیں۔ مرحوم نے اکاڑہ میں "جامع حنفیہ انوریہ" کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کی تھی جہاں سے سالہا سال تک دینی علوم کی اشاعت فرماتے رہے۔ ابھی چند سال سے مدینہ طیبہ کی خاک میں دفن ہونے کی تمنا لے کر دامن "احد" میں قیام پذیر تھے۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان کی یہ تمنا بھی پوری کردی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اقدام شریفہ میں ان کو جگہ ملی۔ حق تعالیٰ شانہ، ان کے بہت ہی درجات بلند فرمائیں۔ افسوس ہے کہ ہمیں حضرت کے وصال کی اطلاع دیر سے ملی اور پھر تاریخ وفات کا بھی علم

نہیں ہوسکا، اس لئے ان کے بارے میں تعزیتی الفاظ لکھنے میں تاخیر ہوگئی۔ حق تعالیٰ شانہ ان کے پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائیں۔ اور حضرت کے صاحبزادگان گرامی برادرم مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا محمد داؤد صاحب کو ان کا صحیح جانشین بنائیں۔

(بینات رمضان ۱۴۰۶ھ مطابق جون ۱۹۸۶ء)

قطب الارشاد عارف باللہ

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

بالاسف! کہ اہل قلوب صالحین کے قافلے بڑی تیزی سے منزل عقبیٰ کی طرف رواں دواں ہیں۔ ویرانۂ دنیا کی تاریکی میں روز بروز شدت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا منظر آنکھوں کے سامنے آرہا ہے:

> یذھب الصالحون الاول فالاول ویبقیٰ حفالۃ کحفالۃ الشعیر او التمر لایبالیھم اللہ بالۃ۔(رواہ البخاری عن مرداس الاسلمی رضی اللہ عنہ کمافی المشکوٰۃ(ص۴۵۸)
>
> "نیک لوگ یکے بعد دیگرے اٹھتے جائیں گے۔ اور پیچھے انسانوں کی تلچھٹ رہ جائے گی۔ جیسے جو یا کھجور کی تلچھٹ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی کچھ بھی پرواہ (یعنی عزت و حرمت) نہیں ہو گی۔"

۱۵ر رجب المرجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۷ر مارچ ۱۹۸۶ء کو بروز پنج شنبہ (جب کہ فضا صبح کی اذانوں سے گونج رہی تھی) سیدی وسندی ومولائی ومرشدی قطب الارشاد حضرت اقدس عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحئی عارفی نور اللہ مرقدہٗ رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے۔

> انا للہ وانا الیہ راجعون ...... ان للہ مااخذ ولہٗ ما اعطیٰ وکل عندہ باجل مسمی۔ اللّٰھم اغفرلہٗ وارحمہٗ وعافہٖ واعف عنہٗ واکرم نزلہٗ ووسع مدخلہٗ وابدلہ داراً خیراً من دارہٖ واھلاً خیراً من اھلہٖ وزوجا خیراً من زوجہٖ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

حضرت اقدس ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا وجود سامی سایۂ رحمت اور چشمۂ فیض تھا۔ جس سے نہ جانے کتنی مخلوق خدا سیراب ہوتی تھی۔ ان کی زندگی واقعۃً ایک عارف باللہ، مرد مومن اور ولیٔ کامل کی زندگی تھی۔ مبدأ فیاض نے ان کی فطرت میں بہت سے خصائص و کمالات ودیعت فرمائے تھے، مرشد تھانویؒ کے فیض صحبت و تعلق نے ان کمالات کو جلا بخشی۔ وہ حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی (قدس سرہٗ ونور اللہ مرقدہٗ) کے اکابر خلفاء میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ کے ذوق ومزاج اور قال وحال کو اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق پوری طرح اپنے اندر جذب کرلیا تھا، وہ مرشد تھانویؒ کے علوم وافادات کے امین تھے۔ ان کی ہر ادا شیخؒ کے ذوق ومزاج میں ڈھلی ہوئی تھی، اور وہ شیخؒ کی اداؤں کا مرقع اور ان کی زندہ تصویر بن گئے تھے۔ انہیں اپنے شیخؒ سے مدۃ العمر ایسا والہانہ تعلق رہا جو نادر الوجود بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ حضرت خود تحریر فرماتے ہیں:

> "حضرت والا رحمتہ اللہ علیہ سے میرا تعلق، بیعت سے حضرت کی وفات تک سترہ سال رہا۔ اس عرصہ میں میں نے التزاماً اپنے حالات کا عریضہ ہر ہفتہ ارسال خدمت کیا ہے۔ اس التزام میں الحمد للہ کبھی ناغہ نہیں ہوا، اس کے علاوہ الحمد للہ میری بڑی خوش نصیبی اور سعادت کبریٰ کا سرمایہ یہ ہے کہ اکثر حضرت والاؒ کی تقریریں اور وعظ بالمشافہ سنے ہیں، اور مجلس ملفوظات میں بقدر اپنی فرصت اور گنجائش وقت کے اکثر شریک رہا ہوں، اور مختلف تقریبات میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ حضرت کے ساتھ سفر بھی کیا ہے اور حضرت کے دولت کدہ پر مہمان خصوصی رہنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اور حضرت کے خوان کرم پر تنہا بھی کھانے کی سرفرازی حاصل ہوئی اور دعوتوں میں بھی شرکت کی مسرتیں نصیب ہوئی ہیں۔ حضرت کی خدمت میں اکثر جو ہدیے پیش کئے ہیں ان کو شرف قبولیت عطا ہوا ہے .... اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شفقت بزرگانہ اور محبت مربیانہ سے اس ذرۂ ناچیز کو اپنے عطایا وتبرکات سے بھی سرفراز فرمایا ہے۔ مجلسوں میں بھی حضرت کی

توجہات خاص کا اکثر مورد فیض باطنی اور روحانی ہوا ہوں بس ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(بزم اشرف کے چراغ ص ۲۰، ۲۱)

حضرت کے عناصر ترکیبی میں محبت کا عنصر سب سے غالب تھا (والذین آمنوا اشد حباً للہ) ان کا خمیر محبت کی مٹی سے گوندھا گیا تھا۔ اور شیخ کامل کی نظر کیمیا اثر کی کرامت سے حسن ازل کا عشق ان کے رگ وپے میں سرایت کرگیا تھا' وہ کشتۂ محبت ہی نہیں' سراپا محبت بن گئے تھے' بے مثال ضبط واستقلال کے باوجود جب امواج محبت کا تلاطم ان کے قلب وجگر میں حشر برپا کرتا تو وہ زیر لب یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے:

اے خیال دوست! اے بیگانہ ساز ماسوا!
اس بھری دنیا میں تو نے مجھ کو تنہا کردیا

خبر کیا تھی بنائے گی محبت ایسا دیوانہ
مجھے بننا پڑے گا خود محبت ہی کا افسانہ
نہ چھوڑا شائبہ تک دل میں احساس دو عالم کا
معاذ اللہ محبت کا یہ انداز حریفانہ
جسے پینا ہو آنکھوں سے وہ تیری بزم میں آئے
مرا دل چشم مست ناز ساقی مے خانہ
کسی کا ذکر ہے اور اہل محفل مست وبے خود ہیں
بظاہر یاں نہ ساقی ہے' نہ صہبا ہے نہ پیمانہ
یہاں تک بڑھ گئی وارفتگی شوق نظارہ
حجابات نظر سے پھوٹ نکلا حسن جانانہ
اسے اے عارفی کوئی نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا
میں فرط بے خودی میں کہہ گیا جو راز میخانہ

لذت درد دلم از ماسوا بیگانہ داشت
نالہائے خویشتن دارم برائے خویشتن
در دلم ہیجان عشق وبرلبم ناموس عشق
برنمی تابم کہ گویم ماجرائے خویشتن
زمزمہ سنج است یاد دوست بامضراب دل
دارم اندر خلوت جاں ہمنوائے خویشتن
من چگونہ آورم عرض تمنا پیش دوست
می نیرزد در نگاہم خود وفائے خویشتن
ہاں! بکن جان ودلم را غارت ناز وادا
جاں فدایت تیز ترکن دشنہ ہائے خویشتن

حضرت نانوتویؒ کے قصیدۂ مناجاتیہ کے مندرجہ ذیل اشعار، چونکہ حضرتؒ کی قلبی کیفیات کا آئینہ تھے اس لئے نہایت سوز کے ساتھ ایسے والہانہ انداز میں پڑھتے کہ خود بھی تڑپتے اور دوسروں کو بھی تڑپاتے:

دلم از نقش باطل پاک فرما
براہ خود مرا چالاک فرما
بکش از اندرونم الفت غیر
بشو از من ہوائے کعبہ ودیر
اگر نالائقم قدرت تو داری
کہ خار عیب از جانم براری
بہ نیکی زشت را مبدل نمائی
سیاہی را بہ بخشی روشنائی
گناہم راہ اگر دیدی مگر ہم
بعفو وفضل خود اے شاہ عالم

انہیں یہ فیضان محبت مرشدی تھانویؒ کی نظر محبت سے ملا تھا۔ اس لئے وہ شیخؒ کے

اس احسانِ عظیم کو مدۃ العمر نہیں بھولے ساری عمران کے ممنون احسان رہے اور والہانہ انداز میں اپنے جذبات تشکر کا ہمیشہ اظہار کرتے رہے۔

میں نے ساری عمر کی ہے خدمت پیر مغاں
مجھ سے پوچھو میکدہ کی زندگی ہوتی ہے کیا
ذکر ان کا چھیڑ کر دیکھے کوئی اے عارفیؔ
بے خودی کیا چیز ہے وارفتگی ہوتی ہے کیا

کھلا کرتا ہے اس پرمے کدہ میں راز مے نوشی
نگاہ مست ساقی سے جو دل سرشار ہوجائے
بہار حسن کو یوں جذب کرلوں دیدہ ودل میں
محبت میں مرا ذوق نظر معیار ہوجائے
مری آنکھوں میں چشم مست ساقی کا وہ عالم ہے
نظر بھر کر جسے بھی دیکھ لوں میخوار ہوجائے

یاد ان کی اس طرح دم ساز ہوکر رہ گئی
میرے دل کی بے خودی اک راز ہوکر رہ گئی
عارفیؔ پیر مغاں نے ایسی کچھ ڈالی نظر
میری ہستی مظہر اعجاز ہوکر رہ گئی

حضرت کی محفل بجائے خود درس عبرت تھی، آپ کی مجلس میں محبت کی خوشبو مہکتی تھی۔ اور آپ کے بیانات میں بھی اکثر وبیشتر "محبت" ہی زیر بحث آتی، فرماتے تھے کہ ہمارے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں تو سارے سلوک کا حاصل صرف ایک چیز معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے محبت .... کسی نے عرض کیا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ سلوک کا حاصل صرف دو چیزیں ہیں، محبت اور اتباع سنت .... اس پر حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ہم ایسے شخص کو اپنا شیخ ہی کیوں بنانے لگے جو متبع سنت نہ ہو، پس حاصل سلوک ایک ہی چیز نکلی یعنی محبت۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ شیطان میں تین عین تھے مگر چوتھا عین نہیں تھا اس لئے مارا گیا' وہ عالم تھا اور اتنا بڑا عالم کی معلم ملکوت کہلاتا تھا' عابد تھا اور ایسا عابد کہ آسمان کے چپے چپے پر سجدہ کیا تھا' وہ عارف تھا اور ایسا عارف کہ عین غضب الٰہی کے وقت بھی' جب کہ اسے راندۂ درگاہ کیا جارہا تھا' دعا کرنے لگا: "رب فانظرنی الٰی یوم یبعثون" کیونکہ جانتا تھا کہ یہ حالت بھی قبولیت دعا سے مانع نہیں' لیکن ظالم میں عشق نہیں تھا۔ اگر اسے یہ چوتھا عین بھی حاصل ہوجاتا اور اسے اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی تو حکم الٰہی سے سرتابی نہ کرتا' جب حکم ہوا تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو بغیر چون وچراں کے فوراً سجدہ میں گر جاتا' کیونکہ محبت مصلحتیں اور علتیں تلاش نہیں کیا کرتی' محبت تو محبوب کے حکم پر مرمٹنے کا نام ہے۔ پس جب تک عشق و محبت نہ ہو نہ علم کا اعتبار ہے نہ عبادت کا نہ معرفت کا۔

حضرتؒ جب آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ امی وابی) کا ذکر مبارک کرتے تو آپ کی والہانہ کیفیت دیدنی ہوتی تھی۔ ضبط واستقلال کا پہاڑ ہونے کے باوجود آواز بھرّا جاتی آنکھیں پرنم ہوجاتیں' اور ایک خاص وجد وکیف کی حالت میں یہ اشعار پڑھتے:

السلام اے ذکر تو روح رواں
السلام اے یاد تو جانان جاں
السلام اے مایۂ راز حیات
السلام اے وجہ خلق کائنات
السلام اے راز حسن زندگی
السلام اے ناز وعجز و بندگی
السلام اے عظمت حب اتم!
از خدا جان عــــزیزت راقم!

حضرتؒ سنت نبویؐ کو محبت کی ادائیں سمجھتے تھے' اتباع سنت کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محبت الٰہی کا مظہر اتم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں سب سے زیادہ حسین پیکر تخلیق فرماکر ہمارے سامنے پیش کردیا اور فرمایا کہ

کیا تم ہم سے محبت رکھتے ہو؟ اگر ہم سے محبت رکھتے ہو تو ہمارے محبوب نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کو لازم پکڑ لو، تم ہم سے کیا محبت کرو گے، اگر تم ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھل گئے تو ہم تم سے محبت کریں گے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔

حضرتؒ اس مضمون کو بار بار مختلف عنوانات اور مختلف پیرایوں میں بیان فرماتے تھے، حضرتؒ کی گرمی نفس کی برکت سے آپ کے سامعین کے دل میں اتباع سنت کا شوق اور ولولہ پیدا ہوجاتا، اور اس کی اہمیت دلوں میں رچ بس جاتی تھی، روز مرہ زندگی میں اتباع سنت کا نقشہ پیش کرنے کی غرض سے حضرتؒ نے "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" تالیف فرمائی۔ اس تالیف میں اللہ تعالیٰ نے بہت برکت فرمائی، بہت سے حضرات نے اس کے متعدد ایڈیشن شائع کئے اور اردو کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔

اتباع سنت کے بعد جو مضمون حضرتؒ کے بیان میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا وہ تھا حقوق العباد کا اہتمام۔ فرماتے تھے کہ عالم تعلقات ہمارے لئے مجاہدہ کا میدان ہے۔ تمام اہل حقوق کے حقوق اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق ادا کرنا اور نفسانی تقاضوں اور خواہشات کو آڑے نہ آنے دینا، یہی سب سے بڑا جہاد ہے یہی سب سے بڑا مجاہدہ ہے سب سے بڑی ریاضت ہے، یہ مضمون بھی ایسے مختلف پیرایوں میں بیان فرماتے کہ دل میں پیوست ہوجاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت والاؒ کو بے حد ضبط وتحمل اور حلم ووقار عطا فرمایا تھا۔ کیسا ہی ناگوار واقعہ پیش آئے ان کے صبر واستقلال کے پہاڑ میں جنبش نہیں ہوتی تھی، فرماتے تھے کہ اب تو قلب کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ کسی واقعہ سے بھی کوئی تأثر نہیں لیتا۔

عارفیؔ ہو تو گئے خوگر تسلیم ورضا
عشق سے گر نہ ہوا کچھ ہمیں حاصل نہ سہی

فرماتے تھے کہ اگر کوئی ہمیں برا بھلا کہتا ہے تو اس سے ہمارے نفس کی اصلاح ہوتی ہے، اور جو لوگ بڑی عقیدت سے لمبے چوڑے القاب لکھ بھیجتے ہیں، ان سے نفس پھولتا ہے، برا بھلا کہنے والوں سے اس کا کفارہ ہوجاتا ہے، حضرت کے صبر وضبط کی ایک چھوٹی

سی مثال بیان کردینا کافی ہوگا۔ آپ کے یہاں کسی صاحب نے مزدوری کا کوئی کام کیا تھا' اس کو اس کی مزدوری دی جاچکی تھی۔ خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ صبح ہی صبح' جب کہ حضرتؒ اپنے مطب میں جاکر بیٹھے ہی تھے' وہ صاحب آئے اور مزدوری مانگنے لگے' حضرت نے فرمایا کہ بھئی! تمہاری اجرت تو ہم تمہیں دے چکے ہیں' بس اتنا کہنا تھا کہ ان صاحب نے بغیر کسی تمہید کے بدکلامی شروع کردی "کیوں جھوٹ بولتے ہو' شرم نہیں آتی' داڑھی رکھی ہوئی ہے' بزرگ بنے بیٹھے ہیں' مزدور کی مزدوری مارتے ہیں" وغیرہ وغیرہ جو منہ میں آیا کہتا چلا گیا' ایک خادم نے ان صاحب کو کمرے سے باہر لے جانا چاہا' تو حضرت نے نہایت خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ بھئی! ان کو کچھ نہ کہو' ان صاحب نے آج ہمیں خوب ناشتہ کرایا ہے' پھر اسے پانچ روپے مرحمت فرمائے تو وہ خوش ہوکر دعائیں دینے لگا۔ حضرت اپنی مجلس میں اس واقعہ کا ذکر فرماتے تو اس کے الفاظ: "کیوں جھوٹ بولتے ہو' شرم نہیں آتی" الخ نقل فرماکر خوب محظوظ ہوتے تھے۔ بے نفسی اور فنائیت کا یہ مقام خاص مقبولانِ الٰہی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ حضرت کا حال واقعۃً شیخ سعدیؒ کے اس قول کا مصداق تھا

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمنان ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ بادوستانت خلاف است و جنگ

راقم الحروف کو سالہا سال تک حضرت کی خدمت میں حاضری کی توفیق وسعادت میسر آئی۔ لیکن اس طویل عرصے میں حضرت کو کسی ناگوار بات پر بگڑتے ہوئے یا کسی کو ڈانٹتے جھڑکتے کبھی نہیں دیکھا.... البتہ اپنے بیان میں جب دورِ حاضر کی بے حیائی' بے پردگی' مرد وزن کے اختلاط' ریڈیو' ٹی وی' اور دیگر فواحش ومنکرات پر نکیر فرماتے تو بے ساختہ حضرت کا لہجہ تیز تر ہوجاتا' چہرہ پر نفرت وبیزاری کے آثار ظاہر ہوجاتے اور لب ولہجہ سے غیظ وغضب ٹپکتا' جس طرح حضرتؒ کی مسکراہٹ کی ادا بہت پیاری معلوم ہوتی تھی اور اس وقت حضرت کا منہ چوم لینے کو جی چاہتا تھا' اسی طرح حضرتؒ کا یہ غضب ناک لہجہ بھی بہت ہی بھلا لگتا تھا۔

باوجودیکہ کہ حضرت خود علی گڑھ کے گریجویٹ تھے، لکھنؤ سے قانون کی سند حاصل کی تھی اور ایک عرصہ تک وکالت کے پیشہ سے منسلک بھی رہے۔ لیکن شیخ "کی نظر کیمیا اثر کی برکت سے انگریزیت کی رگ ان کے اندر سے کٹ گئی تھی۔ (بہت سے پڑھے لکھے اعلیٰ درجہ کے دینداروں کو بھی دیکھا کہ وہ نیکی وپارسائی کے تمام صفات سے متصف ہیں لیکن ان میں انگریزیت کی رگ بدستور باقی ہے) حضرت کو انگریزیت سے شدید نفرت تھی اور اس پر شدید نکیر فرماتے تھے۔ متعدد بار ارشاد فرمایا کہ ہر شعبہ میں جو بڑے بڑے باکمال لوگ تمہیں نظر آئیں گے وہ سب "ان پڑھ" ماؤں کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ دور جدید کی کسی پڑھی لکھی خاتون نے بھی کسی باکمال شخصیت کو جنم دیا؟۔ چند سال ہوئے حضرت نے دور حاضر کے عامتہ الورود گناہوں کی مندرجہ ذیل فہرست شائع فرمائی تھی۔

دور حاضر کے بعض شدید خطرناک اور گناہ کبیرہ

جن کو ترک کئے بغیر دوزخ سے نجات نہ ہوگی

(۱) سفلی عمل کا کرنا اور کرانا۔

(۲) غیر مشروعہ تعویذ گنڈے کرنا یا غیر شرعی کاموں کے لئے منت ماننا۔

(۳) ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔

(۴) مردوں کا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہونا۔

(۵) نامحرم مردوں اور عورتوں کا بے محابا ملنا جلنا۔

(۶) لغو تفریحات میں وقت ضائع کرنا' ریڈیو' ٹیلیویژن میں فواحشات وشہوانی اور حیا سوز مضامین اور راگ راگنی کا نشر ہونا اور ان کا دیکھنا وسننا' سینما دیکھنا' جوا کھیلنا۔

(۷) عورتوں کا بے پردہ ہونا۔

(۸) برہنہ سر رہنا' گلا' بازو اور پیٹ کھلا رکھنا' باریک لباس پہننا۔

(۹) شوہر کی امانت میں خیانت کرنا۔

(۱۰) دفاتر میں نامحرموں کے ساتھ کام کرنا۔

(۱۱) بے پردہ بازاروں میں جانا۔

(۱۲) نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا کالج میں مخلوط تعلیم حاصل کرنا۔
(۱۳) رشوت لینا دینا' سود لینا دینا' غیبت کرنا یا سننا۔
(۱۴) تصاویر کا رکھنا اور دیواروں پر لگانا' شوقیہ کتا پالنا۔
(۱۵) تقاریب شادی وغیرہ میں نمائش و زیبائش کے لئے روپیہ صرف کرنا' جو اسراف و تبذیر ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔"

حضرتؒ کے دولت کدہ پر ہفتہ وار دو مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک عمومی مجلس جو جمعہ کی شام کو عصر سے مغرب تک ہوتی تھی' اس میں حضرتؒ لوگوں کی سطح کے مطابق وعظ و نصیحت فرماتے' احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے اور دور حاضر کے فتنوں اور فواحش و منکرات سے بچنے کی تاکید فرماتے تھے۔ اس مجلس میں کافی حضرات شرکت فرماتے تھے۔ گھر کے زنانہ حصہ میں بہت سی مستورات بھی جمع ہو جاتیں جو حضرتؒ کے ارشادات سننے کے لئے بڑے اہتمام سے آتی تھیں' زنان خانہ میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ حضرتؒ کی آواز پہنچتی تھی۔ حضرتؒ کی یہ عمومی مجلس بہت ہی مفید اور بابرکت تھی۔ اور اس سے سامعین کو بہت ہی نفع ہوتا تھا۔ نہ جانے حضرتؒ کے مواعظ حسنہ سے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا۔

حضرتؒ کی دوسری مجلس خواص کے لئے ہوتی تھی' جس کے لئے پہلے دو دن تھے۔ پیر اور جمعرات۔ کچھ عرصہ سے جمعرات کی نشست موقوف ہو گئی تھی۔ تاہم پیر کی مجلس بدستور جاری رہی۔ اس میں بھی مجمع خاصا ہونے لگا تو اس کے ختم کرنے کا ارادہ فرمالیا' مگر مخصوص احباب کے اشتیاق کی بناء پر اس کا سلسلہ آخری علالت تک رہا۔ اس مجلس میں حضرتؒ باطن کے عقدے حل کرتے تھے اور اپنے شیخ حضرتؒ حکیم الامت تھانویؒ کے افادات سے مستفید فرماتے تھے ..... حضرتؒ کو اس کی بڑی حرص ہوتی تھی کہ کسی طرح باطن کی دولت اپنے احباب کو گھول کر پلادیں .... بار بار فرماتے تھے کہ جو کچھ آپ مجھ سے سن رہے ہیں یہ میری باتیں نہیں' ہمارے حضرتؒ کا فیض ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ میرے احباب ہمارے حضرتؒ کے ذوق سے آشنا ہو جائیں۔ اس محفل کا رنگ عجیب ہوتا تھا۔ حضرت علوم و معارف کے موتی لٹاتے تھے' قرآن کریم کے ایسے نکات بیان فرماتے جو وہبی ہوتے تھے' اپنے احباب کی ترغیب کے لئے اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔۔

مجھ ہی سے سن لو جو سننا ہے تم کو داستاں میری
کہاں سے لائے گا قاصد بیاں میرا زباں میری

اور فرماتے تھے کہ میں اپنے شیخ کی نہایت معتبر و مستند باتیں سنارہا ہوں' ان کی قدر کرو' کبھی مزاحاً فرماتے میری قدر کرلو' میرے بعد یہ باتیں پھر کسی سے سننے میں نہیں آئیں گی' اور کبھی فرماتے:

بیارید اگر ایں جا است سخن دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یہ دو مجلسیں تو بالالتزام تھیں' ان کے علاوہ حضرتؒ جس محفل میں تشریف فرما ہوتے وہ "دکان معرفت" بن جاتی تھی۔ خصوصاً جب ساڑھے آٹھ بجے اپنے مطب تشریف لے جاتے تو ایک گھنٹہ حضرتؒ کے احباب کے لئے مخصوص تھا۔ یہ گویا حضرتؒ کی روزانہ کی مجلس ہوتی تھی۔ مطب کے اوقات میں بھی جب جایئے حضرتؒ کی نشست گاہ میں علماء و صلحاء کا جمگھٹا رہتا تھا' ادھر مریضوں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کے لئے نسخے تجویز فرمارہے ہیں۔ ادھر واردین وصادرین کو داروئے دل تقسیم فرمارہے ہیں' راقم الحروف کو بھی اوقات مطب میں بیسیوں مرتبہ حاضری کا اتفاق ہوا۔ حضرت خواہ مریضوں میں کیسے ہی مشغول ہوں' جب ہماری طرف التفات فرماتے بغیر کسی تمہید کے بے ساختہ علوم و معارف کا دہانہ کھل جاتا۔ ایک بار حضرتؒ اسی طرح مریضوں کے دیکھنے میں مشغول تھے' یکایک اس ناکارہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

اب یہ عالم ہے ذرا بھی جب کبھی فرصتؔ ہوئی
پھر وہی جان تمنا پھر حدیث دل وہی!

اور فرمایا کہ آپ کی طرف دیکھ لیا تو فرصت ہوگئی اور پھر علوم و معارف کا چشمہ پورے جوش کے ساتھ ابلنے لگا۔

اہل اللہ کے الوان مختلف ہوتے ہیں' کہتے ہیں کہ حضرت امام حسن بصریؒ پر خوف کا ایسا غلبہ تھا کہ جو شخص ان کی مجلس میں جاکر بیٹھتا اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ابھی

اپنی والدہ کے دفن سے فارغ ہو کر آئے ہیں۔ اور ان کے ہم عصر و رفیق حضرت امام محمد بن سیرینؒ پر انبساط کا غلبہ تھا۔ ان کی مجلس میں کیسا ہی غمزدہ حاضر ہوتا اس کا غم غلط ہو جاتا تھا۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب رحمتہ اللہ علیہ پر رجائیت کا غلبہ تھا' وہ اکثر و بیشتر رحمت الٰہی کا مضمون بیان فرماتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ ایک بار گناہوں سے پیٹ بھر کر توبہ کر لو' بس پھر اپنے کام میں لگو۔ ایک بار راقم الحروف نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشادات سننے سے ہمت بندھ جاتی ہے' اور مایوسی نہیں ہوتی ہے۔ بے ساختہ فرمایا "ارے مایوسی سے مومن کا کیا واسطہ؟ مایوسی تو کفر ہے" مجھے ایک صاحب کا جملہ بہت پسند آیا کہ اگر کوئی شخص خودکشی کا ارادہ رکھتا ہو اور ذرا سی دیر کے لئے حضرتؒ ڈاکٹر صاحب کی مجلس میں آبیٹھے تو خودکشی کا ارادہ ترک کر دے گا۔ اور اس کی یاس آس سے بدل جائے گی۔

حضرتؒ اپنے احباب کو نظم اوقات کی بطور خاص تاکید و وصیت کرتے تھے' فرماتے تھے کہ اگر نظام الاوقات مرتب ہو تو وقت خود کام کرا لیتا ہے۔ نظم اوقات کے بغیر کوئی کام ڈھب سے نہیں ہو سکتا۔

حضرتؒ ہمت و عزیمت کے پہاڑ تھے' فرماتے تھے اب قویٰ جواب دے رہے ہیں' کام کرنے کی قوت نہیں' مگر میں نے اپنے آپ کو نظم اوقات کا ایسا خوگر و عادی بنا لیا ہے کہ خواہ طبیعت کیسی ہی مضمحل ہو اور کسل اور ماندگی کا غلبہ ہو' مگر میں ہمت کر کے وقت کا حق ادا کر لیتا ہوں۔ الحمد للہ نظام الاوقات کی برکت سے تمام کام انجام دے رہا ہوں۔

ایک بار فرمایا کہ وقت کا حق ادا کرنا چاہئے۔ اپنے معمولات میں ناغہ نہ ہونے دے' اگر پورا معمول ادا نہ ہو سکے تب بھی معمولات کے لئے جو وقت رکھا گیا ہے اس میں حاضری ضرور لگوانی چاہئے' مثلاً اگر پوری تسبیح پڑھنے کی فرصت یا ہمت نہیں تو ۳۳ بار پڑھ لو' یہ بھی نہ ہو سکے تو گیارہ بار پڑھ لو اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو تین بار ہی پڑھ لو' مگر وقت پر حاضری ضرور لگوالو۔

ایک بار فرمایا کہ بعض اوقات کھڑا ہو کر نماز پڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی' سر چکراتا ہے' مگر میں نفس کو یوں سمجھا لیتا ہوں کہ آج تو کھڑے ہونے کی طاقت ہے' کل ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم کھڑے ہو کر نماز پڑھنا چاہو' مگر کھڑے ہونے کی طاقت ہی سلب کر لی جائے' آج طاقت تو ہے' اس کو غنیمت سمجھو۔ چنانچہ مرض الوفات سے پہلے ضعف و پیرانہ سالی اور عوارض کے باوجود حضرت والاؒ نہ صرف فرائض کھڑے ہو کر پڑھتے تھے

بلکہ سنن ونوافل میں بھی اس کی کوشش کرتے، بعض اوقات دو آدمی پکڑ کر مشکل سے کھڑا کرتے، لیکن نماز شروع کردینے کے بعد نہ معلوم کہاں سے قوت آجاتی کہ پوری نماز بغیر کسی تکلف کے قیام اور رکوع وسجود کے ساتھ ادا فرماتے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب واقعۃً "عارف باللہ" تھے۔ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ایسا نکتہ معرفت پیدا فرمالیتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی، ایک مرتبہ نماز میں امام کو سہو ہوگیا، مجمع زیادہ تھا۔ نماز میں کچھ گڑبڑ ہوگئی، لوگ حسب عادت امام کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگے، حضرتؒ نے فرمایا بھئی! کیا ہوا، اللہ تعالیٰ نے ہم پر انعام فرمایا، ہمیں دو مزید سجدوں (سجدۂ سہو) کی توفیق ہوگئی۔ اور ہمیں اپنا مزید قرب نصیب فرمادیا، جب کبھی نماز میں سہو ہوجاتا ہے مجھے حضرت کا یہ ارشاد یاد آجاتا ہے اور اس تصور سے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب مزید کے ذریعہ ہماری بھول کے تدارک کا انتظام فرمادیا ہے، سجدۂ سہو میں لذت محسوس ہونے لگی ہے۔

حضرتؒ کے ایک ہمسائے کسی موقع پر حضرتؒ کو قبرستان لے گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک پختہ قبر ایسی تھی جو ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہوگئی تھی، میں نے گھوم پھر کر حضرت ڈاکٹر صاحب کو اس قبر پر لا کھڑا کیا، دراصل میں اس قبر کے بارے میں حضرتؒ کے تاثرات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آپ دیر تک اس قبر پر کھڑے رہے، جب واپس لوٹنے لگے تو فرمایا صاحب قبر کو قبر کی پختگی پسند نہ تھی، وہ شکستگی چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قبر کو شکستہ کرکے ان کی مراد پوری فرمادی۔

حضرت کی وفات سے بیس روز قبل ۸ر مارچ کو مولانا محمد زبیر صاحب زید مجدہم (حضرت شیخ قطب الاقطاب مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ مجاز) عمرہ پر جانے لگے، حضرتؒ کی خدمت میں دعا طلبی کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ روضۂ اقدس پر ہماری طرف سے شہیدیؒ کا یہ شعر پڑھ دینا:

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھوں
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

اور حج وعمرہ پر جانے والے کے لئے ایک دعائیہ شعر یہ سنایا:

غم بے مائیگی، شرم گناہ، بے تابیٔ ہجراں
یہ سارا قافلہ منزل بہ منزل لے کے آیا ہوں

حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک بار سحری کے وقت دعا کر رہا تھا۔ یکایک خیال آیا کہ میرے یہ چھوٹے سے ننھے منے ہاتھ کس کے آگے پھیلے ہوئے ہیں' رب العرش العظیم کے سامنے' مجھے اپنی اس خوش بختی پر رشک آیا' اور یوں محسوس ہوا کہ سارا عالم میرے ہاتھوں کے نیچے ہے۔

اپنے چھوٹوں اور خوردوں پر کس کو شفقت نہیں ہوتی؟ لیکن بلا مبالغہ حضرتؒ اقدس ڈاکٹر صاحبؒ پر

"بسیار خوباں دیدہ ام امّا تو چیزے دیگری"

کا مضمون صادق آتا تھا۔ ہر شخص کے ساتھ ایسی محبت و شفقت فرماتے کہ اس کو یہ خیال ہوتا کہ حضرتؒ سب سے زیادہ شفقت مجھ ہی پر فرماتے ہیں۔ ۲۳ر مارچ کی شام کو مغرب سے آدھ گھنٹہ پہلے یہ ناکارہ حضرتؒ مولانا محمد یوسف صاحب متالا مدظلہٗ اور مولانا محمد یحییٰ مدنی زید مجدہٗ کی معیت میں در دولت پر حاضر ہوا' مولانا متالا صاحب آپ سے حضرتؒ شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے وہ مکاتیب حاصل کرنا چاہتے تھے' جو حضرت شیخؒ نے آپ کے نام تحریر فرمائے تھے' میں نے مولانا متالا صاحب کا دو لفظوں میں تعارف کرایا کہ یہ حضرتؒ شیخؒ کے خلیفہ ہیں اور حضرتؒ کے مکاتیب مرتب فرما رہے ہیں۔ اور مولانا نے مدعا عرض کیا تو فرمایا:

"وہ تو میں نے مولوی تقی کو دے دیئے ہیں' ان سے لے لئے جائیں"۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت حکیم الامتؒ کے جو مکاتیب شریفہ حضرتؒ کے پاس ہیں' میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے فوٹو لے لوں' فرمایا' وہ رفعت صاحب لے گئے ہیں وہ ان کو چھاپ رہے ہیں۔

یہ چند منٹ کی زیارت تھی' اس ناکارہ کو کیا خبر تھی کہ یہی آخری زیارت و ملاقات ہے۔ اٹھتے ہوئے حضرتؒ نے مولانا متالا صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:

بیارید گر ایں جا است سخن دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اور پھر اس ناکارہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

"الحمد للہ! ہمیں یہ ایک سخن دان مل گئے ہیں"۔

یہ آخری الفاظ تھے جو اس نابکار نے حضرتؒ کی زبان مبارک سے سنے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب ایک آوارہ و نابکار کے ساتھ حضرتؒ کی شفقت و عنایت کا یہ عالم تھا۔ تو اپنے مخصوص خدام واحباب کے ساتھ حضرتؒ کی عنایتوں اور شفقت کا کیا رنگ ہوگا۔

حیف کہ در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضراز آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حضرت اقدس کو حق تعالیٰ شانہ، نے دعا کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا، آپؒ کے مواعظ شریفہ میں بھی دعا کا مضمون بہ کثرت آتا تھا، فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا مانگنے کا سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ اور ہم اپنے عزیز و اقارب اور اپنے احباب کا نام لے لے کر دعائیں کیا کرتے ہیں، مخصوص احباب سے فرماتے کہ آپ میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا نام لیکر دعا نہ کرتے ہوں۔

حضرتؒ کی ایک خاص دعا یہ تھی کہ یا اللہ! میں اپنے اہل و عیال اور گھر والوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا، مجھے ایسے مرض میں مبتلا نہ فرمائیے کہ میرے متعلقین مجھ سے اکتا جائیں۔ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے ایسی قبول فرمائی کہ وفات سے تین روز پہلے تک آپ باقاعدہ مطب تشریف لے جاتے رہے اور کسی کو آپ کی ایسی خدمت کی نوبت نہیں آئی۔

حضرت کی آخری علالت (مرض الوفات) کا آغاز ۲۳ر مارچ اتوار کو ہوا۔ صبح ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ پیٹ میں چبھن ہو رہی ہے، اس کے باوجود حسب معمول ساڑھے آٹھ بجے مطب تشریف لے گئے۔ اور بارہ بجے واپس گھر لوٹے۔ آج دارالعلوم کورنگی میں بخاری شریف کا ختم تھا، حضرتؒ کے وہاں تشریف لے جانے کا نظام تھا، پہلے تو ارادہ فرمایا کہ وہاں جانا ملتوی کردیا جائے۔ لیکن پھر ہمت کرکے اس تکلیف کے باوجود وہاں تشریف لے گئے۔

وہاں جاتے ہوئے تکلیف مزید بڑھ گئی۔ جاتے ہی لیٹ گئے' اور پھر تقریب میں شرکت کئے بغیر واپس تشریف لے آئے' تکلیف کے ازالے کے لئے تدبیریں کی گئیں لیکن کوئی خاص نفع نہیں ہوا' رات میں ڈاکٹروں کو بلایا گیا اور انہوں نے انجکشن وغیرہ لگائے' رات اسی طرح بے چینی کی سی کیفیت میں گذری' ڈاکٹری علاج سے درد کو کچھ سکون ہوا تو نئی کیفیت یہ پیدا ہوگئی کہ اشتہا بالکل ساقط ہوگئی' متلی اور ابکائی بڑی شدت سے ہونے لگی۔ جس سے ضعف ونقاہت میں اضافہ ہوگیا تا آنکہ غنودگی کی سی کیفیت ہوگئی۔

حضرتؒ کی تاکید اور وصیت تھی کہ آپ کو ہسپتال نہ لے جایا جائے گھر پر ہی جو علاج معالجہ کرنا ہو کیا جائے بلکہ یہاں تک فرمادیا تھا کہ اگر تم لوگوں سے میری تکلیف برداشت نہ ہوسکے تو کمرے کے دروازے بند کرکے باہر بیٹھ جانا' مگر مجھے ہسپتال نہ لے جانا۔ اس لئے پیر اور منگل دو دن گھر پر ہی علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹری رپورٹ منگائی تو وہ اطمینان بخش تھی لیکن ضعف ونقاہت میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا۔ اجابت اور پیشاب کا تقاضا بھی نہیں ہورہا تھا۔ دوسرے دن رپورٹ منگوائی گئی تو معلوم ہوا کہ پہلی رپورٹ بالکل غلط تھی۔ گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور یوریا تشویشناک حد تک بڑھ چکا ہے اور اب تک پہلی رپورٹ کی روشنی میں غلط علاج ہوتا رہا۔ مولانا رومیؒ نے یہ فرمایا تھا کہ:

ع "چوں قضا آید طبیب' ابلہ شود"

لیکن یہاں "طبیب ابلہ شود" سے پہلے "مشین ابلہ شود" کا تجربہ ہورہا تھا۔ جس طرح انسان کے دماغ کی مشین اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ اور وہ قضاء وقدر کے فیصلوں کے سامنے معطل ہوجاتی ہے اسی طرح لوہے کی مشینیں بھی ارادۂ "کن" کے تابع ہیں۔ اور قضاء وقدر کے فیصلے ان پر بھی نافذ ہیں۔ بہرحال بدھ کی صبح ڈاکٹروں کے شدید اصرار پر حضرتؒ کو ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرتؒ پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ حضرت کو جب اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا تو شدت سے انکار فرمایا کہ ہم ہسپتال نہیں جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹروں کا اصرار اور متعلقین کا جذبۂ خیر خواہی حضرتؒ کے انکار پر غالب رہا۔ یہ بے چارے سمجھتے رہے کہ حضرتؒ کی جان بچانے میں شاید کامیاب ہوجائیں

گے' اور گھر پر رکھا گیا تو حسرت رہ جائے گی کہ اگر ہسپتال لے چلتے تو شاید کوئی تدبیر ہوسکتی' بہرحال حضرتؒ کے شدید انکار کے باوجود آپ کو مرتضیٰ ہسپتال (ناظم آباد) میں داخل کروایا گیا۔ وہاں تدبیر شروع ہوئی اور بحمد اللہ حضرتؒ کو طبیعت میں کچھ سکون محسوس ہوا۔ ڈاکٹر اور معالج بھی مطمئن تھے کہ ان شاء اللہ مرض پر قابو پالیا جائے گا' عشاء کے بعد دس بجے حضرتؒ نے صاحبزادگان کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ تمہاری آپا (حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا) پریشان ہوں گی' جاؤ ان کو تسلی دو' اور ان کا خیال رکھنا' سب کو فی امان اللہ کہا .... ان حضرات کے تشریف لے جانے کے کچھ دیر بعد سوء تنفس شروع ہوا۔ اور اس میں رفتہ رفتہ شدت ہونے لگی' بارہ بجے کے قریب ڈاکٹروں کو اطلاع دی گئی' اور ڈاکٹر حافظ محمد الیاس صاحب کو (ہمدرد کے منیجر اور حضرتؒ کے خلیفہ مجاز) جو ابتدائے مرض ہی سے تیمارداری اور معالجہ کا بہت ہی اہتمام کر رہے تھے' بلایا گیا' ڈاکٹروں نے مشین کے ذریعہ بلغم وغیرہ کا اخراج کیا اور آکسیجن دی۔ تین بجے تک سوء تنفس کی شدت جاتی رہی۔ تین بجے ڈاکٹر الیاس صاحب آپ سے رخصت ہوکر اپنے گھر تشریف لے گئے' لیکن سوء تنفس میں کمی کے ساتھ بتدریج حضرتؒ کی آواز پست ہوتی گئی' لیکن حضرتؒ کے ہوش وحواس آخر تک قائم رہے' اسی حالت میں فجر کی اذان کی آواز آئی' حضرتؒ کے لب مبارک اس کے جواب میں حرکت کرتے رہے' ادھر اذان کا جواب ختم ہوا ادھر طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرتؒ نے دارالعلوم کورنگی میں حضرتؒ مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے قریب دفن کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ اڑھائی بجے سہ پہر جنازہ گھر سے اٹھایا گیا۔ ساڑھے چار بجے نماز جنازہ دارالعلوم کے احاطہ میں ہوئی' جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی' نماز جنازہ مولانا محمد تقی عثمانی نے پڑھائی۔ جنازے میں عوام سے زیادہ خواص کا مجمع تھا۔ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق اور ان کی معیت میں جناب گورنر جہانداد صاحب کو بھی حضرتؒ کے جنازے میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی .... نماز عصر سے پہلے اشک بار آنکھوں کے ساتھ آپ کو مفتی محمد شفیعؒ صاحب کے پہلو میں دفن کیا گیا .... نور اللہ مرقدہٗ۔

حضرتؒ کے وصال کے وقت "بینات" تیاری کے مراحل میں تھا' احباب کا تقاضا تھا کہ پرچہ میں تاخیر ہورہی ہے۔ اس لئے حضرتؒ پر کچھ لکھ دوں' مگر یہ ناکارہ دل کڑا رہا ہے

شکستہ جمع کرنے میں مصروف تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھوں، بالآخر چار و ناچار دل پر جبر کرکے چند بے ربط باتیں لکھ دیں۔ یہ ناکارہ شعر و سخن سے بے بہرہ ہے ورنہ جی چاہتا تھا کہ حضرتؒ کا پُردرد مرثیہ لکھوں، حضرتؒ کی "صہبائے سخن" میں چند اشعار نظر پڑے تو ایسا لگا کہ حضرتؒ اپنا مرثیہ بھی خود ہی لکھ گئے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

محفل سوز وگداز غم کو گرمائے گا کون
اہل دل کو اپنے درد دل سے تڑپائے گا کون

موجزن ہے کس کے دل میں آتش سیال غم
مستیٔ خون جگر آنکھوں سے برسائے گا کون

کس پہ طاری ہے جنون عشق کی وارفتگی
یوں زبان پر والہانہ رازِ دل لائے گا کون

عارفیؔ میرا ہی دل ہے محرم ناز ونیاز
بعد میرے راز حسن وعشق سمجھائے گا کون

....

یاد آجاتی ہے رہ رہ کر وہ چشم مست ناز
گریۂ عالم رہا تو ہوش میں آئے گا کون

آخر میں "بینات" کے باتوفیق قارئین سے التماس ہے کہ جہاں تک ہوسکے، حضرتؒ کے ایصال ثواب کے لئے اہتمام فرمائیں کہ حضرت سے محبت و تعلق کا یہی تقاضا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا
ومولانا محمد وآلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

(بینات شعبان ۱۴۰۶ھ مطابق مئی ۱۹۸۶ء)

حضرت مولانا قاضی عبد القادرؒ

۶ر شعبان المعظم ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۶ر اپریل ۱۹۸۶ء بروز چہار شنبہ صبح نو بجے تبلیغی جماعت کے رکن رکین حضرت مولانا قاضی عبد القادر صاحب (جھاوریاں ضلع سرگودھا) واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم قطب العالم حضرت اقدس شاہ عبد القادر رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفۂ مجاز تھے' ان کے وصال کے بعد قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی (قدس سرہٗ) سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ حضرت شیخ نوّر اللہ مرقدہٗ کے اسفار کے انتظام وانصرام میں مرحوم سب سے زیادہ دخیل ہوتے تھے' حضرت شیخ ؒ کی آپ بیتی میں بیسیوں جگہ ان کا ذکر خیر آیا ہے۔

مرحوم کے دیگر کمالات وخصائص میں ان کا سب سے بڑا وصف کثرت ذکر اور معمولات کی پابندی تھا۔ صحبت صالحین اور ذکر الٰہی کے انوار ان کے چہرہ پر جگمگاتے تھے۔ وفات سے ایک روز قبل حضرت رائے پوریؒ کے جانشین' حضرت اقدس مولانا حافظ عبد العزیز صاحب رائے پوری (جو آج کل لاہور میں بسلسلۂ علالت مقیم ہیں) سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ بدھ کے دن مرحوم کا قصد حضرت مولانا کی زیارت کرتے ہوئے لاہور سے اپنے گاؤں جھاوریاں جانے کا تھا' گاڑی میں سامان سفر رکھا جاچکا تھا' اور آپ نے وضو شروع کیا تھا کہ دل کی تکلیف شروع ہوئی۔ اور مرحوم سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ تین بجے کے قریب جنازہ رائے ونڈ لایا گیا۔ اور حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب نے (جو مولانا مفتی احمد الرحمٰن کی معیت میں امتحان کے لئے رائے ونڈ تشریف لے گئے تھے) نماز جنازہ پڑھائی۔ حق تعالیٰ شانہٗ مرحوم کی بال بال مغفرت فرماکر رحمت ورضوان کے درجات عالیہ نصیب فرمائے۔ اور مرحوم کے تمام لواحقین' محبین' منتسبین کو اس سانحۂ کبریٰ پر صبر جمیل نصیب فرمائے۔

(بینات رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ مطابق جون ۱۹۸۶ء

حضرت مولانا

سید حکیم محمد ایوب مظاہری سہانپوریؒ

سہارنپور میں حضرت مولانا سید حکیم محمد ایوب رحمہ اللہ تعالیٰ رحلت فرمائے عالم جاودانی ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا خاندان سہارنپور میں شرافت ونجابت میں ممتاز تھا اور اس خاندان کے اکابر کے ابتداء ہی سے مظاہر العلوم کے اکابر سے عقیدت و محبت اور اتحاد و یگانگت کے گہرے روابط تھے۔ اس لئے مرحوم کی تمام تر علمی و عملی تکوین اور تعلیم و تربیت مظاہر علوم میں ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب کہ مظاہر علوم کے در ودیوار حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی رحمہ اللہ' حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی رحمہ اللہ اور دیگر ملک شمائل اور فرشتہ صفت بزرگوں کے انفاس قدسیہ سے جگمگا رہے تھے اور مظاہر علوم ان اکابر کی برکت سے اس عربی شعر کی صحیح تصویر پیش کر رہا تھا:

دار بھا کنّا وکنا نحبھا

اذا الناس ناس والزمان زمان

مرحوم کے والد ماجد مولانا حکیم سید محمد یعقوب صاحب کا حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی رحمہ اللہ سے خصوصی تعلق تھا' اس لئے ابتدائی تعلیم (غالباً شرح جامی تک) انہی سے ہوئی۔ اسی دوران مجدد تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ اور قطب الاقطاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمہ اللہ سے بھی تلمذ ہوا۔ ۳۴ھ سے ۳۸ھ تک مشکوٰۃ شریف تک ساری کتابیں مختلف اکابر سے پڑھیں۔ ۳۹ھ میں صحیح بخاری شریف حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی رحمہ اللہ سے اور دیگر کتب حدیث دیگر اساتذہ کے یہاں ہوئیں۔ دورۂ حدیث کے بعد مختلف علوم وفنون کی تکمیل بھی مظاہر العلوم میں کی۔

بیعت واصلاح کا تعلق اولاً حضرت اقدس سہارنپوری رحمہ اللہ سے قائم کیا۔ ان کے بعد مجدد تبلیغ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس رحمہ اللہ سے اور ان کے بعد قطب الاقطاب حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ سے رہا اور حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب (خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ) سے اجازت بیعت ہوئی۔

حضرت حکیم صاحب مرحوم کی زندگی میں دو چیزیں بہت ہی نمایاں تھیں۔ ایک حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ سے عاشقانہ ووالہانہ تعلق جو یوماً فیوماً بڑھتا ہی گیا اور جس نے بالآخر ان دو خاندانوں کے اتحاد وامتزاج کی شکل اختیار کرلی۔ اور واقعۃً

ع تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کا مضمون صادق آیا۔ اپنے شیخ" سے ایسی والہیت وفدویت اور ایسے اعتماد واتحاد کی مثالیں بہت کمیاب ہیں۔

طبابت مرحوم کا خاندانی فن تھا۔ اس لئے دینی علوم سے فراغ کے بعد انہوں نے دو سال میں اس فن کی بھی تکمیل کی اور معاش کی ظاہری شکل کے لئے مطب کا اشتغال بھی رہا۔ لیکن حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے ارشاد کی تعمیل میں طحاوی شریف کے رجال پر کام شروع کیا۔ اور اسی کو اپنا اصل کام سمجھا۔ اس کے لئے موصوف نے کس قدر محنت وجانفشانی اور جہد مسلسل سے کام لیا! اس کا کچھ اندازہ موصوف کے ان تعارفی کلمات سے ہوسکتا ہے:

"میں جب ۱۳۴۰ھ میں مظاہر علوم سے فارغ ہوگیا تو میرا خیال تھا کہ میں اپنے آبائی اور موروثی مشغلہ طبابت کو اختیار کروں اور اس کے ذریعہ مخلوق خدا کو راحت وآرام پہنچاؤں۔ لیکن میرے استاذ محترم اپنے زمانہ کے نامور عالم دین حضرت مولانا محمد زکریا صاحب زید مجدہ نے مجھے مشورہ دیا کہ تمام اعمال میں سب سے بلند وبالا اور بابرکت مشغلہ علم حدیث کا ہے۔ لہٰذا تم طحاوی شریف سے اپنے مشغلہ علمی کی ابتداء کرو اور رجال طحاوی پر محنت کرو۔ اس کے رواۃ کی تحقیق وتاریخ مفصل طور پر لکھو۔ چنانچہ اٹھارہ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ کو یہ کام میں نے شروع کردیا اور انتہائی تحقیق وتفتیش کے ساتھ اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ہی راوی کی تحقیق

اور تعیین اور ان کے احوال واوصاف معلوم کرنے میں کئی کئی روز
خرچ ہوئے اس طور پر یہ کتاب تیس سال کی شبانہ روز جدوجہد
کے بعد ۱۳۷۱ھ میں مکمل ہوئی"۔

تیس سالہ محنت وکاوش کے بعد تو "رجال طحاوی" کی تسوید ہوئی۔ اس کے بعد مصنف کو اس پر نظرثانی کا خیال آیا..... نظرثانی پر ستائیس سال مزید صرف فرمائے اور اس دوران مزید تحقیقات کا اضافہ ہوتا رہا، موصوف کی یہ ستاون سالہ کاوش چار ضخیم جلدوں میں "تراجم الاحبار من رجال شرح معانی الآثار" کے نام سے شائع ہوئی۔ موصوف کی یہ خدمت جس میں انہوں نے واقعۃً "صبر ایوبی" کا مظاہرہ کیا' بلاشبہ ایک لائق قدر کارنامہ ہے۔

طحاوی شریف ہی کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان خدمت مرحوم نے یہ انجام دی کہ طحاوی شریف کے مطبوعہ نسخوں میں کتابت وطباعت کی بہت سی غلطیاں تھیں جن میں بعض کا تعلق متن سے تھا اور بعض کا سند اور رجال سند سے' ان کی تصحیح فرمائی اور اسے "تصحیح الاغلاط الکتابیۃ الواقعۃ فی النسخ الطحاویۃ" کے نام سے طحاوی شریف کی تقطیع پر شائع فرمایا۔ جس میں قریباً دو ہزار غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔ اس کی اشاعت پر اہل علم نے بے حد مسرت وابتہاج کا اظہار فرمایا اور مصنف کو خراج تحسین پیش کیا۔

اور طحاوی شریف ہی کے سلسلہ میں تیسری خدمت یہ انجام دی کہ طحاوی شریف پر ایک نفیس حاشیہ تحریر فرمایا۔ جس میں درج ذیل امور کا التزام فرمایا:

(۱) مندرجہ بالا تصحیحات کی روشنی میں طحاوی شریف کا صحیح نسخہ مرتب فرمایا۔

(۲) ہر راوی کا مختصر ترجمہ رقم فرمایا اس تصریح کے ساتھ کہ راوی ثقہ ہے یا ضعیف۔ یہ تراجم بیشتر حافظ کی تقریب سے ماخوذ ہیں اور جو تقریب میں نہیں مل سکے ان کے لئے مأخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۳) ہر باب میں امام طحاوی کے قول **فذهب قوم..... وذهب اٰخرون** کی تشریح کی گئی ہے۔

(۴) طحاوی شریف کی ہر حدیث کے بارے میں یہ وضاحت کہ اس کی تخریج مصنف رحمہ اللہ کے علاوہ فلاں فلاں حضرات نے بھی کی ہے۔

(۵) حدیث کے الفاظ غریبہ کی تشریح۔ **وغیر ذالک من الفوائد**

مکتبہ امدادیہ ملتان کے مالک اور جامعہ قاسم العلوم ملتان کے مہتمم و شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ فیض احمد زید مجدہم کو اس "علق ثمین" کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کی اشاعت کے خواہاں ہوئے۔ ۱۳۹۹ھ کے رمضان میں جب یہ ناکارہ اپنے مخدوم و معظم جناب مفتی احمد الرحمٰن زید مجدہم کی معیت میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں اعتکاف کی نیت سے سہارنپور گیا تو طحاوی شریف کا یہ قیمتی نسخہ جو حضرت حکیم صاحب مرحوم کے حواشی سے مزین تھا اور جس میں گویا ان کی پوری زندگی کی علمی و فکری کاوشوں کا نچوڑ تھا۔ ہمارے حوالے کردیا گیا کہ اسے اشاعت کے لئے مولانا فیض احمد صاحب کی خدمت میں پیش کردیں۔ مگر مشکل یہ پیش آئی کہ کتاب کے اوراق نہایت بوسیدہ اور اس پر طرفہ یہ کہ حکیم صاحب کے حواشی کے اطراف وجوانب اور بین السطور ایسے باریک قلم سے لکھے گئے تھے کہ انہیں کسی کاتب کے لئے نقل کرنا تو کجا؟ پڑھنا بھی ممکن نہیں تھا' حق تعالیٰ شانہٗ' مولانا فیض احمد صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ انہوں نے بڑی محنت ومشقت سے پہلے کتاب کے متن اور حواشی کو خوش خط نقل کرنے کا اہتمام فرمایا' اس کے بعد منقولہ نسخہ کاتب کے حوالے کیا۔ ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے بحمد اللہ پہلی جلد شائع ہوئی اور مولانا فیض احمد صاحب نے حضرت حکیم صاحب کی خدمت میں اسے پیش کرنے کے لئے ہندوستان کا سفر کیا۔ دوسری جلد بھی الحمد للہ طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔

کہنے کو تو یہ چھوٹا سا لفظ ہے "حاشیہ طحاوی" لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ یہ کیسی عظیم الشان خدمت ہے جو حق تعالیٰ شانہٗ' نے حضرت حکیم صاحب مرحوم کے لئے مقدر فرمائی تھی۔ اور طلبۂ حدیث پر ان کا یہ کتنا بڑا احسان ہے۔ **فجزاہ اللہ احسن ما یجزی بہ عبادہ الصالحین۔**

طحاوی شریف کے ساتھ مدۃ العمر کے اشتغال اور اس کے رجال کی تحقیق و تفتیش کے نتیجہ میں حضرت مرحوم کو علم اسماء الرجال میں ماہرانہ بصیرت عطا ہوئی۔ مولانا حافظ فیض احمد صاحب مد ظلہم نے ان کے حواشی کا جو نسخہ شائع کیا ہے اس میں موصوف کو بجا طور پر "الشیخ المحدث الامام فی فن اسماء الرجال" کا خطاب دیا ہے۔ فن اسماء الرجال میں موصوف کی حذاقت ومہارت کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت موصوف نے حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی کی شہرہ آفاق کتاب "تہذیب التہذیب" کی بھی تصحیح فرمائی۔ اس میں جو مطبعی

اغلاط تھیں، یا کہیں حافظ رحمہ اللہ سے تسامح ہوا تھا، انہیں تہذیب کے پیش نظر نسخہ پر درج کرتے گئے۔ بعد میں ان تصحیحات کو "**تعقیب التقلیب الواقع فی تہذیب التہذیب**" کے عنوان سے مرتب فرمادیا۔

اسی ضمن میں ایک رسالہ "**الفتح السماوی فی مولد الطحاوی**" کے نام سے امام طحاوی رحمہ اللہ کی تاریخ پیدائش کی تحقیق پر رقم فرمایا۔ جس کا خلاصہ مکتبہ امدادیہ کے مطبوعہ نسخہ کے شروع میں درج ہے۔ الغرض حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے ارشاد کی تعمیل کا ثمرہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ عطا فرمایا کہ ان کی گویا پوری عمر ہی اس حدیثی و علمی اشتغال میں بیت گئی اس جہد مسلسل کے نتیجہ میں انہوں نے جو علمی مآثر چھوڑے ہیں (جن کا اجمالی ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے) وہ انشاء اللہ موصوف کے لئے صدقہ جاریہ ہوں گے۔

ان کی زندگی میں دوسری سب سے نمایاں چیز، ان کا مظاہر علوم سے خادمانہ تعلق تھا، ان کی علمی و عملی اور اخلاقی و اصلاحی تکمیل مظاہر کے ذریعہ ہوئی تھی، ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مظاہر علوم ہی کا فیضان تھا، اور پھر مظاہر ان کے شیخ اول حضرت اقدس سہارنپوری رحمہ اللہ اور شیخ ثانی حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی محبت کا مرکز بھی تھا۔ اس لئے موصوف نے اپنی تمام صلاحیتوں کو گویا مظاہر علوم کے لئے وقف کر رکھا تھا، وہ ایک طویل عرصہ تک مظاہر علوم کے باضابطہ سرپرست بھی رہے، لیکن مظاہر علوم کے ساتھ ان کا اخلاص اور خادمانہ تعلق کسی عہدہ و منصب پر منحصر نہیں تھا۔ بلکہ مظاہر کی خدمت ان کا ذاتی جذبہ تھا جو ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا، اس ناکارہ کے نزدیک مظاہر علوم سے ان کی محبت و وابستگی بھی حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کا ثمرہ تھا۔ اس سلسلہ میں موصوف کے بارے میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے الفاظ آپ بیتی سے نقل کرتا ہوں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں:

> "حکیم ایوب صاحب میرے لئے ابتداء" محب اور انتہاء" محبوب تھے۔ دونوں فقرے معنی دار ہیں۔ ابتداء" محب کا مطلب تو یہ کہ جب میں رجب ۲۸ھ میں سہارنپور آیا تھا تو حکیم ایوب نے مجھ سے ظہر کی نماز سے فراغ پر مسجد کے دروازے سے نکلتے ہوئے سجدۂ سہو کا ایک مسئلہ پوچھا تھا۔ میں لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا،

حکیم جی نے کہا مسئلہ تو مجھے معلوم ہے، میرا کئی مہینوں سے تجھ سے بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی' اس لئے مسئلہ پوچھا۔ میں ہنس پڑا اور ایک دو بات کھڑے کھڑے کی۔ تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔اور دوسرا فقرہ انتہاء" محبوب کا مطلب یہ کہ میرے والد صاحب کے انتقال تک تو حکیم جی کا ہر وقت کا رہنا سہنا کچے گھر ہی کا تھا صرف رات کو عشاء کے بعد اپنے گھر جاتے' صبح آجایا کرتے۔ میرے والد صاحب سے بھی ان کو عشق کے درجہ کی محبت تھی۔ چنانچہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو یہ زنانہ مکان کے دروازے میں غش کھاکر گر گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کو چارپائی پر لٹاکر گھر پہنچایا تھا اور میرے والد صاحب کے انتقال کی پریشانی کے ساتھ حکیم جی کے والد اور تایا کو ان کی فکر پڑگئی تھی۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد یہ مجھ سے منہ موڑ کر حضرت مولانا ثابت علی صاحب کے خصوصی تلمذ میں پہنچ گئے تھے' جس کا مجھے اس وقت بہت قلق ہوا، مگر میں ابتدائی مدرس بھی نہیں ہوا تھا اور یہ حدیث تک پہنچ گئے تھے۔ اگرچہ میرے والد صاحب کے انتقال تک زیادہ تر مجھ سے ہی پڑھتے تھے' اس لئے اور بھی قلق ہوا۔ مگر اب تو پھر ان کی محبوبیت مدرسہ کی وجہ سے عود کر آئی۔ یہ میرے اس رسالہ میں بار بار ظاہر ہو گا کہ مدرسہ کا جو شخص جتنا زیادہ لحاظ رکھتا ہے مجھے اس سے بہت ہی زیادہ محبت بڑھتی رہتی ہے' اور جو ملازم ہوکر مدرسہ کے امور میں تساہل تسامح کرتا ہے مجھے اس سے چاہے کتنی ہی محبت ہو مگر نفرت کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ حکیم جی باوجودیکہ ملازم نہیں ہیں مگر جب سے سرپرست مدرسہ ہوئے ہیں' مدرسہ کے ہر کام کو میرے ذوق کے موافق اپنا کام سمجھتے ہیں' بالخصوص تعمیر کو' توسیع چندہ کی کوشش کو' نظامت کے امور میں مشورہ کو' غرض کسی کام کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ میرا فرض منصبی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر' صحت و قوت عطا فرمائے کہ اب تو ان کی صحت نے بہت جواب دے رکھا ہے"۔

ان دینی ودنیوی اور علمی و عملی مشاغل کے ساتھ حضرت شیخ ؒ کی مجلس میں بلا ناغہ پابندی سے حاضری، نماز تہجد کا التزام، تکبیر اولیٰ کا اہتمام، ذکر وتلاوت اور اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت وغیرہ ان کی زندگی کے وہ پہلو ہیں جو قابل رشک بھی ہیں اور لائق اقتداء بھی۔ ان کی قدرے تفصیل مولانا محمد عاقل صاحب زید مجدہم کے مضمون میں گذشتہ اشاعت میں شائع ہوچکی ہے حق تعالیٰ مرحوم کو رحمت ورضوان کے درجات عالیہ نصیب فرمائیں اور ان کے تمام متعلقین ومنتسبین کو اخلاص وتقویٰ کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

(بینات ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق جولائی ۱۹۸۷ء)

حضرت مولانا نور احمد رحؒ

۲ر جمادی الاخریٰ ۱۴۰۷ھ مطابق یکم فروری ۱۹۸۷ء اتوار کی شب میں حضرت مولانا .... نور احمد صاحب یکایک آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم نہایت زیرک، عاقل ومدبر اور بے پناہ قوت ارادیہ کے حامل تھے۔ مہمات کو سر کرنا ان کا خاص ذوق اور بڑے سے بڑے آدمی کو ہمنوا کرلینے کا انہیں خصوصی ملکہ تھا۔ بے حد فعال تھے، بے تکان کام کئے جانا، شباب سے پیری بلکہ وفات تک ان کا معمول رہا۔

دارالعلوم دیوبند کے نہایت ذہین اور ذکی طالب علم تھے۔ ہمیشہ اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہوتے۔ اسی کے ساتھ اساتذہ سے ربط وضبط اور خدمت ان کا شعار تھا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے خصوصی خادم ومعاون بن گئے اور یہ علاقہ خویشی پر منتج ہوا۔ حضرت مفتی صاحب پاکستان آئے تو قیام دارالعلوم کے سلسلہ کی اہم خدمات مرحوم کے سپرد تھیں۔ وہ ایک عرصہ دارالعلوم کراچی کے ناظم رہے، اس لئے حلقۂ احباب میں وہ "ناظم صاحب" کے لقب ہی سے معروف تھے۔ مرحوم بذات خود ایک تحریک اور ایک ادارہ تھے۔ تحریک پاکستان کے دوران انہوں نے انتھک کام کیا اور بڑوں بڑوں کو تحریک پاکستان کے لئے رام کیا، پاکستان میں سوشلزم کے خلاف تحریک کے روح رواں بھی وہی تھے اور ۱۱۳ علماء کا مشہور فتویٰ مرحوم کی ہی مساعی کا رہین منت تھا۔ برما کی اراکانی تحریک میں ان کا کردار قائدانہ تھا۔ افغانستان کی تحریک جہاد کے وہ رکن رکین تھے۔ مجاہدین کے لئے رقوم کی فراہمی کا اہم ترین شعبہ گویا ان کے سپرد تھا۔ متعدد بار وہ سرحد پار مجاہدین سے تعاون کے لئے بھی گئے۔ زندگی کے آخری دور میں ان پر علوم اسلامیہ کی اشاعت کا جذبہ غالب آیا اور "ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ" کی بنیاد رکھی۔ اس میں بھی ان کی اولوا العزمی اور فعالیت کے جوہر نمایاں ہوئے۔ اپنی رہائش

گاہ کے زیریں حصہ میں پریس نصب کیا اور سب سے پہلے قرآن کریم کی طباعت کا کام شروع کیا اور کئی سائزوں میں قرآن کریم کے خوبصورت نسخے ہزاروں کی تعداد میں شائع کئے، پھر حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے ترجمہ کے ساتھ قرآن کریم مترجم شائع کیا اور اس کے حاشیہ پر شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا خلاصہ تفسیر بیان القرآن، شائع کیا۔ پھر بہترین ٹائپ پر "اعلاء السنن" شائع کی۔ اس کی اشاعت پر راقم الحروف نے ان سے عرض کیا تھا کہ آخری عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں علوم اسلامیہ کی اشاعت کا جذبہ القاء فرمایا ہے .... یہ ان شاء اللہ حسن خاتمہ کی علامت ہے اور اعلاء السنن کی اشاعت ان شاء اللہ آپ کی مغفرت کا سامان ہے، پھر تو انہوں نے مبسوط سرخسی اور مصنف ابن ابی شیبہ جیسی ضخیم کتابیں شائع کرڈالیں۔ جن کے لئے قارون کے خزانے کی ضرورت تھی۔ اسی کے ساتھ الجامع الصغیر، کتاب الاصل، الاشباہ والنظائر مع شرح حموی وضمائم، عنوان الشرف الوافی اور دیگر متعدد کتابیں شائع کیں۔ متعدد کتابیں ابھی زیر طبع تھیں اور متعدد اہم ترین کتابوں کی اشاعت ان کے پیش نظر تھی کہ پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔ مرحوم اپنے حلقۂ احباب میں بھی ہردلعزیز تھے۔ کسی نہ کسی بہانے سے ان سے "دعوت" کی فرمائش رہتی، جنہیں وہ خندہ پیشانی سے پورا بھی فرماتے۔ راقم الحروف ایسے گوشہ نشین وکم آمیز کے ساتھ بھی محبت وشفقت کا برتاؤ فرماتے۔ تین چار سال پہلے کا قصہ ہے ایک دفعہ تشریف لائے اور میرا بازو پکڑ کر کمرے سے باہر الگ لے گئے۔ اور دو ممتاز ترین سرکاری عہدوں کا نام لے کر فرمایا کہ تم کو ان کے بارے میں کہا جائے تو انکار نہ کیجئے اور جب اس ناکارہ نے اس پر زور سے لاحول پڑھا تو نرمانے لگے بس کسی اور سے تذکرہ نہ کیجئے۔

حق تعالیٰ شانہٗ مرحوم کی حسنات کو قبول فرمائیں اور زلات سے درگزر فرماکر ان کے ساتھ رحمت وفضل کا خصوصی معاملہ فرمائیں۔

(بینات ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق جولائی ۱۹۶ء)

شیخ القرا حضرت اقدس

قاری فتح محمد پانی پتی مہاجر مدنی رحؒ

۱۸ر شعبان (سعودی اور ۱۷ر شعبان پاکستان) ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۸۷ء کو شیخ القراء، امام التجوید والقرأت حضرت اقدس مولانا قاری فتح محمد پانی پتی مہاجر مدنی مدینہ طیبہ میں طلوع صبح صادق سے چند منٹ پہلے واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ ہمارے دور میں آیۃ من آیات اللہ تھے۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان کو ایسے خارق عادت اوصاف و کمالات سے نوازا تھا جو صرف نفوس قدسیہ کا حصہ ہیں اور سننے والوں کو ان کے محیرا لعقول کمالات کا باور کرنا بھی مشکل ہے۔

ابھی ڈیڑھ سال کی عمر تھی کہ چیچک کے عارضہ سے آنکھیں جاتی رہیں، لیکن اس کے بدل میں حق تعالیٰ شانہٗ نے بے پناہ قوت حافظہ کی دولت سے نوازا۔ پہلے قرآن کریم حفظ کیا۔ پھر قرأت یاد کیں۔ اسی کے ساتھ درس نظامی کی تکمیل فرمائی اور دارالعلوم..... دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام مدنی ؒ اور دیگر اکابر سے دورۂ حدیث کیا۔

حفظ قرآن میں حق تعالیٰ نے عجیب وغریب کمال عطا فرمایا تھا۔ حافظ کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اول سے آخر تک قرآن کریم اس طرح سنادے کہ اسے کسی جگہ نہ سہو ہو، نہ تشابہ لگے لیکن حفظ قرآن میں حضرت قاری صاحب کا خرق عادت کمال یہ تھا کہ وہ آخر سے اول تک پورا پورا قرآن کریم بے تکلف پڑھ سکتے تھے۔ کبھی آیات کے آخری کلمات مسلسل پڑھتے جاتے اور کبھی ابتدائی کلمات ایک مربوط عبارت کی طرح پڑھتے چلے جاتے۔

قراءات عشرہ مع طرق وروایت کے ایسی ازبر تھیں کہ جس روایت میں جس وقت اور جس حالت میں پڑھنا چاہتے پورا قرآن کریم اسی روایت میں سنادیتے۔ نہ کسی جگہ اشتباہ والتباس کا امکان، نہ کسی موقع پر غور و تامل کی ضرورت۔

فن قرأت اور اس کے متعلقات تمام رسائل وقصائد ایسے یاد تھے کہ ہر قصیدے

کے پورے اشعار، ہر عنوان اور ہر فصل کے اشعار میں سے ایک ایک کا نمبر شمار یاد تھا۔ جس نمبر کا شعر دریافت کیا جاتا فوراً بلا تامل سنا دیتے، ہزاروں احادیث طیبہ، حمد و نعت اور اخلاق و فضائل کی بے شمار نظمیں اور وظائف کے مجموعے، حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی بیان القرآن کے مضامین بھی اسی طرح ازبر تھے۔

ان کے بلاواسطہ و بالواسطہ شاگردوں، مریدوں، عقیدت مندوں کی تعداد بلامبالغہ ہزاروں کی گنتی میں تھی۔ جس سے ایک مرتبہ شناسائی ہوگئی اگر وہ بیس سال کے بعد بھی ملاقات کرے تو اس کی آواز سے فوراً اسے پہچان لیتے تھے۔ الغرض آپ کا خرق عادت حافظہ حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ اور منکرین حدیث کے شبہات کے خلاف برہان قاطع تھا۔ وہ لوگ جو حضرات محدثین کے محیرالعقول حافظہ کے بارے میں شکوک و شبہات کے مریض ہیں انہیں اپنے ہی دور کے اس عجوبۂ قدرت کی صحبت میسر آجاتی تو ان کے مرض تشکیک کا علاج ہوجاتا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت قاری صاحبؒ کے علمی فیضان میں خاص برکت عطا فرمائی تھی۔ بارہ تیرہ سال کے تھے اور ہنوز طالب علمی کا دور تھا کہ استاذ محترم کی نگرانی میں قرآن کریم پڑھانے لگے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تو ہمہ تن قرآن کریم کے ہوکر رہ گئے۔ اور ان کا چشمۂ فیض پورے جوش کے ساتھ ابلنے لگا۔ جس نے بڑھتے بڑھتے دریائے مواج کی شکل اختیار کرلی۔ جس سے نہ صرف پاک وہند کے بنجر علاقے سیراب ہوکر لالہ زار بن گئے بلکہ ان کا فیض حرمین شریفین سے لے کر مغرب کے برفانی علاقوں تک پہنچا۔ حضرت اقدس مولانا قاری رحیم بخش رحمہ اللہ آپ ہی کے تلمیذ شریف تھے۔ جن علاقوں میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی صحیح پڑھنے والا نہیں ملتا تھا وہاں سینکڑوں کی تعداد میں سبعۂ عشرہ کے قاری، اعلیٰ قسم کے مجودین اور مدرّسین پیدا ہوگئے۔ یوں ''پانی پتی'' کا لفظ ضبط و اتقان، تجوید قرآن اور تعلیم قرآن سے عشق و شغف کی علامت بن گیا۔ آج بلامبالغہ سینکڑوں قرآنی مکاتب اور تحفیظ قرآن کریم کے ادارے ہیں جو قاری صاحب کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگردوں نے قائم کررکھے ہیں۔ اور یہ سلسلہ بحمد اللہ روز افزوں ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کا ذوق عبدیت و عبادت عقل و قیاس سے بالاتر تھا جسے ان کی کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس ناکارہ کو اپنی زندگی میں جن خاصان خدا کی زیارت کا

شرف حاصل ہوا ان میں دو بزرگوں کو "اعبد خلق اللہ" پایا ان میں سے ایک حضرت قاری صاحبؒ تھے۔

نماز باجماعت اور تکبیر اولیٰ کا ایسا اہتمام تھا کہ برسوں میں کبھی تکبیر اولیٰ فوت ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ جماعت نکل گئی تو حضرت قاری صاحبؒ دوسری مسجد میں جماعت کی تلاش میں نکل گئے وہاں بھی نہ ملی تو تیسری میں گئے اور جب شہر کی کسی مسجد میں جماعت نہ ملی تو اپنی معذوری کے باوصف باہر دیہات میں نکل گئے اور کسی بے آباد مسجد میں جماعت کرا کے آئے۔

نماز میں مسلسل کئی کئی گھنٹے قیام کرنا حضرت قاری صاحب کے لئے ایک معمول کی بات تھی خصوصاً رمضان المبارک کی راتیں تو گویا قیام فی الصلاۃ ہی کے لئے ہوتی تھیں۔ یہی حال ان کے روزوں کا تھا' ضعف ہے پیرانہ سالی ہے' امراض و عوارض ہیں (آخری نو سال فالج رہا جو علاج معالجہ کے باوجود ٹھیک نہیں ہو سکا اور ان ایام میں گویا مسلسل صاحب فراش رہے) ان تمام امور کے باوجود روزوں کا ایسا شغف کہ صوم دہر کی نذر مان رکھی ہے اور اگر ضعف و عوارض کے حوالے سے روزہ نہ رکھنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے کہ روزے سے مجھے ضعف نہیں ہوتا بلکہ طبیعت اچھی رہتی ہے' قرآن کریم کی تلاوت تو گویا ان کے گوشت پوست اور رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ ہمیشہ زبان مبارک تلاوت سے تر رہتی تھی۔ نمازوں کے بعد تسبیحات فاطمی سبھی لوگ پڑھتے ہیں' لیکن ان میں بہت سے لوگوں کی انگلیاں مشین کی طرح چلتی ہیں۔ حضرت قاری صاحبؒ ان تسبیحات کو اتنے سکون و اطمینان سے پڑھتے تھے کہ عام لوگ اس تاخیر سے اکتا جاتے۔ دعائیں اتنی طویل اور اس طرح گڑگڑا کر کرتے جس پر "من اعطی الدعاء فقد اعطی الاجابۃ" کا مضمون صادق آئے۔ آج سے بیس سال قبل اس ناکارہ نے حضرت قاری صاحبؒ کو منیٰ میں دیکھا کہ جمرۂ اولیٰ کی رمی کے بعد رو بقبلہ دعا کر رہے تھے' اس ناکارہ نے اپنے رفقاء کے ساتھ جمرۂ اولیٰ کی رمی' اس کے بعد اپنی ہمت و بساط کے مطابق دعا کی' دوسرے جمرہ پر پہنچے' وہاں رمی اور دعا سے فارغ ہو کر تیسرے پر پہنچے۔ وہاں رمی کر کے واپس لوٹے تو حضرت قاری صاحبؒ بدستور جمرۂ اولیٰ میں دعا میں مشغول تھے اور ہمارے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ وہ کب سے دعا میں مشغول ہوں گے؟ اور ہمارے جانے کے بعد کب فارغ ہوئے ہوں گے؟ یہ راقم الحروف نے صرف

ایک دن کا مشاہدہ ذکر کیا ہے ورنہ حضرت قاری صاحبؒ کے یہاں تو شب و روز یہی معمول رہتا ہے۔ عقل حیران ہے کہ آخر وہ بھی گوشت پوست کے انسان تھے لیکن عبادت میں ان کے اندر یہ مافوق العادت قوت کہاں سے آجاتی تھی جس کو نہ کلال تھا نہ ملال۔ نہ تھکن کی شکایت۔ حضرت قاری صاحبؒ کے معمولات عبادت کم از کم اس ناکارہ کی عقل و فہم سے تو بالا تھے اور اگر حضرت قاری صاحبؒ کو نہ دیکھا ہوتا تو ان کو محض سن کر مان لینا بڑا مشکل تھا' اس لئے یہ ناکارہ حضرتؒ کے ذوق عبادت کو کرامت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ علم قرأت' فن تجوید اور ان سے متعلقہ علوم کے بلا مدافعت امام تھے۔ جہاں ان کے اخلاص و تقویٰ کی بدولت ان علوم میں ان کا تدریسی و تعلیمی فیض جاری ہوا۔ وہاں ان علوم کی تشریح و تفصیل میں ساڑھے تین ہزار صفحات کا تصنیفی سرمایہ بھی چھوڑ گئے۔ جس کے ذریعہ متقدمین کی کتابوں کو زندہ فرمادیا۔ عنایات رحمانی شرح حرز الامانی (شاطبیہ) (تین ضخیم جلدوں میں)۔ عمدۃ المبانی تکملہ عنایت رحمانی۔ القرۃ المرضیہ شرح الدرۃ المفتیہ شرح الوجوہ المسفرہ' شرح مقدمہ جزریہ' مفتاح الکمال شرح تحفۃ الاطفال' اسہل الموارد' سراج الغایات فی عد الآیات' کاشف العسیر شرح ناظمۃ الزہر وغیرہ ان کی یادگار تصانیف ہیں۔ اگر حضرت قاری صاحبؒ کے فن قرأت سے متعلق تعلیمی و تدریسی اور تصنیفی خدمات کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھا جائے تو انہیں بے تکلف "ان علوم کا مجدد" کہا جاسکتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنی رحمت کے شایان شان ان کے درجات بلند فرمائیں۔ ان کے صدقات جاریہ مین مزید برکتیں فرمائیں اور ان کی برکت سے ان کے تمام منتسبین و محبین کے ساتھ بھی عفو و فضل کا معاملہ فرمائیں۔

(بینات ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق جولائی ۱۹۸۷ء)

حافظ جی حضورؒ

۹ر رمضان المبارک (اور بنگلہ کی رویت کے مطابق ۸ر رمضان المبارک) ۱۴۰۷ھ مطابق ۷ مئی ۱۹۸۷ کو بنگلہ دیش کی بزرگ ترین شخصیت چل بسی۔ .... یہ حضرت مولانا محمد اللہ صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت تھی۔ جو "بنگلہ دیش" میں عام طور سے...... "حافظ جی حضور" کے لقب سے معروف تھے اور ان کا یہ لقب ان کے نام پر غالب آگیا تھا۔

حضرت مرحوم، دارالعلوم دیوبند کے دور قدیم کے فضلاء میں سے تھے (وفات کے وقت سن مبارک نوے سے متجاوز تھا) حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے اجلہ خلفاء میں تھے۔ مرحوم کی حیات مبارک تعلیم وتدریس علوم دینیہ کی خدمت واشاعت، اصلاح وارشاد، وعظ و تبلیغ اور دینی وملی تحریکات سے عبارت تھی، بنگلہ دیش میں سو سے زیادہ قرآن کریم اور علوم دینیہ کے مکاتب جاری فرمائے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے انہیں جرأت واستقلال اور ہمت وعزیمت کے جوہر سے نوازا تھا۔ تین سال قبل، قبیل رمضان یہ ناکارہ بنگلہ دیش گیا تھا تو حضرتؒ کی زیارت سے بھی مشرف ہوا۔ اور ان کے مدرسہ میں ان کے ساتھ کھانے میں شرکت کی سعادت بھی میسر آئی۔ ثقل سماعت کے عارضہ سے بات سننے میں تکلف ہوتا تھا اور پیرانہ سالی وضعف کے آثار بھی جسم مبارک پر نمایاں تھے۔ لیکن ہمت وعزیمت اس وقت بھی لائق رشک تھی۔ انہیں نماز پڑھتے ہوئے بھی دیکھا اور خوب دیکھا۔ چہرۂ مبارک سے تواضع، عبدیت، اور معصومیت ٹپکتی تھی۔ اس ناکارہ کا احساس یہ ہے کہ حضرت حافظ جی حضورؒ اگرچہ طبعی عمر پاکر رخصت ہوئے لیکن جس وقت وہ تشریف لے گئے بنگلہ دیش میں ان کا کوئی بدل نہیں تھا۔ حق تعالیٰ شانہٗ ان کے بہت ہی درجات بلند فرمائیں اور امت اسلامیہ کو ان کی رحلت سے جو نقصان پہنچا ہے اپنی رحمت وفضل سے اس کا تدارک فرمائیں

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ صفوۃ البریۃ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

(بینات ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق جولائی ۱۹۸۷ء)

صدر شہید غازی جنرل محمد ضیاء الحق رحمۃ اللہ علیہ

حق تعالیٰ شانہ' کے اسرار و حکمت کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ "ولا یحیطون بشیئی من علمه الا بما شاء"۔ اب اس بھید کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ اہل پاکستان کے لئے اس بار سن ہجری کا آغاز ایک عظیم ملی و قومی حادثہ کے ساتھ ہوا' ۳ر محرم الحرام ۱۴۰۹ھ ر ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو شام چار بجے بہاول پور کے قریب پاکستان فضائیہ کے خصوصی طیارہ "سی۔۱۳۰" کو حادثہ پیش آیا جس کے نتیجہ میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق سمیت قریباً تیس اعلیٰ فوجی افسران جاں بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل عندہٗ باجلٍ مسمًّی۔

صدر محمد ضیاء الحق شہید بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ حق تعالیٰ شانہ' نے ان کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کے بعض اوصاف وملکات تو ایسے تھے کہ زاہدان شب زندہ دار بھی ان پر رشک کیا کریں۔ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بے پناہ عشق و محبت تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک پر ان کی آنکھوں کو اشک ہائے عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ تاہم ان کا یہ جوہر اس وقت پوری طرح کھل جاتا جب انہیں بارگاہ عالی میں حاضری کی سعادت نصیب ہوتی جس کے وہ خوگرفتہ ہوگئے تھے۔ رات دس بجے مسجد نبوی کے دروازے معمولاً بند کردیئے جاتے ہیں۔ صدر شہید کو اس وقت شرف حضوری حاصل ہوتا وہ خلوت میں راز ونیاز کی بہاریں لوٹتے۔ اور تنہائی میں سلام کے گلہائے عقیدت نثار کرتے۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ اس وقت ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہوتا اور وہ اسی بے خودی و محویت کے عالم میں ساری ساری رات مواجہہ شریفہ پر کھڑے کھڑے گذاردیتے۔

وہ سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے گویا زبان حال و قال سے عرض کرتے:

ماں فقیراں آمدہ در کوئے تو
شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما
جاں فدا بردست وبرابروئے تو

ان کی یہی کیفیت حرم کعبہ میں ہوتی تھی۔ فرماتے تھے کہ میں حرمین شریفین میں بیٹری چارج کرنے کے لئے جاتا ہوں۔

انہیں قرآن کریم سے بھی والہانہ شغف تھا۔ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود تلاوت قرآن کے معمول کو قضا نہ ہونے دیتے۔ قرآن کریم کا نسخہ سفرو حضر میں ان کے ساتھ رہتا اور وہ کسی حال میں بھی مصحف شریف کی رفاقت سے محروم نہ رہتے۔

وہ صبح سے رات کے ایک دو بجے تک کار مملکت میں مشغول رہتے' لیکن اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کی اعصاب شکن مصروفیت کے باوجود ان کی تہجد کی نماز قضا نہ ہوتی جس کے وہ بچپن سے عادی چلے آتے تھے۔ وہ نماز باجماعت کا شدت سے اہتمام کرتے تھے اور کوئی بڑی سے بڑی مصروفیت بھی ادائے صلاۃ کے فریضہ میں حائل نہ ہوتی تھی۔

انہیں اسلام کی حقانیت پر غیر متزلزل ایمان تھا۔ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے لئے تشریف لے گئے تو خطاب سے پہلے حسب معمول قاری صاحب سے ...... جنہیں وہ ساتھ لے کر گئے تھے تلاوت کرائی اور پھر ایک گھنٹہ تک اسلام کی حقانیت پر جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ اس طرح موصوف نے بین الاقوامی ادارے میں عالمی برادری کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کا منفرد اعزاز حاصل کیا۔ وطن عزیز میں شرعی حدود کا جزوی نفاذ ہوا تو دور جدید کی غیر مہذب دنیا نے ان سزاؤں کو .... نعوذ باللہ ...... وحشیانہ قرار دے کر اپنی عقل ودانش کا مذاق اڑایا۔ صدر شہید نے ایک غیور مسلمان کی طرح ان اعتراضات کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

مرحوم کا ایک امتیازی وصف ان کا حلم وصبر تھا۔ حق تعالیٰ شانہ' نے ان کو بے پناہ قوت برداشت عطا فرمائی تھی۔ اور وہ حلم ووقار اور متانت ورزانت کا پہاڑ تھے۔ ان کے بارے میں مخالفین نے گفتنی وناگفتنی سبھی کچھ کہا' جائز وناجائز تنقید کے تیروں سے ان کی

عزت ووقار کو چھلنی کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ کبھی اس سے چیں بہ جبیں نہیں ہوئے اور نہ ناقدین کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔ وہ کلوخ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی نہیں تھے' گویا شیخ سعدیؒ کا یہ حکیمانہ قول ان کی سرشت میں داخل تھا اور ان کی طبیعت ثانیہ بن چکا تھا۔ ؎

دریائے فراواں نہ شود تیرہ بسنگ
عارف کہ برنجد تنک آب است ہنوز

لوگوں نے ان کے حلم وحوصلہ اور ان کی قوت برداشت کو کمزوری پر محمول کرنے کی بار بار غلطی کی اور ان کے خلاف شور وغوغا برپا کرنے کی بارہا کوششیں کیں لیکن شور وغوغا کا تلاطم ان کی بلند ہمتی' عالی حوصلگی اور وسعت ظرف کی چٹانوں سے ٹکرا کر ہمیشہ پاش پاش ہوتا رہا اور انہیں اپنی جگہ سے جنبش دینے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ ان تمام چیزوں کو خاموشی سے ہضم کرجاتے اور ان کی مہر سکوت ان کی وسعت ظرف کا پتہ دیتی تھی۔ ؎

کہہ رہا تھا شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے وہ اس قدر خاموش ہے

ہندوستان کے نوجوان وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی اور ان سے قبل ان کی والدہ مسز اندرا گاندھی کی جذباتیت کے طفیل ہند وپاک کے درمیان جنگ کے خطرات سر پر منڈلاتے رہے۔ لیکن شہید صدر کے حلم وبردباری نے ہمیشہ اس جذباتیت کا توڑ کیا اور گیارہ سال تک پاک بھارت جنگ کے سامنے اپنے صبر وتحمل اور حلم ووقار کا بند باندھے رکھا۔ ہندوستان کے معمولی سرکاری اہل کاروں سے لے کر وزیر اعظم تک پاکستان پر الزامات واتہامات لگاتے رہے۔ لیکن جواب میں شہید صدر نے کبھی ہندوستان پر الزام تراشی نہیں کی۔ البتہ کبھی موقع میسر آیا تو ان کے الزامات کا ایسا ٹھنڈا' میٹھا اور معقول جواب دیا کہ ہندوستان کے نیتا اپنی حرکت پر خود شرمندہ ہوگئے۔

حلم ووقار کے ساتھ عجز وانکساری بھی صدر شہید کا ایک نمایاں وصف تھا۔ وہ فوج کے سپہ سالار اعظم اور ملکی انتظامیہ کے صدر نشین تھے۔ معمولی سا بااختیار عہدہ ومنصب

بھی آدمی میں غرور وپندار اور کبر وافتخار پیدا کردیتا ہے۔ لیکن مرحوم بادشاہی میں فقیری کرتے تھے۔ وہ معمولی آدمی سے بھی ایسی خندہ پیشانی اور فروتنی سے ملتے تھے کہ گویا اس کو اپنا آقا سمجھتے ہیں۔ ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی اور کٹر سے کٹر دشمن بھی ان سے ملاقات کرنے کے بعد ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنے ہر ملاقاتی مہمان کو دروازے تک پہنچانے آتے تھے۔ اور بسا اوقات آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ خود کھول دیتے تھے۔ اس فقیر کی یہ شان قلندری کسی صدر مملکت اور چیف آف آرمی اسٹاف میں تو کجا؟ آج کے کسی درویش میں بھی کم دیکھنے میں آئے گی۔ ان کی تواضع کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ ہمارے مخدوم مولانا مفتی ولی حسن صاحب نے ان سے بالمشافہ فرمایا کہ اب آپ داڑھی رکھ لیجئے۔ تو بہت ہی بشاشت کے ساتھ فرمایا کہ ہاں! یہ میری کمزوری ہے۔ دعا کیجئے کہ مجھے اس سنت رسول ؐ کی توفیق ہو جائے۔

یہ امر بجائے خود حیرت افزا ہے کہ وہ جس قدر نرم خو' خندہ رو اور سبک روح واقع ہوئے تھے' اپنے ارادہ وعزم میں اسی قدر پختہ تھے۔ وہ استخارہ واستشارہ کے بعد جب کسی امر کا عزم کرلیتے تھے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ان کو اپنے ارادے کے تبدیل کرنے یا اس میں لچک پیدا کرنے پر آمادہ نہیں کرسکتی تھی۔

قرآن کریم کے ارشاد: فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ

"پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیجئے۔"

پر ان کا ٹھیک عمل تھا۔ ان کے ارادے کی تکمیل کے راستے میں نہ کوئی طمع حائل ہوتی تھی اور نہ کسی طاقت کا خوف واندیشہ اور دھمکی آڑے آتی تھی۔

روس نے اپنی فوجیں ہمارے ہمسایہ اسلامی ملک افغانستان میں اتاریں تو صدر شہید نے محسوس کیا کہ افغانستان' جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور سے اسلامی ملک چلا آرہا ہے' اس پر روسی دہریت کا تسلط نہ صرف عالم اسلام کی غیرت کے لئے چیلنج ہے بلکہ خود پاکستان کے لئے بھی خطرہ کا الارم ہے۔ اگر افغانستان میں روس کو پاؤں جمانے میں کامیابی ہوئی تو اسکا اگلا نشانہ پاکستان ہوگا۔ مرحوم نے فہم وتدبر سے کام لیتے ہوئے روسی افواج کو وہیں سے پسپا کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے افغان مہاجرین کو خوش آمدید کہا۔ مجاہدین افغانستان کی ہمت افزائی کی۔ افغانستان کی آزادی کا علم بلند کیا اور بظاہر ایک سپر طاقت سے ٹکرانے کا خطرہ مول لیا۔ ایک طرف

روس کی عفریتی طاقت تھی اور دوسری طرف روس کا حلیف ہندوستان تھا۔ جو لوگ حقائق کے نتائج کو ظاہری ظروف واحوال کے فیتے سے ناپنے کے عادی ہیں وہ محسوس کررہے تھے کہ پاکستان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جائے گا۔ ان لوگوں نے شہید صدر کی اس پالیسی کو جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ لیکن یہ تمام خطرات صدر شہید کے آہنی عزم میں لچک پیدا نہیں کرسکے' انہوں نے پہلے دن جو عزم کیا تھا کہ روسی افواج کو افغانستان سے واپس جانا چاہئے' اس پر ہمالیہ کی طرح ڈٹے رہے' اور اس کے لئے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کردیں۔ بین الاقوامی سطح پر اپنے مؤقف کی صداقت کو اجاگر کیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے مرحوم کے عزم میں برکت ڈالی اور روس جیسی دنیا کی بڑی طاقت کو مرحوم کے عزم کے سامنے سپر ڈالنا پڑی۔

خود ہمارے ملک کے سیاسی لیڈروں کی ایک کھیپ یہ سمجھتی تھی کہ ضیاء الحق پرائے پھٹے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہا ہے اور افغان قضیہ میں مداخلت کرکے بلاوجہ ایک سپر طاقت سے ٹکرانے کی حماقت کررہا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے...... اور نہ یہ جاننے کی صلاحیت رکھتے تھے ...... کہ اسلام اور وطن کا یہ جیالا اور بہادر سپاہی افغانستان کی نہیں بلکہ عالم اسلام اور پاکستان کی جنگ لڑ رہا ہے۔ خدانخواستہ روس افغانستان میں اپنی حرص وآز کے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہوجاتا تو پاکستان میں جو بلامبالغہ آج بھی عالم اسلام کی آبرو ہے سمرقند وبخارا کی تاریخ دہرائی جاتی۔

اس شہید اسلام اور شہید وطن کے حسن تدبر اور آہنی عزم وارادہ کو ہزاروں سلام! کہ اس نے کسی صلہ' ستائش کی پرواہ کئے بغیر کفر کی طاغوتی طاقت کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا اور روسی جارحیت کو واپسی پر مجبور کردیا۔ یہ مرحوم کے توکل علی اللہ ' ان کے حسن تدبر اور ان کی ہمت وحوصلہ کی صرف ایک مثال ہے' ورنہ انہوں نے تاریخ عالم میں اپنے فہم وتدبر اور مضبوط عزم وارادہ کا ایک مستقل باب رقم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نہ صرف اسلامی دنیا اپنا محسن رہنما سمجھتی تھی بلکہ بین الاقوامی برادری بھی ان کے فہم وفراست اور حسن تدبر کا لوہا مانتی تھی۔

مرحوم' وطن عزیز میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے کوشاں تھے۔ اور یہی ان کی آخری حسرت اور آخری تمنا تھی' اس کے لئے انہوں نے اہم اقدامات بھی کئے۔ ہمیں ان سے ہمیشہ یہ شکایت رہی (جس کا اظہار اس سیاہ کار کے قلم سے گذشتہ گیارہ برس

مسلسل ہوتا رہا) کہ اسلامی قانون کے نفاذ کو جس انداز سے اور جس رفتار سے آگے بڑھایا جا رہا ہے وہ خوش آئند نہیں۔ لیکن ہم بھی اس سے بے خبر نہیں تھے کہ ان کی سست روی اور سبک رفتاری کے بڑے گہرے اسباب ہیں اور ان کے سامنے مشکلات کا پہاڑ ہے' کوئی کوتاہ ہمت ہوتا تو ان مشکلات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا اور اسلامی قانون کے نفاذ کے ارادے ہی سے دستکش ہو جاتا۔ لیکن مرحوم' اس کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتے تھے۔ وہ ہمت واستقلال کے ساتھ مشکلات کے پہاڑ کی چوٹی سر کرنے اور فرہاد کی طرح اس پہاڑ کو کاٹنے میں لگے رہے۔ وہ مشکلات سے نہ تو گھبرائے اور نہ مایوس ہوئے۔ بالآخر وہ ان مشکلات پر ایک حد تک قابو پانے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے نفاذ شریعت آرڈی نینس جاری کر دیا۔ اس پر بھی بہت سے سیاسی حضرات نے ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے ان کی کردار کشی کو اپنا فریضہ سمجھا۔ ان کی نیت اور ان کے اخلاص پر حملے کئے۔ اور اس آرڈی نینس کو ایک لغو اور مہمل چیز قرار دیا مگر یہ چیز کسی کو نظر نہ آئی کہ ضیاء الحق نے اسلامی قانون کا بیج کتنی سنگلاخ زمین میں بویا ہے اور اس کے ناہموار ٹیلوں کو ہموار کرنے میں اس شخص نے کتنی اعصاب شکن محنت کی ہے .... نفاذ شریعت آرڈی نینس کے بعد توقع ہو گئی تھی کہ مرحوم موجودہ قوانین کی جگہ اسلامی قوانین لا کر ہی دم لیں گے خواہ وہ اس کام کو اپنے مزاج کے مطابق تدریجاً ہی کریں' مگر آہ! کہ

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

لیکن ان شاء اللہ یہ کام اب ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچ کر رہے گا' کیونکہ مشکلات کا دریا عبور کیا جا چکا ہے اور اسلامی قانون کے لئے ایک مضبوط بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اب صرف تعمیر و تشکیل اور تکمیل کا کام باقی رہ گیا ہے۔ گو مرحوم کے بعد اب کوئی ایسا شخص برسر اقتدار آتا نظر نہیں آتا جو مرحوم کی سی لگن' ان کے سے جذبہ واخلاص کے ساتھ محض رضائے الٰہی کے لئے اس کام کو اپنا نصب العین بنا لے اور اس عمارت کی تکمیل کر دے جس کی بنیادیں صدر شہید کے ہاتھوں رکھی جا چکی ہیں۔ تاہم حق تعالیٰ شانہٗ کو قدرت ہے وہ جب چاہیں اور جس سے چاہیں چوٹی کے بالوں سے پکڑ کر اپنے دین کا یہ کام لے لیں۔ بہرحال پاکستان پر جب بھی اسلامی شریعت کا راج ہو گا صدر جنرل محمد ضیاء الحق شہید اس کے اجر و ثواب میں برابر کے شریک ہوں گے۔

اس ناکارہ نے صدر شہید جنرل محمد ضیاء الحق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ میں انہیں گناہوں سے اور غلطیوں سے معصوم فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہوں یا انہیں خلفائے راشدین کی صف کا آدمی سمجھنے کی غلطی کررہا ہوں۔ نہیں! وہ نہ غلطیوں' کوتاہیوں' اور لغزشوں سے پاک فرشتہ تھے' نہ وہ خلفائے راشدین کی صف میں شامل تھے اور نہ وہ قرون اولیٰ کی یادگار تھے۔ وہ بھی چودھویں صدی اور پندرھویں صدی کے مسلمان تھے۔ ان میں کمزوریاں بھی تھیں' ان سے لغزشیں بھی ہوتی تھیں' لیکن اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود وہ آج کے مسلمانوں میں ممتاز نظر آتے تھے۔ چار سال پہلے دوستوں کی ایک نجی مجلس میں مرحوم کے بارے میں اس ناکارہ سے پوچھا گیا تو میں نے عرض کیا کہ "کسی شخصیت کے جانچنے کے لئے کوئی معیار ہونا چاہئے' جس پر اس کو جانچا اور پرکھا جاسکے' اب اگر آپ کے ذہن میں معیار' حضرات خلفائے راشدین ہیں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) تو ضیاء الحق ان کے مقابلے میں صفر' بلکہ صفر سے بھی نیچے کے درجہ میں ہیں اور اگر معیار ہمارے دور کے سیاسی لیڈر اور سربراہان مملکت ہیں تو میں گزارش کروں گا کہ ساری دنیا کے سربراہان مملکت کو ایک صف میں کھڑا کرو اور پھر انگلی رکھ کر مجھے بتاؤ کہ فلاں صاحب' ہمارے صدر ضیاء الحق سے بہتر ہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک کے سیاسی لیڈروں کو ایک صف میں کھڑا کرو اور پھر نام لے کر بتاؤ کہ اوصاف جہانبانی کے لحاظ سے فلاں سیاسی لیڈر ملک کی سربراہی کے لئے ضیاء الحق سے زیادہ بہتر اور موزوں ہے"۔

الغرض مرحوم بھی اسی دور انحطاط کی پیداوار تھے۔ ان میں بہت سی کمزوریاں بھی تھیں جو دور جدید کے تقریباً ہر آدمی میں پائی جاتی ہیں' ان کی بہت سی باتیں اصلاح طلب تھیں۔ لیکن جہاں تک ہماری نظر ہے۔۔۔ واللہ حسیبہ' ولا ازکی علی اللہ احدًا۔۔۔ اپنی کمزوریوں کے باوصف ان میں خیر کا پہلو غالب تھا اور وہ اسلام کے مخلص' وطن کے سچے وفادار اور وطن وقوم کے سچے خادم تھے۔ اس ناکارہ کے نزدیک تو مرحوم نے امتناع قادیانیت آرڈی نینس جاری کرکے ایک ایسا زریں اور شاندار کارنامہ انجام دیا ہے کہ ان کی مغفرت کے لئے ان شاء اللہ یہی عمل کافی ہے۔ علاوہ ازیں وہ یتیموں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھتے تھے' بیواؤں کی غمخواری کرتے تھے' بیکسوں اور ناتوانوں کو سہارا دیتے تھے' معذوروں اور محتاجوں کی مدد کرتے تھے' غریب غرباء سے ہمدردی رکھتے تھے' شرفاء کی

عزت کرتے تھے، اہل علم وفضل کی قدر کرتے تھے اور یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو رضائے الٰہی کو کھینچنے والی ہیں۔

شہادت کی موت ایک مومن کی سب سے بڑی تمنا بھی ہے اور عند اللہ بہت بڑا اعزاز واکرام بھی۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے اس مخلص بندے کے لئے رتبۂ شہادت مقدر فرما رکھا تھا۔ جس حادثہ میں صدر شہید اور ان کے مسلم رفقاء حق تعالیٰ شانہٗ کے حضور پہنچے ہیں اس کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ کسی دشمن دین وایمان کی سازش اور تخریب کاری کا نتیجہ تھا۔ اگر واقعۃً ان حضرات نے کسی دشمن کے کینہ وعناد کی وجہ سے جام شہادت نوش کیا ہے تب تو ان کا مرتبۂ شہادت پر فائز ہونا ظاہر ہے ورنہ ان کی حادثاتی موت معنوی شہادت ہے۔

صدر شہید جنرل محمد ضیاء الحق کے سانحہ پر جہاں عالم اسلام غم وحزن میں ڈوب گیا وہاں ملحدین ومنافقین نے اس سانحہ پر مسرت کے شادیانے بجائے۔ چنانچہ ایک لادین جماعت کے کارکنوں نے اس پر مٹھائیاں تقسیم کیں، اور رافضی ٹولے نے بہت سے مقامات پر جشن منائے لیکن شاید سب سے زیادہ خوشی کا اظہار قادیانی جماعت نے کیا۔ روزنامہ جسارت کراچی کی اطلاع کے مطابق:

> "قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا طاہر احمد نے صدر ضیاء الحق کے طیارے کو کریش کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کا اعلان کیا ہے۔ مرزا طاہر نے ۱۹ر اگست کو برطانیہ میں قادیانی ہیڈکوارٹر میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ صدر ضیاء الحق کی موت حق وصداقت کا فیصلہ ہے اور جماعت احمدیہ کی فتح کا کھلا نشان ہے۔ مرزا طاہر نے کہا کہ میں نے اپنی ۱۲ر اگست کی تقریر میں واضح طور پر کہا تھا کہ اگر صدر ضیاء الحق نے معصوم احمدیوں پر ظلم وتشدد ختم نہ کیا اور زیادتیاں کرنے سے باز نہ آیا تو خدا اسے پکڑے گا اور خدائی عذاب سے نہ بچ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے لازماً سزا دے گا۔ میری تقریر کے چند روز بعد مولا کی تقدیر ظاہر ہوئی۔ احمدیت کی نصرت کا ایسا نشان ظاہر ہوا جس پر احمدیت ہمیشہ ناز کرے گی۔ مرزا طاہر نے کہا کہ صدر ضیاء الحق کی موت پر اس لئے خوشی ہے کہ احمدیت کی فتح کا کھلا نشان ظاہر ہوا۔ صدر ضیاء الحق قہر

خداوندی کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ میں نے بار بار اسے تنبیہ کی تھی کہ وہ احمدیوں پر ظلم کرنے سے باز آجائے۔ صدر ضیاء کو مہلت دی گئی لیکن اس نے نجات کا راستہ اختیار نہ کیا اور خدا کی ناراضگی کا شکار ہوگیا۔ انہوں نے تمام قادیانیوں کو کہا ہے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں"۔

گویا صدر شہید کی شہادت اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان خط امتیاز ثابت ہوئی اور اس کی وجہ سے اہل ایمان کا ایمان اور اہل کفر کا نفاق کھل کر سامنے آگیا۔

جس طرح نیک لوگوں کا کسی مرحوم شخصیت کے بارے میں کلمۂ الخیر کہنا اس کی مقبولیت عند اللہ کی علامت ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **انتم شهداء الله في الارض** (تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو) اسی طرح کسی کی وفات پر گمراہ اور بے ایمان لوگوں کا خوش ہونا بھی ان شاء اللہ اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ لہٰذا صدر شہیدؒ کے حادثہ پر رافضیوں' قادیانیوں اور لادین عناصر کی طرف سے مسرت کا اظہار بھی صدر شہید کی قبولیت اور رفع درجات کی علامت ہے۔

مسلمانوں کی خوشی سے رنجیدہ ہونا اور مسلمانوں کی مصیبت پر خوش ہونا بدباطن منافقوں کا شیوہ ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

ان تمسسكم حسنة تسؤهم وان تصبكم سيئة يفرحوا بها
وان تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شيئا ان الله بما يعملون محيط

"اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کے لئے موجب رنج ہوتی ہے اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر احاطہ رکھتے ہیں"۔

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جن لوگوں نے اس حادثہ فاجعہ پر شماتت کا اظہار کیا ہے وہ اسلام اور مسلمانوں کے بدترین اور خبیث ترین دشمن ہیں لیکن اللہ تعالیٰ محض اپنے لطف وکرم سے امت اسلامیہ کو ان کے شر سے محفوظ رکھیں گے۔

حق تعالیٰ شانہ صدر شہید' اور دیگر شہید رفقاء کی بال بال مغفرت فرمائیں' ان کی

لغزشوں سے درگذر فرمائیں اور اپنے مقبول و محبوب بندوں کے ساتھ قرب و رضا کے درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔ ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور پاکستان اور عالم اسلام کو ان کا نعم البدل عطا فرمائیں۔

(بینات صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۸ء)

حضرت شیخ الحدیث
مولانا عبد الحق رح اکوڑہ خٹک

سن ہجری کے آغاز میں عالم اسلام کی ایک اور ممتاز ترین شخصیت ہم سے جدا ہوگئی۔ یعنی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے بانی و شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا عبدالحق رحمہ اللہ بروز بدھ ۲۴ر محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ۷ر ستمبر ۱۹۸۸ء کو رحلت فرماگئے...... انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم، قرون اولیٰ کی یادگار تھے۔ ان کا شمار ان علمائے حقانی اور مشائخ ربانی میں ہوتا تھا جن کا وجود زمین اور اہل زمین کے لئے باعث برکت ہے، اور جن کے علم وعمل، اخلاص وللّٰہیت اور طہارت وتقویٰ پر زمانہ فخر کرتا ہے۔ حضرت مرحوم شیخ الاسلام المجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہٗ کے تلمیذ رشید تھے۔ ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کے لائق ترین اور مایۂ ناز استاذ تھے۔ تقسیم کے بعد اپنے آبائی وطن اکوڑہ خٹک میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اور دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی بنیاد رکھی۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کے اخلاص میں برکت فرمائی اور ان کے دارالعلوم کو قبولیت عامہ نصیب فرمائی۔ جس کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں وہ پاکستان کا سب سے بڑا دارالعلوم بن گیا۔ موصوف نے قریباً نصف صدی تک تدریس حدیث کی مسند کو رونق بخشی اور اس عرصہ میں ہزاروں علماء ومشائخ ان کی تربیت سے تیار ہوئے۔

اپنے اخلاق وعادات کے لحاظ سے مرحوم فرشتہ صفت انسان تھے۔ خاموش اور مرنج مرنجاں طبیعت پائی تھی۔ حلم ووقار اور جود وسخا ان کا خاص جوہر تھا۔ خلق خدا کی ہمدردی ونفع رسانی ان کا طبعی ملکہ تھا، وہ اپنے اعلیٰ اوصاف واخلاق اور بزرگانہ کمالات کی وجہ سے عوام وخواص سب کی نظر میں محبوب ومحترم تھے۔

ان کی عوامی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جمعیۃ علمائے اسلام نے ان کو قومی اسمبلی کی نشست کے لئے امیدوار نامزد کردیا۔ وہ ان دنوں

ہسپتال میں تھے اس کے باوجود وہ اپنے جغادری قسم کے حریفوں کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ قومی اسمبلی میں انہوں نے حق کی آواز مسلسل بلند کی جس کی تفصیل ان کے صاحبزادہ گرامی جناب مولانا سمیع الحق صاحب کی کتاب "قومی اسمبلی میں اسلامی معرکہ" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت مرحوم کی وفات سے نہ صرف علم و معرفت کی مسند خالی ہوگئی بلکہ پاکستان ایک باخدا درویش کے انفاس طیبہ، ان کی دعائے سحر گاہی اور ان کے سایۂ برکت سے محروم ہوگیا۔

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے اس مخلص بندے کے ساتھ لطف وکرم اور رحمت و رضوان کا خاص معاملہ فرمائیں اور اپنی شان کریمی کے مطابق انہیں درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔

اللّٰهم اغفرله، وارحمه، وعافه، واعف عنه، اکرم نزله ووسع مدخله، وابدله دارا خیرا من داره، واهلا خیرا من اهله اللهم لاتحرمنا اجره ولاتفتنا بعده۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد وعلی اله واصحابه واتباعه اجمعین۔

(بینات صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۸ء)

حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی رح

۸ر ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۸ر اکتوبر ۱۹۸۸ء شب جمعہ کو حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی ؒ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ؒ نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کاندھلہ کے مشہور علمی خاندان کے چشم وچراغ اور...... حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے نامور فرزند تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے تعلیم کی تکمیل کی۔ قیام پاکستان سے پہلے ڈابھیل میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ تقسیم کے بعد ایک عرصہ تک دارالعلوم ٹنڈو الہ یار (سندھ) میں حدیث وتفسیر کا درس دیا۔ اور اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ان کی جگہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں مسند حدیث کو رونق بخشی۔ اور تادم زیست جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث رہے۔ گویا مرحوم کی پوری زندگی علوم نبوت کی نشرواشاعت اور قال اللہ وقال الرسول کی تدریس میں بسر ہوئی۔

حضرت مرحوم نے کافی عرصہ پہلے کراچی میں ایک دینی درسگاہ بنانے کے لئے جگہ لے رکھی تھی۔ گزشتہ سال جامعہ اشرفیہ ہی کے نام سے وہاں تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ گلستان علوم نبوی کا یہ نونہال اپنے قیام کے دوسرے سال ہی اپنے بانی ومربی کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگیا۔

ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل عندہ باجل مسمیٰ۔

تعلیم وتدریس تو حضرت مرحوم کا صحیح ذوق اور اصل جوہر تھا۔ اس کے علاوہ بھی ملکی وقومی سطح پر ان کی خدمات دین کی سربلندی وسرخ روئی کے لئے وقف تھیں۔ اسی جذبہ سے وہ سابق مجلس شوریٰ، اسلامی نظریاتی کونسل، تعلیمی کمیشن وغیرہ سرکاری اداروں کے ممتاز رکن رہے۔

علوم قرآن پر ان کی خاص نظر تھی۔ ان کے والد ماجد حضرت مولانا محمد ادریس ؒ کی تفسیر معارف القرآن کتب تفسیر میں ایک شان رکھتی ہے۔ اور اس میں مصنف ؒ کا محدثانہ اور متکلمانہ رنگ بہت نمایاں ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ پوری نہیں ہوسکی تھی۔ مولانا مرحوم نے اسی اسلوب وانداز میں اس کی تکمیل فرمائی۔ اور علوم قرآن پر ایک گرانقدر کتاب "منازل القرآن" کے نام سے تالیف فرمائی۔ ان دو کتابوں کے علاوہ اور متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔

حضرت مرحوم علم وفضل اور شرافت ومتانت کا پیکر تھے۔ بڑا صاف ستھرا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ چہرے سے شرافت وسنجیدگی اور نورانیت ومعصومیت ٹپکتی تھی۔ غالبًا دور شباب ہی سے رمضان المبارک میں پوری رات شب بیداری کا معمول تھا جو آخر تک قائم رہا۔

حق تعالیٰ شانہٗ حضرت مرحوم کے درجات بلند فرمائیں۔ ان کے پسماندگان کو اجر وصبر عطا فرمائیں اور علم وفضل کی جو مسند خالی کرگئے ہیں حق تعالیٰ شانہٗ امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائیں۔ آمین

حضرت مولانا محمد ادریس رحؒ میرٹھی

۲۴؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ مطابق ۲؍ فروری ۱۹۸۹ء بروز پنج شنبہ پونے بارہ بجے کے قریب ہمارے معمر ترین بزرگ ماہنامہ بینات کے مدیر مسئول' وفاق المدارس العربیہ کے صدر عالی قدر اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے استاذ حدیث و تفسیر حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ سفر آخرت پر تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کا سن نوے سے متجاوز تھا۔ ان کا شمار امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے قدیم ترین تلامذہ میں تھا۔ فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ امینیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اسی کے ساتھ دارالمصنفین سے بھی تعلق رہا۔ عربیت کا خاص ذوق تھا اور علوم میں استعداد بڑی پختہ تھی۔ دہلی میں السنہ شرقیہ کی تعلیم کے لئے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں مولوی فاضل اور منشی فاضل کی تیاری کرائی جاتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہوئے تو یہاں بھی اسی طرز کا ایک ادارہ قائم کیا جس سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔ حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے دارالعلوم کورنگی کی بنیاد رکھی تو وہاں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ برادرم مولانا محمد تقی عثمانی زید مجدہم نے حضرت مرحوم کی اس دور کی کیفیت کا بہت خوبصورت نقشہ کھینچا ہے' مناسب ہوگا کہ اس کا اقتباس یہاں نقل کردیا جائے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "یہ وہ وقت تھا جب ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں دارالعلوم نانک واڑہ کی قدیم عمارت سے حالیہ جدید عمارت میں منتقل ہوا تھا' اس وقت دارالعلوم کے آس پاس نہ کورنگی کی آبادی تھی' نہ اس کا کوئی تصور' دارالعلوم کی زمین جنگلی جھاڑیوں اور ریتیلے ٹیلوں کے درمیان دو پختہ اور ایک زیر تعمیر عمارت پر مشتمل تھی' قریب میں ایک قدیم شرابی گوٹھ کے سوا کوئی آبادی نہ تھی۔ نہ بجلی تھی' نہ پانی' نہ ٹیلیفون اور شہر سے رابطہ کے

لئے بس بھی ایک میل کے فاصلے سے ملتی تھی اور یہ پورا فاصلہ لق ودق صحرا پر مشتمل تھا' مولانا کے لئے ادارہ شرقیہ کی ذمہ داریوں کو یک لخت چھوڑنا ممکن نہیں تھا' اور اس لئے وہ دارالعلوم میں مستقل قیام بھی نہیں فرما سکتے تھے' چنانچہ انہوں نے دارالعلوم میں تدریس کے لئے روزانہ آمد ورفت کا سلسلہ شروع کیا۔ شہر سے روزانہ دو بسیں بدل کر لانڈھی پہنچنا' اور وہاں سے ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ اس طرح پیدل طے کرنا کہ ساتھ کتابیں بھی ہوتیں' اور چونکہ مولانا چائے اور پان کے نہ صرف عادی بلکہ بلانوش تھے اس لئے ساتھ میں چائے کا تھرماس بھی ہوتا' اور پان کا سامان بھی' اور پھر کئی گھنٹے جم کر درس دینا' اور بعد میں اسی طرح شہر واپس جانا اور وہاں جاکر ادارہ شرقیہ کی ذمہ داریاں نبھانا رزہ مرہ کا معمول تھا' جسے دیکھ کر ہم نوجوانوں کو بھی پسینہ آجاتا تھا' اور یہ معمول ایک دو دن یا چند ماہ نہیں' مسلسل چار سال تک جاری رہا' اور اس ساری مشقت کے صلے میں مولانا نے کوئی مالی معاوضہ لینا گوارہ نہیں فرمایا۔

برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب اور احقر کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسی زمانہ میں ہم نے دیوان حماسہ حضرت مولانا سے پڑھا' مولانا بڑے لطیف ادبی مذاق کے حامل تھے' اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے دیوان حماسہ کے درس کی حلاوت ۳۳ سال گزرنے کے بعد قلب وذہن میں اسی طرح تازہ ہے اور دیوان حماسہ کے اشعار ان کے مخصوص انداز و آہنگ اور آواز کی گھن گرج کے ساتھ آج بھی کانوں میں گونجتے ہیں' اور بہت سے اشعار کی تشریحات اور اس کے ذیل میں بتائے ہوئے افادات اس طرح یاد ہیں جیسے کل ہی ان سے یہ درس لیا ہو' درس کی یہ تاثیر بہت کم اساتذہ کے حصے میں آتی ہے کہ طالب علم کو سالہاسال گزرنے پر

بھی اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی نہیں، استاد کا لب ولہجہ بھی مستحضر رہ جائے۔

مولانا اپنے حماسہ کے درس میں الفاظ کی لغوی تحقیق اور نحوی ترکیب کے علاوہ شعر کے مختلف ممکن معانی پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے اور اس کے ذیل میں عربوں کی معاشرت، ان کی تاریخ، ان کے عادات و نفسیات، اور بالخصوص جاہلی اور اسلامی عہد کے درمیان پیدا ہونے والے فرق کی ایسی وضاحت فرماتے کہ طلبہ کے سامنے عرب کی خانہ بدوش اور قبائلی زندگی کا نقشہ کھنچ جاتا۔ جاہلیت کی شاعری میں جو قوت اور ذہنوں کی نفسیاتی کیفیت کا بے ساختہ بیان پایا جاتا ہے، اس سے خود بھی لطف لیتے، اور پڑھنے والے کو اس لطف میں حصہ دار بناتے، چنانچہ اسی وقت سے حماسہ کے بیشتر اشعار جو مولانا سے پڑھے تھے، کسی کوشش کے بغیر از بر یاد ہو گئے تھے، اور آج بھی جب کبھی وہ اشعار پڑھتا ہوں تو مولانا کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

مولانا بڑے بلند آواز بزرگ تھے، دارالعلوم کی درس گاہوں اور دارالاقامہ کے درمیان کافی وسیع و عریض میدان حائل ہے، اور اس وقت اس میدان میں ٹیلوں اور جھاڑیوں کی کثرت تھی، لیکن ہم دارالاقامہ میں بیٹھ کر درسگاہ سے مولانا کی آواز سنا کرتے تھے، اور اس طرح مولانا کی تشریف آوری کی اطلاع ہو جاتی تھی۔

دارالعلوم کے اس دور افتادہ مقام کا، اور اس بے سروسامانی کے دور میں روزانہ شہر سے آکر کئی گھنٹے پڑھانا، یقیناً مولانا کے لئے ایک شدید مجاہدہ سے کم نہ تھا، لیکن مولانا نے یہ مجاہدہ کئی سال جاری رکھا۔ پھر بالآخر حضرت مولانا سید محمد بنوری کے مدرسہ میں جو اب جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے نام سے معروف ہے،

تدریس شروع فرمادی' وہاں پہنچ کر مولانا نے رفتہ رفتہ "ادارہ شرقیہ" کے مشغلہ کو بالکل ختم ہی کردیا' اور ہمہ تن مدرسہ کے ہو کر رہ گئے' بتدریس کے علاوہ مولانا انتظامی امور میں بھی حضرت مولانا بنوری قدس اللہ سرہ کے دست وبازو بنے رہے' اور جب حضرت مولانا نے مدرسہ سے ماہنامہ "بینات" جاری کیا تو اس کے مدیر اور طابع وناشر کی حیثیت سے مولانا ہی کو منتخب فرمایا۔"

حضرت مولانا جیسی بزرگ شخصیت کا وجود ہمارے مدرسے کے لئے خیر وبرکت کا باعث تھا۔ ان کی بعض صفات اس ناکارہ کے لئے ہمیشہ لائق رشک رہیں' ان میں سب سے اہم نماز کی لذت ہے۔ حق تعالیٰ شانہ' نے ان کو نماز کا خاص ذوق نصیب فرمایا تھا۔ انہیں تمام تر ضعف وناتوانی اور معذوری کے باوجود نماز باجماعت اور صف اول کا ایسا اہتمام تھا جس کی مثالیں اکابر اہل علم میں بھی بہت کمیاب ہیں' انہیں مہینوں نہیں بلکہ برسوں تک کبھی مسبوق دیکھنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ صف میں ان کے برابر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا کبھی اتفاق ہوتا تو ایک خاص خنکی اور سکینت کا احساس ہوتا تھا۔ حدیث شریف میں فرمایا ہے:

ان احدکم اذا قام فی الصلاۃ یناجی ربہ' وان ربہ بینہ وبین القبلۃ"۔

"بے شک تم میں سے ایک جب کھڑا ہوتا ہے نماز میں تو اس کے سوا نہیں کہ سرگوشی کرتا ہے اپنے رب سے' اور بے شک اس کا رب اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے"۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ان المصلی یناجی ربہ فلینظر ما یناجیہ بہ (رواہ احمد' مشکوٰۃ ص۸۱)

"بے شک نمازی اپنے پروردگار سے سرگوشی کرتا ہے پس اسے اس چیز کو دیکھنا چاہئے جس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کرتا ہے"۔

نماز میں حضرت مولانا کے قلب کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟ اس کو تو سینوں کے بھید جاننے والا ہی جانتا ہے تاہم دیکھنے والوں کو حضرت مولانا کی نماز میں فانما یناجی ربہ' کی جھلک نظر آتی تھی' وہ نماز کے سجدے میں دعائیں کرنے کے عادی تھے۔ ایک بار راقم

الحروف سے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں فرض نماز کے سجدے میں دعا کا معمول کیوں نہیں۔ اس کی مشہور وجہ کتابوں میں لکھی ہے عرض کی گئی تو بگڑ کر فرمایا: "نہیں جی! حدیث شریف میں دعا کا صاف حکم آیا ہے:

"اقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا الدعاء"۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ ص ۸۴)

"بندے کو اپنے رب کا سب سے زیادہ قرب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے لہٰذا کثرت سے دعا کیا کرو"۔

ایک اور حدیث میں ہے:

واذا سجدتم فاجتھدوا فی الدعاء فانہ قمن ان یستجاب لکم"۔

(نسائی ص ۱۶۸، ج ۱)

"اور جب سجدے میں جاؤ تو دعا میں خوب کوشش کیا کرو، کیونکہ یہ اس لائق ہے کہ اسے قبول کیا جائے"۔

عرض کیا کہ یہ احادیث تو نوافل سے متعلق ہیں ویسے اگر مقتدیوں کو گراں نہ ہو تو فرض میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، اس پر خاموش ہو گئے۔

ایک بار فرمایا کہ مجھے پیشاب کی تکلیف ہو گئی ہے۔ میں نے نماز کے سجدے میں یہ دعا شروع کر دی ہے: "رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین۔" ان شاء اللہ جلد شفا ہو جائے گی۔

نماز کے بعد انہیں سب سے زیادہ شغف حج و عمرہ سے تھا۔ قریباً پچیس تیس سال سے سال میں دو مرتبہ حرمین شریفین کی حاضری کا معمول چلا آتا تھا، ایک بار رمضان المبارک میں عمرہ کے لئے اور دوسری بار حج کے لئے حج و عمرہ کے موسم میں جب تک انہیں ویزا نہ مل جاتا ان پر بے قراری و بے چینی کی کیفیت طاری رہتی۔ وہ دوسری تمام دلچسپیوں کو بھول جاتے اور انہیں کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرنا یا سننا گوارا نہ ہوتا۔ اور جب منظوری کی اطلاع آجاتی تو یکایک ان پر مسرت و شادمانی اور انشراح و انبساط کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جسے ہر شخص ان کے چہرے مہرے سے پہچان سکتا تھا۔ رمضان المبارک میں معمول تھا کہ قبیل مغرب طواف شروع کرتے اور طواف ختم کر کے ملتزم پر افطار کرتے، آخر میں یہ معمول چھوٹ گیا تھا۔ ایک دن ملتزم کے سامنے بڑی حسرت سے فرمایا کہ

پچیس سال سے یہاں روزہ افطار کرنے کا معمول رہا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل احباب کی رائے ہوئی کہ حضرت مولانا کی ناتوانی و کمزوری اب حج کی مشقتوں کی متحمل نہیں، ان کے لئے چند قدم چلنا بھی مشکل ہے، مناسک کے دوران گرجانے اور بے ہوش ہوجانے کی نوبت بھی آئی، اس لئے اس سال حضرت کا ویزا نہ لیا جائے، چنانچہ جب انہیں ویزا نہ ملنے کی اطلاع دی گئی ان پر غم واندوہ اور افسردگی کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگا۔ گذشتہ سال بھی ان کا ویزا نہیں ہوا تھا۔ راقم الحروف کو بلوا کر بہت لجاجت کے انداز میں فرمایا: "مجھے ساتھ لے کر جایئے"۔ حج و عمرہ کے شائقین تو بہت دیکھے ہیں اور بعض خوش نصیبوں کو اس بارگاہ اقدس کی حاضری کا شرف بھی بار بار حاصل ہوتا ہے لیکن بیت اللہ شریف سے عشق اور حج و عمرہ کے لئے سوز و گداز، عشق وانجذاب اور فریفتگی ووالہیت کی جو کیفیت حضرت مولانا میں دیکھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ فرماتے تھے کہ بس دو چیزوں کے لئے زندہ ہوں، ایک حرمین شریفین کی حاضری۔ دوسرے تفسیر وحدیث کا درس۔

حضرت مولانا کی ایک لائق رشک خصوصیت، اپنے کام سے ان کی بے پناہ لگن تھی جو کام ان کے سپرد کیا جاتا، یا جس کام کو وہ اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے اس میں فنائیت کی حد تک ڈوب جانے کے عادی تھے اور جب تک وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جاتا انہیں کسی دوسری طرف متوجہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ عشاق کی اصطلاح میں "ان کے کوچہ میں رقیب کا گذر نہ تھا" اس دوران نہ انہیں کھانے پینے کا ہوش رہتا اور نہ راحت و آرام کا خیال آتا، صحت کے دنوں میں فرماتے تھے کہ "بس چائے اور پان دیئے جاؤ، پھر جتنا چاہو بٹھائے رکھو"۔

اس ناکارہ کی حاضری سے پہلے "بینات" کی ترتیب وادارت کا کام انہی کے سپرد تھا۔ ان کو "بینات" کے کام میں اسی شان سے منہمک دیکھا جب "وفاق المدارس العربیہ" کی تنظیم عمل میں آئی تو حضرت مولانا کو اس کا ناظم مقرر کیا گیا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ حضرت مرحوم ہی کی شخصیت تھی جس نے وفاق کو خون جگر سے سینچ کر پاکستان میں دینی مدارس کے لئے شجرۂ طوبیٰ بنادیا۔ اس ضمن میں ان کے واقعات وسوانح کی ایک تاریخ ہے۔

حضرت مولانا آہنی عزم وارادہ کے مالک تھے۔ ان کے یہاں عزیمت ہی عزیمت تھی

وہ مشکل سے مشکل گھڑی میں بھی رخصت پر عمل کرنے کے قائل نہیں تھے' آخری سالوں میں ان کی جسمانی قوتیں ان کے بلند حوصلہ اور جوان عزم کا ساتھ دینے سے معذور تھیں لیکن وہ اپنے ضعف وناتوانی کی رعایت کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ جس کی وجہ سے ان کے خدام کو بعض اوقات تشویشناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ تم مومن کو تین چیزوں میں سے کسی ایک میں مشغول دیکھو گے وہ یا تو اپنی معاش میں لگا ہوا ہوگا یا عبادت میں مشغول ہوگا یا آرام کررہا ہوگا۔ حضرت مولانا کے لمحات زندگی انہی تین حرفوں کی شرح تھے۔ وہ کام' آرام یا عبادت کے سوا کسی چوتھی چیز میں مشغول نہیں ہوتے تھے' انہیں فضول مجلس آرائی' گپ تراشی اور تبصرہ بازی سے نفرت تھی۔ خصوصاً حرمین شریفین میں ان کا مجاہدہ بہت بڑھ جاتا تھا۔ اور وہ اس سفر کا ایک ایک لمحہ وصول کرنا چاہتے تھے۔ راقم الحروف سے ایک بار فرمایا کہ اس سے قطع نظر کہ یہاں کے اوقات بہت قیمتی ہیں' میں یہ سوچتا ہوں کہ ہم نے اس سفر پر کتنے گرانقدر مصارف برداشت کئے ہیں' ہمارا یہاں کا ایک ایک دن ہزار ہزار روپے میں پڑتا ہے۔ اس قدر گراں مصارف اٹھانے کے بعد ان اوقات کو ضائع کرنا کس قدر افسوس ناک حرکت ہے۔

انہیں حضرت اقدس سیدی وسندی مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ ونور اللہ مرقدہٗ سے والہانہ عقیدت تھی' وہ انہیں اپنے شیخ حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کا آئینہ سمجھتے تھے اور حضرت بنوریؒ کی شخصیت میں انہیں اپنے محبوب شیخ "کا سراپا جھلکتا نظر آتا تھا' انہوں نے حضرت بنوریؒ کی وفات پر "نابغۃ العصر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو بینات کے "بنوری نمبر" میں شامل ہے' اس کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ

میری نظر میں

مدرسہ عربیۃ اسلامیہ سے وابستگی کے ابتدائی کسی سال میں ایک

دن اپنی نشست گاہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ تنہا تشریف فرما تھے میں کسی سلسلہ میں حاضر تھا' سلسلۂ گفتگو تو مجھے یاد نہیں' بہرحال میں نے عرض کیا حضرت میری آپ سے وابستگی کا راز صرف یہ ہے کہ میں آپ کے آئینہ میں اس محبوب ہستی کا عکس دیکھتا ہوں جس سے مجھے انتہائی محبت ہے' حضرت مولانا یہ سن کر خاموش ہوگئے اور حقیقت ہے کہ میں آپ کی بیشتر مجلسوں میں صرف شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی باتیں آپ کی زبان سے سننے کے لئے بیٹھتا تھا' کیونکہ آپ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی باتوں کا ٹیپ ریکارڈ تھے' بالکل اسی انداز اور اسی لب ولہجہ میں بعینہٖ وہی الفاظ نقل فرماتے تھے جو شیخ کی زبان مبارک سے نکلے ہوتے' بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ ہی بول رہے ہیں اور جب تک حضرت مولانا شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی باتیں نقل کرتے رہتے' انتہائی محویت اور کیف وسرور کے عالم میں سنتا رہتا' اور جب آپ کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے تو تکدر کے ساتھ بیٹھا رہتا یا اٹھ کر چلا آتا' اور جب حضرت مولانا مکان سے آہستہ آہستہ تشریف لاتے اور میں دور سے آپ کو دیکھتا تو بالکل ایسا محسوس ہوتا جیسے حضرت شاہ صاحب خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔

اسی تعلق کی بنیاد پر جب مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی نے جامعہ عباسیہ بہاولپور میں تقرر کے بعد ماہانہ رسالہ بینات کی ادارت سے استعفیٰ دیا اور آئندہ رسالہ پر اپنا نام نہ لکھنے پر اصرار کیا تو سوال پیدا ہوا کہ اب "مدیر مسئول" کس کو بنائیں' کیوں کہ مدیر مسئول کے بدلنے سے رسالہ کا ڈیکلریشن بھی بدلوانا پڑتا ہے اور آئے دن ڈیکلریشن نہیں بدلوایا جاسکتا' تو میں نے عرض کیا کہ اگر آپ کسی ایسے شخص کو مدیر مسئول بنانا چاہتے ہیں جس کا فیصلہ یہ ہو کہ میں مدرسہ سے قبرستان ہی جاؤں گا تو میرا نام دیدیجئے۔ چنانچہ جب سے رسالہ کا مدیر مسئول میں ہوں' باوجودیکہ ادارت کا

تمام کام مولانا یوسف صاحب کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ اور عزم صرف حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی دائمی رفاقت کی بنیاد پر ہی تھا جس کا باعث وہی اشتیاق دیدار محبوب اور استماع کلام محبوب تھا مگر افسوس کہ وفات کے مرحلہ پر پہنچ کر میں اس رفاقت کے عزم کو نہ نبھاسکا، وہ چلے گئے اور میں رہ گیا، مگر روزانہ قبر مبارک پر حاضری دیتا ہوں **السلام علیک یا اهل القبور انتم سلفنا** کے بعد **وانا انشاء اللہ بکم لاحقون** اسی امید پر کہتا ہوں کہ اللہ کے فضل وکرم سے آخرت میں پھر یہ رفاقت نصیب ہو۔ باقی یہ عہد بدستور ہے کہ زندگی بھر حضرت مولانا بنوری رحمتہ اللہ علیہ کی یادگار مدرسہ عربیۃ اسلامیہ کو سینے سے لگائے رہوں گا اور مدرسہ کے علاوہ کسی بھی دوسری جگہ کام نہ کروں گا اگر چہ وہاں دنیاوی منافع کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

اپنا یہی عہد میں نے تیسرے سال مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب بانی **ندوۃ المصنفین** دہلی کے سامنے دہرایا تھا جب کہ حضرت مولانا آخری عشرۂ رمضان میں مسجد نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں معتکف تھے اور مفتی عتیق الرحمان صاحب ان سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے اور اطلاع ملنے پر میں بھی حاضر ہوا تھا اور مفتی صاحب نے نہ معلوم کیوں مجھ سے مولانا کے سامنے دریافت کیا "آپ مولانا کے مدرسہ میں مطمئن ہیں؟" تو میں نے عرض کیا۔ "نہ صرف مطمئن بلکہ میں نے حضرت مولانا سے عرض کیا ہے کہ میں مدرسہ عربیۃ سے بس قبرستان ہی جاؤں گا"۔ میرا جواب موصوف نے کچھ عجیب حیرانی سے سنا، اس کے بعد اپنی جگہ پر جابیٹھا"

احسان ناشناسی ہوگی اگر میں یہ ذکر نہ کروں کہ حضرت مولانا مرحوم اس ناکارہ کے عظیم محسن تھے۔ کیونکہ اس ناکارہ کے کراچی آنے کا ذریعہ وہی بنے تھے، یہ ۸۵۔۱۹۸۶ کا قصہ ہے، یہ ناکارہ مدرسہ احیاء العلوم، ماموں کانجن ضلع لائل پور میں مدرس تھا، ان دنوں

ڈاکٹر فضل الرحمان کے فتنۂ تجدد کا غلغلہ تھا' ماہنامہ بینات اس تجدد کے اژدہا کا سر کچلنے کے لئے تابڑ توڑ ضربیں لگا رہا تھا۔ میں نے بھی اس موضوع پر بینات میں شائع شدہ فضل الرحمانی اقتباسات کی مدد سے ایک مقالہ تیار کیا' جس کا عنوان تھا: "ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان کے تحقیقاتی فلسفہ کے بنیادی اصول"۔ اس مقالہ کی دو نقلیں تیار کیں' ایک برادرم مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہٗ مدیر "الحق" کو اشاعت کے لئے بھیج دی' اور دوسری حضرت مولانا مرحوم کی خدمت میں اس نوٹ کے ساتھ بھیجی کہ "اس مقالہ کو بینات میں چھپوانا مطلوب نہیں' چونکہ اس میں بعض نازک مسائل اور نازک تعبیرات آئی ہیں اس لئے اس کو ملاحظہ فرمالیجئے اور جہاں کوئی اصلاح طلب چیز نظر آئے اس کی اصلاح فرما کر اسے واپس کر دیجئے' کسی پرچے میں چھپ جائے گا"۔ میرے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں ہوا کہ یہ مضمون "بینات" میں شائع ہو جائے گا' میں اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ میری تحریر بینات میں شائع ہو سکے۔

مولانا مرحوم نے اس مقالہ کو ملاحظہ فرمایا تو غالباً یہ خیال فرمایا کہ "ایں ہم بچۂ شتر است" حضرت اقدس بنوری نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں انہوں نے نہ جانے کیا کہا کہ چند دن بعد حضرت بنوریؒ کا گرامی نامہ اس ناکارہ کے نام موصول ہوا کہ تمہارا مضمون بینات میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تم رمضان المبارک ہمارے پاس گذارو' اور اگر یہ تعلق مستقل ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔

یہ اس ناکارہ کے بینات سے تعلق کی ابتدا تھی' جس کی تحریک حضرت مولانا مرحوم نے فرمائی اور یہ حضرت مولانا مرحوم کا اس ناکارہ کی گردن پر وہ احسان ہے جس کے تشکر سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔

اس ضمن میں حضرت مولانا مرحوم کے دو کارڈ اس ناکارہ کے پاس محفوظ چلے آئے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد مدیر بینات کی یہ امانت بینات کے سپرد کرتا ہوں۔

از دفتر رسالہ بینات کراچی

۲۵ر اگست ۱۹۶۶ء

محترمی کثر اللہ خیرکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"مقالہ" موصول ہوا(۱) بہت خوب ہے' میں خاص طور پر شکر گذار ہوں اس لئے کہ آپ کے توجہ دلانے کے باوجود(۲) میں "فضل الرحمانیات" کے لئے انتہائی کوشش کے باوجود وقت نہیں نکال سکا تھا' جزاکم اللہ خیرا۔ آپ نے اس ضرورت کو پورا کردیا۔

اب لگے ہاتھوں اتنا اور کیجئے کہ ماہنامہ "فکر و نظر" کے سہ سالہ تمام پرچے سامنے رکھ کر(۳) ایک فہرست بنایئے کہ اب تک ادارہ تحقیقات اسلامی کے اس ترجمان ماہنامہ "فکر و نظر" میں کن کن عنوانات پر کن کن اہل قلم نے خامہ فرسائی کی ہے اور کس کس طریق پر دین کو مسخ کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان رکھئے .... "ادارہ تحقیقات اسلامی کی اسلامی تحقیقات" یا "ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسلامی شاہ کار" یہ فہرست مضمون نگاروں کے نام سے بنایئے مثلاً رفیع اللہ قریشی نے کن کن عنوانات پر مضمون لکھے اور کس طرح مسخ و تحریف کی اور عمر احمد عثمانی نے کن عنوانات پر۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اور نیت یہ رکھئے کہ اللہ تعالیٰ یا تو صحیح معنی میں

---

(۱) مقالہ سے وہی مضمون مراد ہے جس کا اوپر ذکر ہوا' یعنی "ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان کے تحقیقاتی فلسفہ کے بنیادی اصول" یہ مقالہ ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک میں جمادی الاولیٰ ۸۶ھ میں شائع ہوا تھا اور حضرت مولانا مرحوم نے بہت سی پیوند کاری کے ساتھ اسے بینات جمادی الاخریٰ ۸۶ھ کے ضمیمہ کے طور پر شائع کیا تھا۔

(۲) یہ ناکارہ فضل الرحمانی فتنہ کی مؤثر سرکوبی کے لئے حضرت اقدس بنوری رحمہ اللہ کو بھی اور حضرت مولانا محمد ادریس کو بھی خط لکھتا رہتا تھا۔ ان خطوط کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) فکر و نظر ادارہ تحقیقات اسلامی' کا اردو ماہنامہ تھا' میرے پاس ماموں کانجن میں اس کے پرچے کہاں سے آتے؟ میں نے اپنے مقالہ میں فکر و نظر کے حوالے بینات ہی سے نقل کئے تھے۔

اس ادارہ کو اسلامی ادارہ بنادیں (۱) ورنہ اس کو غرق فرمادیں اس لئے کہ آنے والی نسل کے لئے یہ ادارہ انتہائی خطرناک مواد فراہم کررہا ہے۔

آپ کا یہ مضمون رسالہ میں اس طرح شائع ہوگا کہ اس کی سو دو سو کاپیاں رسالہ کے علاوہ پمفلٹ کی شکل میں تیار کرالی جائیں گی۔ اسی طرح مذکورہ بالا مضمون کی اور ان کو حسب ضرورت ملک میں تقسیم کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے لکھئے۔ خاص طور پر اگر فل سکیپ سائز رول دار کاغذ ماموں کانجن میں نہ ملتا ہو تو فوراً لکھئے میں بھیج دوں گا۔

والسلام

خادم محمد ادریس

"از ادارہ ماہنامہ بینات

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی ۵

رجب ۸۶ھ اکتوبر ۶۶ء

عزیز محترم کثر اللہ خیرکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری سن لی ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح آپ کو خادم کے ساتھ بینات کی ادارت کے لئے شریک کار بنا دیا ہے۔

ماہنامہ بینات کے دو مستقل عنوانات اب تک ہم پر قرض ہیں

---

(۱) حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے حضرت مرحوم کی یہ دعا قبول فرمائی، ڈاکٹر فضل الرحمان آنجہانی کو جلد ہی ادارے سے چھٹی مل گئی۔ اس کے بعد اس ادارے کی حالت میں رفتہ رفتہ تبدیلی آئی اور اس نے اچھی اسلامی خدمات انجام دیں۔ اب ادارے میں غلبہ الحمد للہ خوش عقیدہ لوگوں کا ہے۔

جو ہم اب تک ادا نہیں کر سکے (۱) ایک "جواہر حدیث" دوسرے "جواہر قرآن" (لف ونشر غیر مرتب) طے ہوا تھا کہ ہر ماہ چار صفحے ایک عنوان کے لئے اور چار دوسرے عنوان کے لئے آیات قرآن عظیم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب عام معاشرہ کی اصلاح کی غرض سے غیر اہل علم (علماء) طبقہ کی فہم کے معیار سے کیا جائے۔ حسن انتخاب ظاہر ہے ذوق انتخاب پر موقوف ہے۔ میں آپ کو اس کار خیر کے لئے بہت موزوں پاتا ہوں۔

میری درخواست ہے کہ بینات کے ماہانہ ۸ صفحات کے ذمہ دار آپ بن جایئے۔ وقتی تقاضوں کے پیش نظر ایک یا چند آیات اسی طرح ایک یا چند احادیث کا انتخاب فرماکر لکھ دیا کریں کہ محض زاد راہ آخرت کی نیت سے۔

ازراہ کرم بینات کے تین چار ماہ قبل کے شمارے اٹھاکر دیکھئے' جواہر حدیث کے عنوان سے اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

(۱) افسوس ہے یہ قرض اب تک باقی ہے' ماہنامہ "بینات" سے منسلک ہونے کے بعد یہ ناکارہ کوشش کرتا رہا کہ جو حضرات اس کام کے اہل ہیں وہ اس خدمت جلیلہ کو بجا لائیں' لیکن کوئی بزرگ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ میرے حضرت بنوریؒ نے فرمایا کہ جواہر حدیث کی جگہ تم خود ہی ترمذی شریف کے ابواب الزہد کا ترجمہ شروع کردو' لیکن یہ ناکارہ اس کی جرأت نہ کرسکا۔ حضرت بنوریؒ کے وصال کے بعد حضرت اقدس سیدی وسندی قطب الاقطاب مولانا الحاج الحافظ محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں لکھا کہ یہ خدمت کسی پر محول فرمادیں۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ میں تم ہی کو حکم کرتا ہوں؛ چنانچہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے حکم پر اس ناکارہ نے یہ سلسلہ شروع کردیا۔ الحمد للہ ابواب الزہد' ابواب صفۃ القیامۃ' ابواب الجنۃ' اور ابواب صفۃ جہنم مکمل ہوچکے ہیں۔ ان شاء اللہ یہ حصہ الگ کتابی شکل میں بھی آرہا ہے اور اب "ابواب البر والصلۃ" کا سلسلہ شروع ہوگا لیکن شدید خواہش کے باوجود تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کرنے کی یہ ناکارہ اب تک جرأت نہیں کرسکا۔ بعض احباب نے اصرار کیا کہ مسجد میں جو درس قرآن کا سلسلہ جاری ہے' صاف کرکے اسی کو بینات میں دے دیا جائے۔ لیکن اس کی بھی جرأت نہیں ہوئی' اگر کسی واجب الاحترام بزرگ نے حکم فرمادیا ہوتا تو تعمیل حکم واجب ہوجاتی۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

متصل، کبھی پہلے، کبھی بعد، یہ انتخاب مولانا محمد طاسین ناظم مجلس علمی کراچی کے نام سے شائع ہوا ہے، وہی انداز بہت مناسب ہے، مولانا نے بینات کے خادموں سے ناراض ہو کر اس سلسلہ کو بند کردیا ہے۔ میں ہمہ وقت کی مصروفیت کے باوجود اس زاد راہ کے لئے وقت نہ نکال سکا، اور تین چار ماہ سے یہ سلسلہ بند ہے۔ آپ جہاں بھی ہوں، ماموں کانجن یا ملتان یا کراچی یا حرمین شریفین میں (اللہ تعالیٰ آپ کو بلالیں۔ آمین)، یہ عنوان اپنے ذمہ سمجھیں اگر کسی زمانہ میں زیادہ فرصت نصیب ہو تو چند ماہ کے لئے اکٹھا لکھ دیں اور تجزیہ کردیں ورنہ ماہ بماہ بھیجتے رہیں۔

آخر میں پھر بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہوں:

رب اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کی نسبحک کثیرًا ونذکرک کثیرا انک کنت بنا بصیرًا۔

دل کہہ رہا ہے کہ دعا ضرور قبول ہوگی اور جواب آئے گا:

قد اوتیت سؤلک یا ادریس

اللّٰھم تقبل منی انک انت السمیع الدعاء(۱)

والسلام

خادم محمد ادریس

---

(۱) حضرت مولانا مرحوم نے خط کے آغاز اور خاتمہ پر جس دعا کا ذکر فرمایا اور اس کی قبولیت کا جزم ظاہر فرمایا، واقعی اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمالیا۔ یہ خط رجب ۸۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور رجب کے ختم ہوتے ہی یہ ناکارہ یکم شعبان ۸۶ھ کو بینات کی خدمت کے لئے بلالیا گیا۔ ۲۳ سال ہوتے ہیں (شعبان ۸۶ھ سے شعبان ۱۴۰۹ھ تک) کہ حضرت مولانا مرحوم کی اس دعا کی برکت سے بحمد اللہ مشغول ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنی رحمت سے حضرت مولانا مرحوم کی دعا کے طفیل بقیہ زندگی بھی اسی میں صرف کرادیں اور محض اپنے لطف وعنایت سے آخرت میں بھی اپنے ان مخلص بندوں کی رفاقت ومعیت نصیب فرمادیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اس دنیا سے رخصت ہونے والوں کے ساتھ رب کریم کا معاملہ کیا ہوتا ہے؟ اس کو تو وہ علیم وخبیر ہی جانتا ہے لیکن بعض آثار وقرائن اور علامات سے کچھ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کریم مالک نے رحمت وعفو کا معاملہ فرمایا ہوگا۔

حضرت مولانا مرحوم کی وفات بھی اچھی علامات کا مظہر تھی۔ ۲۵ر جمادی الاخریٰ جمعرات کی صبح کو طبیعت زیادہ ناساز تھی۔ اس لئے نماز فجر کے لئے تشریف نہیں لاسکے' گھر ہی پر نماز پڑھی' ڈاکٹر کو بلایا گیا' انہوں نے آرام کا مشورہ دیا' ڈاکٹر کے جانے کے بعد سوا نو بجے جلالین شریف کے درس کے لئے نیچے تشریف لائے اور فرمایا کہ ڈاکٹر نے تو منع کیا تھا مگر میرا جی چاہا کہ سبق پڑھالوں۔ سورۃ المطففین کے نصف 'ان الابرار لفی نعیم' سے آخر سورۃ تک کا درس دیا اور اوپر تشریف لے گئے یہ ان کا آخری درس تھا۔ صحیح مسلم شریف کا ایک سبق باقی تھا جو بعد میں حضرت مولانا مفتی احمد الرحمان صاحب مدظلہ العالی نے پورا کرایا۔ ۱۱ بجے کے قریب غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی' تیمار داروں نے خیال کیا کہ چونکہ رات نیند نہیں ہوسکی تھی اس لئے سونا چاہتے ہیں۔ اسی دوران ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے دیکھ کر فرمایا کہ آخری وقت ہے۔ چنانچہ پونے بارہ بجے روح پرواز کرگئی اور نوے سال کا تھکا ماندہ مسافر آرام سے ابدی نیند سوگیا۔

یاایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیه فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

تجہیز وتکفین کے بعد عصر ومغرب کے درمیان جنازہ زیارت کے لئے دارالحدیث میں رکھا گیا' چہرہ مبارک نہایت روشن اور سفید تھا جو سفید کفن میں بے حد حسین لگ رہا تھا' مغرب کے بعد حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن مدظلہ العالی نے نماز جنازہ پڑھائی اور دارالعلوم کورنگی میں تدفین عمل میں آئی۔

صد شکر کہ آپہنچا لب گور جنازہ
لو بحر محبت کا کنارہ نظر آیا

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے اس مخلص بندے سے رحمت وعنایت کا خاص معاملہ

فرمائیں..... ان کی زلات اور لغزشوں کو معاف فرماکر رحمت ورضوان کے درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔

اللھم ابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولاتفتنا بعدہ۔ ربنااغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا' ربنا انک رؤف رحیم۔ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون' وسلام علی المرسلین' والحمد للّٰہ رب العالمین۔

(بینات شعبان ۱۴۰۹ھ مطابق اپریل ۱۹۸۹ء)

استاذ العلماء

حضرت مولانا محمد شریف کشمیریؒ

۱۱ شوال ۱۴۱۰ھ ۷ مئی ۱۹۹۰ء شب دو شنبہ کو حضرت الاستاذ علامہ کشمیری" نوراللہ مرقدہٗ ـــــ قریباً ۹۰ برس کی عمر میں رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے۔

اناللہ واناالیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کو ' امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری" ' مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی" ' حضرت مولانا شمس الحق افغانی" اور مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی" سے تلمذ تھا ' وہ زمانۂ طالب علمی کے عجیب قصے سنایا کرتے تھے ' جن سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی جوانی کا طویل زمانہ تحصیل علم میں گزارا ' اور ایسی محنت و جانفشانی اور تقشف سے علم حاصل کیا جس کا تصور بھی اس زمانہ میں نہیں کیا جاسکتا۔ فراغت کے بعد سابق ریاست قلات میں نائب وزیر معارف رہے۔ دارالعلوم دیوبند میں درجہ علیا کے استاذ رہے اور ۱۹۵۰ء میں سیدی حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ کے تقاضا پر مدرسہ خیرالمدارس ملتان تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے ان کے چہل سالہ دور تدریس میں مدرسہ پر کئی رنگ آئے اور کئی گئے ' اہتمام کی تین پیڑھیاں بدلیں ' اور دوسری جگہوں سے بڑی بڑی پیشکشیں آئیں مگر ان کی وابستگی ووفاداری میں کوئی تغیر اور انکے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی۔ جن دنوں حضرت مرحوم .. ""معقولات کے امام"" کی حیثیت سے خیرالمدارس میں تشریف لائے تھے ' حسن اتفاق سے یہ سال اس ناکارہ کا (دورۂ حدیث کے بعد) تکمیل کا سال تھا۔ اس لئے معقولات کی کتابوں میں حضرت سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ ان کا انداز تدریس عجیب دلربا اور حلقۂ درس عجیب باغ وبہار ہوتا تھا۔ سبق کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی طلبہ حاضر خدمت ہوجاتے ' کتاب کا ایک نسخہ حضرت کے سامنے رکھ دیا جاتا سبق کی عبارت پڑھی جاتی ' عبارت ختم ہوتی تو

حضرت دیر تک لطیفوں اور چٹکلوں سے محظوظ فرماتے ' اور پھر فرماتے "اب یہ کہتا ہے" یہ فرماکر کتاب کے متعلقہ حصہ کی ایسی تقریر فرماتے کہ پورا سبق وہیں ذہن نشین ہوجاتا۔ پوری کتاب کی تدریس کے دوران انہیں کبھی کتاب دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ انہیں معقولات کی بڑی کتابیں صدرا' شمس بازغہ ' قاضی مبارک اور زواہد ثلثہ وغیرہ نہ صرف مستحضر تھیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حافظوں کی طرح ازبر تھیں۔ کبھی کبھی مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ کتاب کا صرف متن اور حاشیہ ہی نہیں صفحہ نمبر بھی یاد ہونا چاہئے ' ان جیسے شفیق ' سبک روح اور خندہ رو استاذ کم دیکھنے میں آئے ہیں ' ارباب معقولات میں اکثر و بیشتر ایک طرح کا عجب ہوتا ہے۔ چالیس سال پہلے کا سنا ہوا حضرت کا یہ فقرہ آج بھی گویا کانوں میں گونج رہا ہے:

"ابو علی ابن سینا ' جو انسان کو انسان نہیں سمجھتا ' ابو زید دبوسیؒ کے بارے میں یہ کہتا ہے۔"

لیکن حضرت الاستاذ میں عجب و خود پسندی کی جڑ کٹی ہوئی تھی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے سے نہایت لطف و اکرام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور اپنی برتری کا احساس ان کے قریب تک نہیں پھٹکتا تھا۔

حضرت مرحوم صحیح اور حقیقی معنوں میں مدرس تھے۔ اور سارے لنگر توڑ کر انہوں نے اپنے آپ کو لیلائے علم کی مشاطی کے لئے وقف کر لیا تھا ' مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ پنجاب میں صرف دو مدرس ہیں ' مولانا خیر محمد صاحب اور مولانا عبدالخالق ' اور آدھا مدرس میں ہوں۔ اس فقرے کی تفسیر پوچھی گئی تو فرمایا کہ مدرس وہ ہوتا ہے جو ہر علم کی کتاب پڑھا سکے۔

حضرت اقدس مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ سے انہیں والہانہ عقیدت تھی ' ایک بار فرمایا کہ آدمی کو بیعت تو ضرور ہونا چاہئے۔ لیکن حضرت مدنی ؒ کے سوا کس سے بیعت ہوا جائے ' ہمارے حضرت سیدی مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے مرید نہ تھے ' نہ شاگرد ' لیکن حضرت کا احترام اسی طرح کرتے تھے ' جس طرح ایک مخلص و عاشق مرید باصفا اپنے شیخ کا احترام کیا کرتا ہے۔ انہیں اپنے استاد محترم حضرت مولانا شمس الحق افغانی ؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ یہ منظر بہت سے حضرات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اپنے شاگردوں کے سامنے حضرت افغانیؒ کے پاؤں دبا رہے ہیں اور خدام

کی طرح دوسری خدمات بجالا رہے ہیں۔ اس ناکارہ نے دو بزرگوں کو اپنے اساتذہ کے سامنے اس طرح متأدب بیٹھتے دیکھا ہے جس طرح وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے ہوں گے۔ ایک رئیس القراء حضرت اقدس مولانا قاری رحیم بخش پانی پتی کو اپنے شیخ حضرت مولانا قاری فتح محمد پانی پتیؒ کے سامنے' دوسرے حضرت کشمیریؒ کو حضرت افغانیؒ کے سامنے۔

وصال سے قبل حضرت کو دو سانحے ایسے پیش آئے جو تکوینی طور پر گویا آپ کے مراتب علیا کی تکمیل کے موجب ہوئے' پہلا حادثہ' ہوش ربا اور صدمہ جانکاہ یہ پیش آیا کہ آپ کے اکلوتے فرزند ارجمند جناب مولانا محمد مسعود کشمیریؒ نے جہاد افغانستان میں جام شہادت نوش فرمایا۔ چھوٹے چھوٹے چار معصوم بچوں اور بیوہ کو بوڑھے باپ کے حوالے کرکے خلد آشیاں ہوئے۔ حضرت مرحوم کا سن ۸۵ سے متجاوز تھا۔ قوائے طبعی مضمحل ہوچکے تھے' بصارت بھی متأثر ہوچکی تھی۔ ایسے عالم میں یہ حادثہ ایسا روح فرسا تھا کہ مرحوم سے تعزیت کرتے ہوئے بھی دل لرزتا تھا۔ حضرتؒ نے اس حادثہ کو بے پناہ صبر واستقامت سے برداشت فرمایا اور رضا بالقضا کی تصویر بنے رہے' البتہ آنکھوں سے بہنے والی ندیاں زخم جگر کی غمازی کرتی تھیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان العین تدمع والقلب یحزن ولانقول الا ما یرضی ربنا۔

دوسرا سانحہ یہ کہ انہی دنوں حضرت کا نحیف ونزار بدن فالج سے متأثر ہوا' قریباً دو سال اسی حالت میں گزارے۔ تکوینی طور پر یہ دونوں حوادث حضرتؒ کے لئے صبر آزما تھے۔ یہ ناکارہ قبیل رمضان حاضر خدمت ہوا تھا' بڑی رقت طاری تھی' میں نے عرض کیا کہ حضرتؒ نے پہچان بھی لیا؟ نفی میں سرہلایا' ہماری طالب علمی کے زمانے میں حضرتؒ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ "حق تعالیٰ بوڑھے کو کیا عذاب دیں گے' اس کے تمام عوارض تو ختم ہوچکے ہیں' ماہیت من حیث ہی باقی رہ جاتی ہے"۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ لسان غیب خود آپ ہی کے حق میں یہ کہلوا رہی ہے' بہرحال حق تعالیٰ شانہ' کے لطف واحسان اور ان کے عفو وکرم سے یہی توقع ہے کہ ہمارے حضرت الاستاذ کے ساتھ لطف وکرم اور عفو ودرگزر کا معاملہ ہوا ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہ' ان کی بال بال مغفرت فرمائیں اور رحمت ورضوان کے درجات عالیہ ان کو نصیب فرمائیں۔

(بینات ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق جون ۱۹۹۰ء)

بھائی صاحب

(محترم جناب چوہدری عبد الباری مرحوم)

۱۹۹۱ء کا نیا شمسی سال جہاں عالم اسلام کے لئے حوادث و مصائب کے جلو میں طلوع ہوا ہے' وہاں اس ناکارہ کے لئے غم واندوہ اور صدمات **بعضہا فوق بعض** کا پیغام لے کر آیا۔ اس سال کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو اس ناکارہ کے برادر اکبر جناب
چوہدری عبد الباری مرحوم کا ملتان میں انتقال ہوا' دو ہفتے بعد سرزمین عراق امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جارحیت اور وحشیانہ بمباری کا نشانہ بنی' ان مہذب اقوام کی جانب سے' اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل جن کے گھر کی لونڈی ہے' عراقی عوام کی نسل کشی اور انسانیت کے قتل عام کا سلسلہ بغیر کسی توقف کے ایک مہینے سے تادم تحریر جاری ہے' اور جنوری کی آخری تاریخ تھی کہ میرے مخدوم قائد جناب مفتی احمد الرحمٰن ہم سے رخصت ہوگئے۔ گویا نئے سال کا پہلا مہینہ اس ناکارہ کے لئے صدمات کی بارش کا مہینہ رہا۔

بھائی عبد الباری مرحوم بڑی صفات کے آدمی تھے' کریم الطبع اور شریف النفس تھے' صوم وصلاۃ کے پابند' تہجد گزار' ذاکر وشاغل اور متشرع تھے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت وارادت کا تعلق تھا۔ حضرت والد ماجد نور اللہ مرقدہٗ کے جانشین' خاندان کے سربراہ' گاؤں کے نمبردار اور اپنے علاقے کے چیئرمین تھے۔ ان کی تمام تر عزت ووجاہت خلق خدا کی نفع رسانی کے لئے تھی۔ کبر و تعلّی اور مردم آزاری کی بیماری ان کو چھو تک نہیں گئی تھی' وہ لوگوں کی ایذائیں سہتے تھے مگر کسی کو ستانے کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آتا تھا۔ مرحوم نے لوگوں کی بھلائی کے لئے اپنے علاقے میں بہت سے ترقیاتی رفاہی کام کرائے' وہ کوئی کام کرتے تو بعض لوگ اپنی نافہمی کی بنا پر تنقید کرتے، مرحوم اچھے کام پر بجائے ستائش وتعریف کے تنقید کا تحفہ قبول کرتے اور خاموش رہتے۔ ایک دن ان کے ایک عزیز نے تنہائی میں کہا کہ آپ لوگوں کی بھلائی کے کام کرتے ہیں' لوگ بلا وجہ اس پر

نکتہ چینی کرتے ہیں، کم از کم آپ ان کے سامنے وضاحت تو کردیا کیجئے کہ لوگ مطمئن ہوجایا کریں۔ جواب میں بھائی صاحب مرحوم نے فرمایا:

"میں ان کے لئے کرتا ہی نہیں کہ مجھے ان کو مطمئن کرنے کی ضرورت ہو، میں جس کے لئے کرتا ہوں وہ مطمئن ہے، اس کے سامنے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں"۔

رقابت وحسد ایسی بیماریاں ہیں جن سے آدم زادوں کو امان نہیں (الا من حفظہ اللہ) ہمارے دیہات اور شہروں میں خاندانی ولسانی رقابتیں، لڑائی جھگڑے اور فوجداری ومقدمہ بازی جو ایک معمول کی چیز بن گئی ہے اسی بیماری کے آثار وعوارض ہیں، اور دور جدید کی بے ہنگم سیاست نے اس شراب کینہ کو سہ آتشہ کردیا ہے، ہمارے گاؤں میں بھی کچھ لوگ اسی مرض میں مبتلا تھے۔ انہیں بھائی صاحب مرحوم سے رقابت تھی، اور وہ اس کی تسکین کے لئے بھائی صاحب مرحوم کے خلاف مقدمات کی بھرمار کئے رکھتے، بھائی صاحب مرحوم خوش اسلوبی سے ان کو نمٹاتے رہتے، لیکن بھائی صاحب نے حکام بالا تک اچھی رسائی ہونے کے باوجود ان سے کبھی انتقام نہیں لیا، بلکہ ان کی قرار واقعی غلطیوں کو بھی ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے۔ ادھر سے جفا اور ادھر سے وفا ودعا گویا مستقل دو طرفہ شغل تھا، ایک موقع پر بھائی صاحبؒ کے مخلصین نے ان سے شکایت کی کہ یہ لوگ آپ کے خلاف بلا وجہ جھوٹے مقدمات کرتے رہتے ہیں اور آپ ان کی واقعی غلطیوں پر بھی پردہ ڈال دیتے ہیں، آپ بھی ان کے خلاف کوئی مقدمہ کرکے ان کو "اندر" کرائیے تاکہ ان کے مزاج درست ہوجائیں، بھائی صاحب نے جواب میں فرمایا:

"یہ بے وقوف لوگ ہیں مجھے اپنا دشمن سمجھ کر میری مخالفت کرتے ہیں، مگر میں ان کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا بلکہ ان کو بھی اپنے ہی آدمی سمجھتا ہوں، اب میں اپنوں کے خلاف مقدمات کیسے کروں"؟

انہی لوگوں میں سے ایک بڑے صاحب، بھائی صاحب مرحوم کو "مالیانہ" نہیں دیتے تھے، دو تین فصلیں گزر گئیں، بھائی صاحب نے بھی ان سے نہیں مانگا بلکہ سرکاری خزانہ میں اپنے پاس سے جمع کراتے رہے، کسی مجلس میں انہوں نے خود ہی یہ ذکر چھیڑدیا کہ اتنے عرصہ سے میں نے "مالیانہ" آپ کے پاس جمع نہیں کرایا اور آپ نے بھی نہیں

پوچھا' بھائی صاحب مرحوم نے برجستہ ایک شعر پڑھا' جس کا مفہوم یہ تھا کہ ..... "ستمگر! میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تیرے ظلم کی انتہا کہاں ہوتی ہے"

وہ صاحب یہ جواب سن کر نہایت منفعل ہوئے (بھائی صاحب مرحوم کی وفات پر یہی صاحب اس ناکارہ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور بھائی صاحب مرحوم کی شرافت و نجابت کا برملا اعتراف کر رہے تھے،

الغرض ایسے بلند اخلاق آج کل عوام میں تو کیا' خواص میں بھی عنقا ہیں' اس ناکارہ کو مرحوم کی دو باتوں پر ہمیشہ رشک رہا۔ ایک یہ کہ حق تعالیٰ شانہ' نے ان کو حضرت والد ماجد رحمہ اللہ کی خدمت کی جو سعادت بخشی یہ ناکارہ وطن سے دور رہنے کی وجہ سے اس سعادت سے محروم رہا' دوسری چیز بھائی صاحب مرحوم کی کم گوئی کی صفت تھی' جبکہ یہ ناکارہ بسیار گوئی کا ہمیشہ مریض رہا' اس لئے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ سارے بھائیوں نے بولنے کا ٹھیکہ اس روسیاہ کو دے رکھا ہے۔ (مرحوم بڑے بھائی صاحب کے علاوہ اس ناکارہ کے دو چھوٹے بھائی بھی کم گوئی میں مرحوم کے نقش قدم پر ہیں)

بھائی صاحب، مرحوم کے انتقال سے صرف ان کا خاندان ہی ایک شفیق سربراہ سے محروم نہیں ہوا بلکہ پورا گاؤں اور پورا علاقہ اپنے آپ کو یتیم محسوس کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بعد کوئی ایسا شخص تاحال نظر نہیں آتا جو ان کی ذمہ داریوں کو نبھا سکے۔ حق تعالیٰ شانہ' مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائیں۔ ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمائیں اور ان کے پسماندگان کی کفالت و دستگیری فرمائیں۔ باتوفیق قارئین سے التجا ہے کہ میرے مرحوم بھائی کے لئے بھی جہاں تک توفیق ہو ایصال ثواب اور دعائے مغفرت سے دریغ نہ فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد النبی الامی وعلیٰ آلہ اجمعین الی یوم الدین۔

(بینات رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء)

حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن رح

شب پنج شنبہ ۱۴ر رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق ۳۱ر جنوری ۱۹۹۱ء کو بوقت سحر ہمارے محبوب قائد و قافلۂ سالار، جانشین حضرت بنوری رحمہ اللہ جناب مولانا مفتی احمد الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ واصل بحق ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون

فی الجملہ اعتماد مکن بر ثبات دہر
ایں کارخانہ ایست کہ تغییر میکنند

مفتی صاحب مرحوم حق تعالیٰ شانہ، کی خاص عنایات اور الطاف بے پایاں کا مورد رہے۔ وہ ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے اور انہوں نے زہد وقناعت، ورع و تقویٰ اور علم و حلم کی پر کیف فضا میں آنکھ کھولی، ان کے والد گرامی حضرت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری رحمہ اللہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (نور اللہ مرقدہٗ) کے خلیفۂ اجل، بے مثل محدث وفقیہ اور حلم ووقار کا پہاڑ تھے، ان کے اوصاف عالیہ کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے شیخ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا تھا:

> "مولانا مرحوم علوم اسلامیہ و دینیہ اور نقلی و عقلی فنون علم کے جامع ترین عالم تھے۔ اصناف علم وفضل وکمال ان کی شخصیت میں مجتمع تھیں، وہ عالم وعارف تھے، صوفی و محقق اور فقیہ ومحدث تھے. علم اصول وکلام کے ایک ماہر اصولی اور فاضل متکلم تھے، غرض علمی دنیا کے آفتاب وماہتاب تھے۔ کوہ وقار و تمکنت، پیکر حلم ورزانت، مجسم خمول وتواضع اور صلاح وتقویٰ میں یگانۂ روزگار تھے، فطری ملکات میں ان کو ایک نمایاں امتیاز حاصل تھا۔ ریاضت ومجاہدہ کے بغیر طبعی طور پر مرتاض تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو

وہبی اور فطری اخلاق وملکات کے وہ مقامات عالیہ عطا فرمائے تھے کہ ریاضت ومجاہدات کے بعد بھی ان کا حاصل ہو جانا قابل فخر اور وجہ شرف ہے۔ اس علم وفضل اور شرف وکمال کے ساتھ انکسار وتواضع' خاموشی اور کم گوئی ان کی ایک فطری کرامت تھی۔

ان معنوی فضائل ومحاسن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن وجمال کی نعمتوں سے بھی بہرہ مند فرمایا تھا' اپنی قامت رعنا' نازک اور تراشیدہ نقوش' روئے منور اور لطافت ونظافت کے ساتھ وہ جمال وکمال کا ایک پیکر نوری محسوس ہوتے تھے۔

راقم الحروف کو دار العلوم اسلامیہ میں ان کی صحبت ورفاقت کا شرف حاصل رہا اور مرحوم کے قریب سے قریب تر مطالعہ کا موقع نصیب ہوا۔ لیکن ان کے فطری کمالات وفضائل کی وجہ سے ان کے ساتھ میری گرویدگی میں اضافہ ہی ہوتا رہا"۔

(ماہنامہ بینات' رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ ۔ جنوری ۶۶ء)

اس ناکارہ کو بھی حضرت کامل پوری رحمہ اللہ کی زیارت کا شرف طالب علمی کے زمانہ میں حاصل ہوا' باوجودیکہ وہ زمانہ برے بھلے کی تمیز کا نہیں ہوتا۔ (اکابر کے باطنی کمالات کی جوہر شناسی کی دولت تو نہ جب تھی نہ اب ہے) لیکن خوب یاد ہے کہ .... اس بے تمیزی کے دور میں بھی جب حضرت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری رحمہ اللہ کے چہرۂ انور پر نظر پڑتی تو قلب میں ایک خاص بشاشت پیدا ہو جاتی اور حضرت رحمہ اللہ کی رفتار کو دیکھ کر بے ساختہ قرآن کریم کی یہ آیت زبان پر جاری ہو جاتی:

"نورهم يسعىٰ بين ايديهم وبايمانهم"

"یعنی ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑ رہا ہوگا۔"

اہل نظر جانتے ہیں کہ اخلاق ذمیمہ میں سب سے بدتر عیب' عجب وخود پسندی اور کبر ہے' جس کو مصلحین امت "ام الامراض" قرار دیتے ہیں' اسی بنا پر حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر (الحديث)

ترجمہ :- وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی کبر ہو۔

اور ایک روایت میں ہے :

لا یدخل النار احد فی قلبہ مثقال حبہ من خردل من ایمان ولا یدخل الجنۃ احد فی قلبہ حبۃ من خردل من کبر۔

(رواھما مسلم، مشکوٰۃ ص ۴۳۳)

ترجمہ :- کوئی ایسا شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو اور کوئی ایسا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو۔ (نعوذ باللہ منہ)

اس کے برعکس تواضع، جو کبر کی ضد ہے، تمام اخلاق حمیدہ اور اوصاف حسنہ کا منبع ہے۔ حضرت اقدس مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری رحمہ اللہ، فنائیت اور تواضع کے اوج کمال پر فائز تھے جو صدیقین کی شان ہے، ذیل میں "تجلیات رحمانی" سے آپ کے مکتوب گرامی کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے، جس میں آپ کی شان عبدیت وفنائیت صاف جھلکتی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمود رنگونی زید مجدہم (مفتی اعظم برما وخلیفہ مجاز حضرت شیخ قطب العالم مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ) نے آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"آپ نے اصلاح کے متعلق اس ناکارہ کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا ہے، آپ ایک عرصۂ دراز تک سہارنپور قیام فرماچکے ہیں اور اس طویل مدت اقامت میں آپ مجھ ناکارہ کے اطوار اور ناکارگی اور اقوال واعمال کی کوتاہیاں ملاحظہ فرماچکے ہیں، اس کے باوجود بھی آپ جیسا عقلمند اصلاح کے لئے مجھ جیسے ناکارہ آوارہ کی طرف رجوع کرنا چاہے، بے حد تعجب انگیز ہے، اصلاح کے لئے سب سے اول شرط مصلح کا اہل ہونا اور پابند شریعت ہونا لازم اور ضروری ہے، جس سے میں واقعی بے بہرہ ہوں، اور یہ تصنع اور تواضع نہیں، بلکہ خالص اور صاف صاف اظہار واقعہ ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اس کام کے لئے

کسی اہل اور کسی بھلے آدمی کی طرف رجوع فرمادیں جن سے آپ کو دین کا نفع ہو، احقر کی طرف سے یہ مشورہ آپ کو بہت ہی خلوص اور ہمدردی کا ہے، امید ہے کہ آپ اس کو قبول فرماکر اس کی وجہ سے مجھے دعائیں دیں گے اور اگر باوجود میری آوارگی اور ناکارگی اور کوتاہیوں کے آپ میری ہی طرف رجوع فرمانا چاہیں تو احقر کو کچھ عذر نہیں، استخارہ مسنونہ کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرکے کام شروع کردیجئے، مجھ سے جوکچھ خدمت ہوسکے گی اس میں انشاء اللہ تعالیٰ دریغ نہ کروں گا"۔ (تجلیات رحمانی ص ۲۷۱)

میرے مخدوم و معظم جناب مفتی احمد الرحمٰن رحمہ اللہ اسی "بڑے باپ" کے فرزند ارجمند تھے، وہ فطری اوصاف وملکات میں اپنے والد محترم کے وارث و آئینہ دار تھے۔ ان کی رفتار حلم وو قار کا مظہر تھی، ان کی گفتار تواضع وانکسار کی غماز تھی، وہ نفع وایثار میں فائق الاقران تھے، ان کے ان چھپے ہوئے فطری اوصاف وکمالات کو شیخ بنوری (نور اللہ مرقدہٗ) کی نظر انتخاب نے اس وقت تاڑ لیا تھا جبکہ ان کمالات کے ظہور کا ابھی وقت نہیں آیا تھا، چنانچہ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے بطور خاص ان کی تربیت فرمائی، ان کو اپنی فرزندی میں لے کر شرف دامادی بخشا، بالآخر وصال سے ایک سال قبل ان کو حیًا ومیتًا اپنا جانشین مقرر فرمایا (اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب "جانشین بنوری" کی حیثیت سے مفتی صاحب مرحوم کی تقرری عمل میں آئی۔ اس وقت وہ اپنی عمر کی چالیس منزلیں طے کرچکے تھے اور قدرت کی جانب سے ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے لئے یہی عمر موزوں قرار دی گئی ہے) ایک طرف حضرت اقدس بنوری رحمہ اللہ کی بلند وبالا اور عبقری شخصیت اور دوسری طرف جناب مفتی صاحب مرحوم کا نحیف وناتواں وجود، جس کی صلاحیتوں کا اس وقت تک معتد بہ ظہور نہیں ہوا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ان کے خلا کو کیسے پر کریں گے اور ان کی نیابت کی عظیم ذمہ داری سے کیسے عہدہ برا ہوں گے؟ لیکن حضرت بنوری رحمہ اللہ کے بعد جناب مفتی صاحب میں اپنے دونوں بزرگوں کی نسبتیں یکایک ظہور پذیر ہوئیں، اپنے والد گرامی حضرت اقدس مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری رحمہ اللہ کی نسبت جمال اور اپنے شیخ ومربی کی نسبت جلال۔ ان دونوں نسبتوں کی جامعیت نے ان کی شخصیت کو مجمع جمال وجلال اور مرقع محبوبیت بنادیا۔ ہمارے شیخ حضرت عارف باللہ

ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کے بقول: ؎

اے زہے جذب محبت من فدائے خویشتن
حسن افگند است بر عشقم ردائے خویشتن

اپنے دونوں بزرگوں کی نسبت جلال و جمال سے آراستہ ہو کر اور "ردائے حسن" و محبوبیت سے مزین ہو کر جناب مفتی صاحب نے شیخ بنوری رحمہ اللہ کی نیابت کا ایسا حق ادا کیا کہ عقل انگشت بدنداں رہ گئی اور اسے اعتراف "کرامت" کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

حضرت بنوری قدس سرہٗ کے بعد ان کی امانت "جامعۃ العلوم الاسلامیہ" کو بعض ہوشربا اور سنگین حالات پیش آئے (جن کی تفصیل غیر ضروری ہے) یہاں تک کہ جامعہ کی تمام رقوم منجمد، ادھر لاکھوں کے ماہانہ مصارف، لیکن جناب مفتی صاحب کی ہمت مردانہ اور قوت توکل علی اللہ کو صد آفرین کہ انہوں نے حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل و کرم سے جامعہ کی آب و تاب اور رعنائی و زیبائی میں ذرا فرق نہ آنے دیا بلکہ اپنے مختصر سے دور نیابت میں جامعہ کو اس قدر ترقی دی کہ آج بحمد اللہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کا یہ صدقہ جاریہ **اصلها ثابت وفرعها فی السماء** کا منظر پیش کر رہا ہے، جناب مفتی صاحب مرحوم نے جامعہ کی متعدد نئی شاخیں بھی قائم فرمائیں، چنانچہ گلشن عمر (سہراب گوٹھ) میں "مدرسہ تعلیم الاسلام" کے نام سے ایک شاخ کا آغاز فرمایا جہاں ایک عظیم الشان مسجد اور مدرسہ کی بہترین عمارت ہے اور اس میں ایک ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اسی طرح ملیر میں ایک صاحب جناب حاجی داد رحیم نے "مدرسہ عربیہ اسلامیہ" کے نام پر چار ایکڑ اراضی وقف فرمائی۔ وہاں بھی خوبصورت مسجد اور شاندار مدرسہ کی تعمیر ہوئی، اب وہاں قریباً ایک ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں (اسی کے ساتھ دس ایکڑ ملحقہ اراضی کا سودا چل رہا تھا اور جناب مفتی صاحب کے اس پر وسیع و عریض منصوبے تھے) اسی طرح ایک شاخ بلال کالونی کورنگی میں، ایک شاخ پاپوش نگر ناظم آباد میں اور ایک شاخ ٹھٹھہ سندھ میں قائم فرمائی، ان تین شاخوں میں بھی مجموعی طور پر ایک ہزار سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

ان شاخوں کی مزید توسیع و ترقی اور مزید شاخیں قائم کر کے حضرت بنوری قدس سرہٗ کے صدقہ جاریہ میں اضافہ کرنا جناب مفتی صاحب کی زندگی کا اہم مشن تھا عجیب بات یہ کہ جامعہ کی ایک شاخ ماریشس میں قائم کی گئی۔ حضرت مفتی صاحب وہاں خود تشریف لے

گئے اور اس شاخ کا باقاعدہ افتتاح فرمایا۔ وہاں آپ کے عزیز شاگرد کام کر رہے ہیں۔

یہ تو "گلشن بنوری" کی ظاہری باغبانی اور حضرت رحمہ اللہ کے صدقہ جاریہ میں ظاہری توسیع و ترقی کا ذکر تھا، جہاں تک "جامعۃ العلوم الاسلامیہ" کی معنویت اور اصل روح کا تعلق ہے بحمد اللہ جناب مفتی صاحب مرحوم نے امکانی حد تک اس کا بھی پورا تحفظ فرمایا۔ میری مراد اخلاص و للّٰہیت، اعتماد علی اللہ اور افتقار الی اللہ سے ہے جو حضرت بنوری نور اللہ مرقدہٗ کا خاص شعار اور ان کے قائم کردہ اس "گلشن علوم نبوت" کی روح رواں تھا۔

راقم الحروف نے سوانح یوسفی میں پڑھا تھا کہ تبلیغی تحریک کے بانی حضرت اقدس مولانا محمد الیاس کاندھلوی ثم دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے بعد جب حضرت جی مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ ان کے جانشین ہوئے تو حضرت شیخ (قطب العالم مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی) نور اللہ مرقدہٗ نے از راہ شفقت اپنے مخصوص لہجے میں آپ سے فرمایا:

"مولوی یوسف! چچا جان کی اور بات تھی، تم ذرا سوچ سمجھ کر خرچ کیا کرو" تو جواب میں حضرت جی مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ نے بے ساختہ عرض کیا:

"بھائی جی! لینے والا ہی تو بدلا ہے، دینے والا تو نہیں بدلا"

حضرت اقدس بنوری رحمہ اللہ کے بارے میں اس ناکارہ نے لکھا تھا:

"انہیں اپنے اللہ پر بڑا اعتماد تھا، بڑا ناز تھا، یقین و توکل ایسا تھا گویا وہ لوح محفوظ سے ابھی ابھی پروانہ لے کر آئے ہیں، انہیں اسباب و وسائل کی پروا نہیں تھی، وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے اور خدا کے بھروسے پر کرتے تھے، حضرت رحمہ اللہ کا یہ فقرہ آج بھی بہت سے لوگوں کے کانوں میں گونج رہا ہو گا کہ:

"زمین و آسمان کے خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں اگر ہم اخلاص کے ساتھ اس کے دین کا کام کریں تو اس کے خزانوں میں کیا کمی ہے؟"۔

وہ جس کام کا ارادہ کرتے اس کے لئے استخارہ کرتے، دعائیں کرتے، غلاف کعبہ پکڑ کر گڑگڑاتے، روضۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

کی جالیوں کے سامنے حق تعالیٰ سے التجائیں کرتے' اہل قلوب سے دعائیں کراتے' معاملہ فہم مخلصین سے مشورے کرتے' ان دعاؤں اور استخاروں کا سلسلہ بسا اوقات مہینوں تک چلتا اور جب پوری طرح اطمینان ہوجاتا کہ اس میں نفسانی خواہش کا کوئی شائبہ نہیں تو توکل برخدا اسے شروع کردیتے اور پھر نتائج سے بے نیاز ہوکر اس پر اپنی ساری توانائیاں صرف کردیتے"۔

(بصائر و عبر ص ۵ ماہنامہ بینات ذوالحجہ ۱۳۹۷ھ - دسمبر ۱۹۷۷ء)

حضرت بنوری رحمہ اللہ کے بعد جناب مفتی صاحب رحمہ اللہ کی طرف جب یہ نسبت منتقل ہوئی تو ان کے اندر توکل و انابت اور رجوع الی اللہ کی جو کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور جس طرح وہ دیر دیر تک کریم داتا کے آگے ہاتھ پھیلائے اور کاسۂ گدائی لئے کھڑے رہا کرتے تھے۔ اس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ بس "لینے والا" ہی بدلا ہے دینے والا نہیں بدلا"۔ نہ لینے والے کا انداز گدا بدلا ہے اور نہ دینے والے کا انداز عطا۔ ان کی طویل طویل دعاؤں پر اس ناکارہ کو ہمیشہ رشک آتا کہ کریم آقا سے مانگنا ہو تو آدمی ایسے مانگے۔اور حرمین شریفین کی حاضری پر (جو سال میں کم سے کم دو مرتبہ التزاماً ہوتی تھی) ان کے سوز دروں اور ان کی دعاؤں کی کمیت وکیفیت میں نمایاں اضافہ ہی ہوجاتا تھا۔ بعض اوقات یہ ناکارہ ان سے مزاحاً" عرض کرتا کہ "مفتی صاحب! آپ اتنی دیر تک کیا مانگتے رہا کرتے ہیں؟" وہ میرے اس مزاحیہ فقرے پر مسکرادیتے' اور ہمارے حضرت بنوری رحمہ اللہ کی یہ خاص ادا کہ جہاں وہ خود بارگاہ صمدیت میں کاسۂ عبدیت اور کشکول فقرواحتیاج پیش کرتے وہاں دیگر اہل قلوب سے بھی دعاؤں کی استدعا فرماتے۔ میرے مخدوم جناب مفتی صاحب رحمہ اللہ نے حضرت کی اس ادا کو بھی خوب خوب اپنایا۔ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہوئے نہیں تھکتے اور جن سے ان کو ذرا حسن ظن ہوتا ان سے بھی دعاؤں کی فرمائش کرتے۔ اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ دوسرے حضرات کو دعاء والتجا کی طرف کس طرح متوجہ فرماتے تھے۔ الغرض حضرت اقدس بنوری ؒ کی یہ معنوی میراث جو اس جامعہ کی اور دیگر تمام دینی اداروں کی روح رواں ہے' یعنی اخلاص وعبدیت،حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات عالی پر کامل اعتماد وتوکل' تسلیم ورضا اور دعاء والتجا کی دولت' جناب مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اس کو پوری طرح جذب اور ہضم کرلیا تھا' یہی

وجہ ہے کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کے بعد اگرچہ ہم حضرت رحمہ اللہ کے انفاس طیبہ سے محروم ہوگئے تھے مگر جناب مفتی صاحب رحمہ اللہ کی ان قلبی کیفیات کی بدولت جامعہ کا رنگ نسبت نہیں بدلا' جامعہ کی چار دیواری میں داخل ہونے کے بعد سکینت کی وہی کیفیت محسوس ہوتی تھی جو حضرت رحمہ اللہ کے دور میں تھی' ان کے اعتماد وتوکل علی اللہ اور اولو العزمی وبلند ہمتی کی ایک مثال یہ ہے کہ جامعہ کے لئے ملیر میں دس ایکڑ اراضی کا سودا کر رہے تھے جس کی مالیت غالباً کروڑ روپے سے متجاوز ہے جبکہ اپنے پاس کچھ نہیں تھا۔ یہ ان کی بلند ہمتی اور اولو العزمی کے سامنے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی' ہمارے حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبد الحی عارفی نور اللہ مرقدہٗ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے جو ہمارے مفتی صاحب کے حسب حال تھا:

ے

ہمت بلند دار کہ پیش خدا وخلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

اس ناکارہ کی مرحوم کے ساتھ قریباً ربع صدی تک جامعہ میں رفاقت رہی۔ علاوہ ازیں اندرون وبیرون ملک کے طویل اسفار میں ان کی رفاقت وہمرکابی کا شرف حاصل ہوا' بسا اوقات یہ سفری رفاقت ہفتوں اور مہینوں تک ممتد رہی اور ان کی سیرت وکردار اور اخلاق واطوار کے دقیق سے دقیق پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ کبھی یاد نہیں کہ جناب مفتی صاحب رحمہ اللہ کے کسی قول وفعل سے کسی ادنیٰ ناگواری کا شائبہ بھی پیدا ہوا ہو' بلکہ دل میں ان کی عظمت ومحبت کا نقش گہرے سے گہرا ہوتا چلا گیا' واقعی وہ بڑے حوصلہ کے آدمی تھے۔ فرشتہ سیرت تھے' ان کا مزاج ردوکد اور کشاکشی سے یکسر ناآشنا تھا۔ ان سے جس شخص کو بھی معاملہ پیش آتا وہ انہیں نرم خو اور سہل مزاج پاتا' حدیث میں فرمایا گیا ہے:

المومنون هینون لینون کالجمل الآنف ان انقید انقاد وان
استنیخ علی صخرۃ استناخ

(مشکوٰۃ ص ۴۳۲ عن مکحول مرسلاً)

ترجمہ:۔ مومن سہل مزاج اور نرم خو ہوتے ہیں جیسے اونٹ کی ناک

میں نکیل ہو اور اس کی ناک زخمی بھی ہو۔ اگر اس کو کھینچ لیا جائے تو کھنچ جاتا ہے اور اگر اس کو کسی چٹان پر بھی بٹھادیا جائے تو بیٹھ جاتا ہے۔

جناب مفتی صاحب مرحوم سے گفتگو اور مشورہ کرتے ہوئے اس ناکارہ کو ہمیشہ یہ حدیث یاد آجاتی تھی اورحان کی نرم خوئی اور کشادہ ذہنی کا سکہ قلب پر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ عاقل وفہیم تھے۔ زیرک ودانا تھے' مدبر اور معاملہ فہم تھے' لیکن اپنی شرافت ونجابت' سبک روحی وکشادہ ذہنی اور صفائے باطن کی بنا پر درج ذیل حدیث نبویؐ کا مصداق تھے۔

المؤمن غر کریم (مشکواۃ ص ۴۳۲)

مومن بھولا بھالا شریف الطبع ہوا کرتا ہے۔

امام طحاوی مشکل الآثار (۴۔۲۰۳) میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الغر فی کلام العرب هو الذی لا غائلة معه ولا باطنه خلاف ظاهره' ومن کان هذا سبیله امن المسلمون من لسانه ویده وهی صفة المؤمن

ترجمہ:۔ کلام عرب میں "غر" اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے دل میں کھوٹ' کینہ اور شر نہ ہو' نہ اس کا باطن اس کے ظاہر کے خلاف ہو' جو شخص اس نہج پر ہو' مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں گے اور یہ مومن کی شان ہے۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے تمام اساتذہ' کارکنان اور طلبہ کے ساتھ ان کا برتاؤ اسی شرافت ونجابت اور "مومن کی اسی شان" کے مطابق تھا' جب جامعہ کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی اس وقت متعدد اساتذہ ان کے ہم سن اور تعلیمی درجہ میں گویا ان کے برابر کے تھے' متعدد اکابر ان کے اساتذہ کے درجہ میں تھے اور چند حضرات ان کے چھوٹے کی حیثیت رکھتے تھے' لیکن انہوں نے ایسی خوش اسلوبی سے جامعہ کو چلایا اور سب سے حسن معاملہ کا ایسا نقشہ باندھا کہ وہ نہ صرف اپنے برابر والوں اور چھوٹوں کے محبوب قائد بن گئے بلکہ اکابر اساتذہ بھی ان کو غایت عظمت ومحبت کی نظر سے دیکھنے لگے' جن حضرات کو انتظام سے سابقہ پیش آتا ہے وہ جانتے ہیں کہ بسا اوقات اس راستہ میں نرم وگرم حالات بھی پیش آتے ہیں' اور منتظم سے بعض حضرات کو گلہ شکوہ اور

رنجش کی نوبت بھی آجاتی ہے' لیکن یہ جناب مفتی صاحب کی شرافت و نجابت کہئیے یا ان کی کھلی کرامت کہ اس پورے عرصہ میں اس ناکارہ نے کسی استاذ اور کارکن سے جناب مفتی صاحب کے بارے میں حرف شکایت نہیں سنا' نہ کبھی کسی استاذ یا کارکن کے بارے میں حرف شکایت ان کی زبان پر آیا' ان کی مقناطیسی شخصیت اور ان کی جوہر شناسی نے ان کے گرد ایسے فعال' جانثار اور بلند حوصلہ نوجوانوں کو جمع کردیا تھا' جو ان کے اشاروں کی تعمیل کو دنیا و آخرت کی سعادت سمجھتے تھے۔ **ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔**

اسی طرح عزیز طلبہ سے ان کا برتاؤ ایک شفیق مربی اور ایک مرشد امین کا تھا' اگر کبھی کسی عزیز طالب علم کی تادیب کی نوبت آتی تو اس میں بھی شفقت و محبت کا رنگ جھلکتا تھا' بعض اوقات ایسی بات فرماتے کہ طلبہ کو ان کے بارے میں "کشف والہام" کا خیال ہوتا' میرے ایک عزیز نے بتایا کہ:

> "مجلس تعلیمی نے ایک طالب علم کے اخراج کا فیصلہ کیا' اس کے رفقاء نے اسے مشورہ دیا کہ وہ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی مانگ لیں اور ان کو اطمینان دلادیں کہ آئندہ ایسی کوتاہی نہیں کریں گے' اگر ایسا کرلیا جائے تو حضرت مفتی صاحب اخراج کا فیصلہ منسوخ فرمادیں گے' لیکن وہ طالب علم رنج و صدمہ کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کی مجلس میں کہنے لگے کہ "تعلیم کوئی یہیں تو نہیں ہوتی' میں دوسری جگہ چلا جاؤں گا' جامعہ ..... میں داخل ہوجاؤں گا" بالآخر رفقاء کے سمجھانے بجھانے پر وہ معافی نامہ لکھ کر حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں آیا' معافی نامہ پیش کیا' حضرت مفتی صاحب نے دیکھ کر فرمایا: "ہاں میاں! (یہ جناب مفتی صاحب" کا تکیہ کلام تھا) تعلیم کوئی یہیں تو نہیں ہوتی؟ کسی دوسری جگہ چلے جاؤنا؟ جامعہ ..... میں داخلہ لے لونا' میرے سر کیوں ہوگئے ہو؟"
>
> اس طالب علم کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ یہ سمجھا کہ حضرت مفتی صاحب کو میری گفتگو کا کشف ہوگیا ہے' بے حد نادم ہوا' معافی مانگی'

اصلاح کا وعدہ کیا تو حضرت مفتی صاحب نے درخواست لے لی اور فرمایا۔ "اچھا غور کریں گے"۔

الغرض عزیز طلبہ کی اصلاح و تربیت اور مناسب تادیب سے تو غافل نہیں رہتے تھے' لیکن اس میں کبھی جذبۂ انتقام اور شفائے غیظ کا رنگ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی ہر ادا سے شفقت و محبت ٹپکتی تھی' اس لئے ابتدائی درجات سے لے کر آخری درجات تک کے تمام طلبہ جناب مفتی صاحب کو ایک عالم ربانی' ایک جلیل القدر مرشد و مربی اور ایک شفیق والد محترم کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے اور انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے ایک اتنی بڑی یونیورسٹی جس میں قریباً ۳۵ ممالک کے پانچ چھ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہوں' سیکڑوں اساتذہ اور کارکن مصروف کار ہوں' جس کا معمول کا ماہانہ میزانیہ دس لاکھ سے متجاوز ہو اور جس کے تعمیراتی مصارف کروڑوں پر پھیلے ہوئے ہوں' اس کا انتظام چلانا (اور محض توکل علی اللہ پر چلانا) اور پھر اس حسن و خوبی کے ساتھ چلانا بجائے خود اتنا بڑا کارنامہ ہے جو قوت قدسیہ کو چاہتا ہے۔ لیکن جناب مفتی صاحب کی سرگرمیاں اور ترکتازیاں صرف جامعہ کے نظم و نسق اور دروبست تک کہاں محدود تھیں؟ ان کی گوناگوں ذمہ داریوں اور نوع در نوع مشاغل پر عقل نارسا حیران تھی' ملک کی ہر دینی تحریک کے لئے روح رواں تھے' کوئی دینی ملی تحریک ایسی نہ تھی جس میں ان کا مؤثر کردار نہ ہو' ملک بھر کے دینی مدارس کی سرپرستی فرماتے تھے۔ تعطیلات کے زمانے میں "جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن" کا احاطہ گویا ملک بھر کے دینی مدارس کا سفارت خانہ بن جاتا تھا۔ اس کی درس گاہیں اور دار الاقامے مدارس دینیہ کے نمائندوں کی اقامت گاہیں ہوتی تھیں' جناب مفتی صاحبؒ ان کو تصدیق نامے لکھ کر دے رہے ہیں۔ کسی کو سفارشی خطوط دے رہے ہیں' کسی کی خود معاونت فرما رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مدارس کی دعوتوں پر دور دراز کے سفر فرماتے تھے' اہم امور میں ان کو مشورے دیتے اور ان کے لئے دعائیں فرماتے تھے' گویا تمام دینی مدارس کی سرپرستی و حوصلہ افزائی اپنے ذمہ سمجھتے تھے' متعدد مدارس نے ان کو اپنا باقاعدہ سرپرست بنا رکھا تھا۔

حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ' جن دنوں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر تھے' حضرت اقدس مولانا خان محمد مد ظلہ العالی ان کے نائب امیر تھے' حضرت بنوری رحمہ اللہ کے وصال کے بعد جب شیخ المشائخ مولانا خان محمد مد ظلہ

العالی (سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں) کو بالاتفاق امیر مجلس منتخب کیا گیا تھا تو انہوں نے جناب مفتی احمد الرحمٰن مرحوم کو اپنا نائب امیر مقرر فرمایا اور وہ دم واپسین تک اس منصب پر فائز رہے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جماعت ختم نبوت کے مشن کے لئے بیرونی ممالک کے سفر فرمائے۔ لندن کے دفتر کی معاونت کے سلسلہ میں اپنے چند رفقاء کے ساتھ امارات کا سفر فرمایا۔ جماعت کی مجلس شوریٰ میں بڑے قیمتی مشورے دیتے تھے اور حضرت امیر مد ظلہ العالی اور ارکان مجلس شوریٰ کے نزدیک ان کے مشورے نہایت وقیع سمجھے جاتے تھے۔

وفاق المدارس العربیہ کے ایک عرصہ تک نائب صدر رہے' پھر ان کو وفاق کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ وفاق کی طرف سے مدارس عربیہ کی نگرانی' ان کے دورے' ان کے امتحانات' امتحانی پرچوں کا اہتمام اور وفاق کی اسانید کی تقسیم' الغرض وفاق المدارس کی تنظیم کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔

"سواد اعظم اہل سنت" کے نائب صدر تھے۔ اور سواد اعظم کی فعالیت میں ان کا بڑا حصہ تھا' اس سلسلہ میں انہیں بڑی آزمائشیں پیش آئیں اور سنت یوسفی کے مطابق جیل تک جانا پڑا۔ مرحوم نے ان تمام آزمائشوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا مگر ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔

چند سال پہلے تمام جماعتوں پر مشتمل "متحدہ سنی محاذ" کی تشکیل عمل میں آئی تو ان کو اس کا امیر منتخب کیا گیا' اس طرح ان کو "قائد اہل سنت" کا خطاب دیا گیا۔

مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ کی "انجمن سپاہ صحابہ" کی بھی سرپرستی فرماتے تھے۔ مولانا شہید مرحوم کی بڑی قدر فرماتے تھے اور ان سے ہر نوع کا اخلاقی ومادی تعاون فرماتے تھے' ان کی کوشش تھی کہ "انجمن سپاہ صحابہ" اور "سواد اعظم اہل سنت" کے کاموں کو مربوط کردیا جائے مگر افسوس کہ مولانا حق نواز جھنگویؒ کی شہادت ہوگئی اور یہ منصوبہ زیر عمل نہ آسکا۔

ملک میں عورت کی حکمرانی کا فتنہ اٹھا تو اس کے مقابلہ کے لئے تمام دینی جماعتوں کی متحدہ علماء کونسل تشکیل دی گئی جس کے محرک جناب مفتی صاحب مرحوم تھے۔ راولپنڈی میں اس کے اجلاس کے لئے خود بھی تشریف لے گئے اور اس ناکارہ گم نام گوشہ نشین کو بھی گوشۂ عافیت سے نکال کر اجلاس میں شرکت کے لئے لے گئے' ایک مرتبہ جب صدر

اسحاق خان بے نظیر کی وزارت عظمیٰ کا اعلان کرنے والے تھے' کراچی سے علماء کا ایک پندرہ رکنی وفد لے کر اسلام آباد پہنچ گئے اور ایوان صدر کے سامنے احتجاج کیا۔ الغرض اس فتنہ کے خلاف جہاں تک ممکن ہوسکا' جہاد کیا' حرمین شریفین میں دعائیں کیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو اس فتنہ سے نجات دلائی۔

شریعت بل کے سلسلہ میں جب حکومت نے طوطا چشمی اختیار کی تو جناب مفتی صاحب نے پورے ملک کا دورہ کرنے کی ٹھان لی' چنانچہ ملک بھر کے علماء کے پاس تشریف لے گئے اور اٹھارہ ہزار دستخطوں کی ایک یادداشت حکومت کو بھجوائی اور پھر نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے کے لئے "متحدہ شریعت محاذ" تشکیل دیا گیا جس کی سپریم کونسل کے مفتی صاحبؒ رکن بنے۔

افغانستان کی تحریک جہاد میں بھی جناب مفتی صاحب کی سرگرمیاں لائق ستائش تھیں' "حرکۃ المجاہدین" سے ہر نوع کا تعاون فرمایا' اور اس کی مالی معاونت کے لئے ممتاز اہل خیر کے پاس خود تشریف لے گئے۔

"جامعہ العلوم الاسلامیہ" کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے سے پہلے وہ جمعیت علمائے اسلام کے باقاعدہ رکن اور کراچی کے امیر جماعت تھے' جامعہ کی ذمہ داریوں کا بار ان پر ڈالا گیا تو حضرت اقدس بنوری قدس سرہٗ کے ایماء پر عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی' لیکن جمعیت کی صلاح و بہبودی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ جمعیت کا دو دھڑوں میں بٹ جانا ان کے لئے سوہان روح تھا' کئی بار اس خلیج کو پاٹنے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کے لئے لاہور' پنڈی اور پشاور تک کا سفر فرمایا۔

الغرض وہ دین کی سربلندی کے لئے ہر تحریک سے تعاون فرماتے تھے اور ان کے پہلو میں ایک ایسا دل تھا جو ہر دینی تحریک کے ساتھ دھڑکتا تھا' کارخانۂ دنیا تو بہرحال چلتا ہی رہے گا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب مرحوم تن تنہا جن کاموں کو نبھا رہے تھے ایک جماعت کی جماعت بھی شاید اس خلا کو پر نہ کرسکے۔

یہ تو ملک وملت کے اجتماعی کاموں کے لئے ان کی بے تابی و بے قراری کا حال تھا' ان گرانقدر خدمات کے علاوہ ناداروں' بیواؤں' یتیموں اور بے کسوں کی غم خواری و خبرگیری ان کی زندگی کا ایک مستقل باب تھا' وہ کسی کی تکلیف برداشت ہی نہیں کرسکتے تھے

خنجر چلے کسی پہ' تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ان کی وفات سے کتنے بے کس ونادار بے سہارا رہ گئے اور کتنی بیوائیں اور یتیم بچے اپنے سرپرست سے محروم ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان مشاغل مہمہ کے علاوہ حضرت مفتی صاحب سے سلسلۂ "اصلاح وارشاد" بھی جاری تھا' غالباً دو سال پہلے حضرت اقدس مولانا فقیر محمد پشاوری مدت فیوضہم ویر کاتہم (خلیفۂ ارشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ) نے ان کو خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا تھا۔ جناب مفتی صاحبؒ نے سوموار کی شام کو بعد از نماز عصر جامعہ کے مہمان خانہ میں حلقہ "افاضہ وتلقین" شروع کردیا تھا' یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی تھی کہ مرحوم اس کی خوب پابندی اور اہتمام فرماتے تھے اور دیگر حضرات کے علاوہ جامعہ کے طلبہ کو خصوصاً بہت نفع پہنچ رہا تھا۔

جناب مفتی صاحبؒ اپنی زندگی میں تیز روی کے عادی تھے' ایک بار مزدلفہ کی صبح ان کے ساتھ منیٰ جانا ہوا' وہ اس قدر تیز گام تھے کہ ان کے ساتھ قدم ملا کر چلنا مشکل ہوگیا۔ مفتی صاحب نے اسی تیز روی کا وتیرہ سفر آخرت میں اپنایا۔ شام کو ہم انہیں سلامت باکرامت چھوڑ کر گئے' صبح پتہ چلا کہ وہ تشریف لے جاچکے ہیں۔ دو سال پہلے جب ہمارے بزرگ استاذ حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی کا (رجب ہی میں) انتقال ہوا تو جناب مفتی صاحبؒ کا اصرار تھا کہ یہ ناکارہ بینات کا "اجازت نامۂ اشاعت" اپنے نام کرالے' میں نے عرض کیا "مفتی صاحب! آج آپ میرے نام کرا رہے ہیں' کل کو کسی دوسرے کے نام کرائیں گے' ہم بڈھوں کا کیا ہے' آج ہیں تو کل نہیں' آپ یہ اجازت نامہ خود اپنے نام کرائیے!" جیساکہ پہلے لکھ چکا ہوں مرحوم کو ردوقدح کی عادت نہیں تھی۔ فرمایا بہت اچھا۔

سن وسال کے تفاوت کی بنا پر اس ناکارہ کا خیال تھا کہ مفتی صاحب کی عمر چونکہ کم ہے اس لئے وہ اس روسیاہ کے بعد تک زندہ رہیں گے اور اپنے ہاتھوں سے اس ناکارہ کی تکفین وتدفین فرمائیں گے' شاید اس کے طفیل اس ناکارہ کی بخشش کا سامان ہوجائے۔ کیا

خبر تھی کہ اس شکستہ خاطر و شکستہ قلم کو جناب مفتی صاحب کا بھی مرثیہ لکھنا پڑے گا؟ فللّٰہ الامر من قبل و من بعد۔

یہ زندگی صدمات ہی سے عبارت ہے' اور حق تعالیٰ شانہٗ کے قضا و قدر کے فیصلوں کے سامنے بندے کو چارہ دم زدن نہیں۔ قطعی ایمان ہے کہ اس حکیم مطلق کا ہر فیصلہ حکمتوں پر مشتمل ہوتا ہے' جی چاہتا تھا کہ جناب مفتی صاحب کے وجود سے ہم لوگ ابھی اور مستفید ہوتے' مگر مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمارے محبوب قائد و امیر مرحوم کی تمام کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیں۔ انہیں آغوش رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور اپنے نیک و مخلص بندوں کے ساتھ ان کو درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔

اللهم اغفر له وارحمه' وعافه' واعف عنه' واكرم نزله' ووسع مدخله وابدله دارا خيرا من داره واهلا خيرا من اهله' اللهم لا تحرمنا اجره ولا تفتنا بعده۔

(بینات رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء)

حضرت مولانا نیاز محمد صاحبؒ

(المتوفی ۳۰ر جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ مطابق ۶ر جنوری ۱۹۹۲ء) حضرت مولانا نیاز محمد رحمہ اللہ کا اصل وطن مشرقی ترکستان کا مشہور شہر ختن ہے (بضم اول وفتح فوقانی شہریست درحدود چین۔ غیاث اللغات) وہی ختن جو "مشک ختن" کے حوالے سے شہرۂ آفاق ہے۔ (اب یہ شہر جمہوریہ چین کے صوبہ "سینک یانگ" میں واقع ہے) حضرت نسلاً ترک تھے اور ترک قوم کے سب سے بہادر' جنگ جو اور غیور قبیلہ "اڈی فور" سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ والد محترم مولانا ثابت علی کا اچھا خاصا زمیندارہ تھا' ۱۳۰ مربع زمین تھی اور "ختن" میں ایک دینی مدرسہ کی اپنی جیب سے کفالت فرماتے تھے۔

حضرت مرحوم کی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر میں ہوئی اور وہاں کے نامور اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔ بعد ازاں اس علاقہ کے سب سے ممتاز اور جید عالم حضرت مولانا ثبوت اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ ختن کے نواح میں ایک مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ازھر ایشیاء دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید تھے۔ اور وہ اکثر دوران درس اپنے استاذ امام العصر کشمیریؒ کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں وہاں کمیونسٹ انقلاب آیا۔ استاذ محترم مولانا ثبوت اللہؒ نے کمیونسٹوں سے جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ نوشتہ تقدیر غالب آچکا تھا' اس لئے اس اٹھارہ سالہ نوجوان نے ہجرت فی سبیل اللہ کا فیصلہ کرلیا اور استاذ الاستاذ حضرت کشمیریؒ کی خدمت میں حاضری کی نیت سے دیوبند پہنچنے کا ارادہ فرمالیا۔ چنانچہ اپنے چند ہم عمر نوجوانوں کے ساتھ کوہ ہمالیہ کے دشوار گذار' پر خطر اور برفانی راستوں کو پا پیادہ طے کرتے

ہوئے دو مہینے میں دیوبند پہنچے۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ امام العصر انتقال فرما چکے ہیں' آہ کہ:

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

نہایت شکستہ دل ہوئے اور وطن واپسی کا سوچنے لگے۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ڈھارس بندھائی۔ اور فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم عصر اکابر اساتذہ موجود ہیں ان سے استفادہ کرو۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب کے ارشاد پر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ گیارہ سال تک نہایت محنت و مجاہدہ کے ساتھ دارالعلوم میں طالب علمی کی اور تمام علوم عالیہ و آلیہ میں کمال پیدا کیا۔ آپ کے اساتذہ میں درج ذیل شخصیتیں نمایاں ہیں:

حضرت شیخ الاسلام المجاہد فی سبیل اللہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ' شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی' حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی' حضرت مولانا محمد اعزاز علی' حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ دیوبندی' حضرت مولانا محمد طیب قاسمی' حضرت مولانا شمس الحق افغانی' حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی' حضرت مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک وغیرہم رحمہم اللہ۔

طالب علمی کے دوران بیعت کے ارادہ سے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی بارگاہ میں تھانہ بھون میں حاضر ہوئے لیکن حضرت نے فرمایا کہ فراغت کے بعد بیعت ہونا لیکن افسوس کہ فراغت سے ایک سال قبل حضرت کا وصال ہوگیا۔ اس لئے مسلسل استخارے کے بعد حضرت مفتی محمد شفیعؒ سے بیعت ہوئے۔ چونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی راہنمائی پر دارالعلوم سے فیض یاب ہوئے تھے اس لئے حضرت مفتی صاحبؒ سے قلبی تعلق بہت بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ فراغت کے بعد چار سال تک ان کی مسجد میں امام رہے اور یہ تعلق مفتی صاحبؒ سے ہمیشہ رہا۔

۱۳۶۴ھ میں حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ نے بہاول نگر میں ایک مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھنا چاہی تو دارالعلوم دیوبند سے اپنے عزیز شاگرد حضرت مولانا مفتی نیاز محمدؒ کو اپنی رفاقت کے لئے طلب فرمایا۔ چنانچہ آپ حضرت شیخ الاسلام مولانا

سید حسین احمد مدنیؒ کے حکم سے بہاول نگر تشریف لے آئے اور ذوالحجہ ۱۳۶۴ھ میں جامع العلوم عیدگاہ بہاول نگر کی بنیاد رکھی گئی۔ دو سال بعد حضرت مولانا بدر عالمؒ پر دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا داعیہ وجاذبہ غالب آیا اور وہ اس امانت (جامع العلوم بہاول نگر) کو اپنے شاگرد مولانا مفتی نیاز محمدؒ کے حوالے کرکے عازم مدینہ ہوئے۔ اس وقت سے آخری لحات زندگی تک حضرت اس امانت کو سینے سے لگائے رہے۔ اس گلشن کی باغبانی کے لئے تمام صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اپنا وطن نہیں تھا خویش قبیلہ نہیں تھا۔ غریب الوطن اور اجنبی تھے یہاں کی زبان پر بھی پورا عبور نہیں تھا۔ ان مشکلات کا آج اندازہ کون کرسکتا ہے جو اس درویش خدامست کو اس راستہ میں پیش آئی ہوں گی' بارہا فاقوں کی نوبت آئی' درختوں کے پتے چباکر تن وروح کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش فرمائی۔ لیکن پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ اس ریگستانی علاقے کے لوگوں نے ان کو زندگی میں بہت کم پہچانا' لیکن اس مہاجر فی سبیل اللہ کے سر پر رحمت وعنایت خداوندی سایہ فگن تھی' قدم قدم پر حق تعالیٰ شانہ کی نصرت نے دستگیری فرمائی' اور وہ مدرسہ جو حضرت الاستاذ مولانا بدر عالم میرٹھیؒ دو چھپر نما کچے کمروں کی شکل میں چھوڑ کر گئے تھے حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے ایک وسیع وعریض دارالعلوم بن گیا۔ جس میں ۲۵ - ۳۰ تک دورہ حدیث کے طلبہ ہوتے ہیں۔

حضرت مرحوم ایک قوی الاستعداد پختہ عالم تھے۔ ہمارے استاذ حضرت علامہ محمد شریف کشمیریؒ جو اپنی بلند علمی استعداد کی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ پنجاب میں صرف اڑھائی مدرس ہیں ایک (شیخی وسندی حضرت اقدس) مولانا خیر محمد جالندھریؒ' دوسرے مولانا عبدالخالقؒ (بانی دارالعلوم کبیروالا) اور مزاحًا فرمایا کرتے تھے کہ آدھا مدرس میں ہوں۔ (حضرت کشمیریؒ کا یہ ارشاد راقم الحروف نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے) یہی علامہ کشمیریؒ طلبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ جن کو فنون پڑھنے کا شوق ہو وہ بہاول نگر مولانا نیاز محمد صاحب کے پاس جائیں۔ اس سے حضرت مرحوم کی بلند علمی استعداد کا اندازہ ہوسکتا ہے' اس علم وفضل کے ساتھ انابت وخشیت اور نسبت مع اللہ میں بھی بہت ہی بلند مقام پر فائز تھے۔ اخلاص وللٰہیت' بہادری وجوانمردی' عجز وانکساری اور حسن معاملہ میں اپنی مثال آپ تھے'

مرض الوفات میں اپنے متعلقین کو بہت سی قیمتی نصیحتیں فرمائیں۔ وفات سے ایک دن پہلے اتوار کو اس ناکارہ کی موجودگی میں اپنے صاحبزادگان کو اتفاق واتحاد کی وصیت فرمارہے تھے۔ اسی میں فرمایا کہ شیخ سعدی کا قول ہے: ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست
بادوستاں مروت بادشمناں مدارا

(دوجہاں کی راحت وآسائش ان دو حرفوں کی تفسیر ہے۔ دوستوں سے مروت کا اور دشمنوں سے مدارات کا برتاؤ کرو)

پھر فرمایا کہ میں نے ساری زندگی "بادوستاں مروت بادشمناں مدارا" کے اصول پر گزاری ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت سے ایسا شغف تھا کہ ضعف واضمحلال اور پیرانہ سالی کے باوصف روزانہ دس پارے کی تلاوت اور تین دن میں قرآن کریم ختم کرنے کا معمول تھا۔ چلتے پھرتے دعاؤں کا خاص اہتمام تھا اور علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ مرض الوفات شروع ہونے سے پہلے چار چار گھنٹے روزانہ مطالعہ فرماتے تھے اور درس گاہ تک جانے کی ہمت ہوتی تو وہاں پہنچ جاتے ورنہ طلبہ کو گھر پر بلالیتے۔ الغرض کچھ نہ کچھ تعلیم وافادہ بھی اپنے ذمہ رکھتے۔

سن مبارک اسی نوے کے درمیان تھا۔ ادھر کچھ عرصہ سے پیرانہ سالی کے عوارض لاحق تھے۔ مرض الوفات کا آغاز ایک معمولی بات سے شروع ہوا۔ ضیق النفس کی تکلیف شروع ہوئی اور اس پر مدوجزر کی کیفیت رہی۔ طبیعت کی زیادہ ناسازی کا سن کر یہ ناکارہ ہفتہ چار جنوری کی شام کو کراچی سے بہاولنگر پہنچا۔ اتوار کی صبح کو ہسپتال حاضر ہوا۔ تکلیف کی شدت کے باوجود صاحبزادگان کو بہت قیمتی وصیتیں فرماتے رہے۔ اس ناکارہ سے فرمایا کہ آپ بھی ان کی طرف توجہ رکھیں اور اپنی تکلیف کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تکلیف تو ہے لیکن الحمد للہ قلب مطمئن ہے۔ ظہر کی نماز تک ہم بیٹھے رہے۔ پھر فرمایا کہ اب تم جاؤ میں نے ہسپتال سے گھر واپس آتے ہوئے عزیز مولوی منیر احمد سلمہٗ سے کہا کہ حضرت کی طبیعت سنبھلی ہوئی ہے۔ اگر طبیعت اسی طرح رو بصحت رہی تو میں ان شاء اللہ کل ملتان چلا جاؤں گا ایک دو دن وہاں لگیں گے اس دوران فون پر صحت کا پتہ کرتا رہوں

گا اور دو دن بعد کراچی چلا جاؤں گا۔ انہوں نے حضرت کو ہسپتال میں میرے ارادے سے آگاہ کیا تو فرمایا کہ "نہیں! بلکہ جنازہ پڑھ کر جایئے گا"۔

جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کہ مجھے حضرت کے مرض الوفات کا صرف آخری دن دیکھنا نصیب ہوا اور اس میں چند امور کا بین مشاہدہ ہوا' جن پر اس ناکارہ کو' واقعہ یہ ہے کہ بڑا ہی رشک آیا۔ مثلاً ایک یہ کہ تکلیف کی شدت کے باوجود کسی قسم کی گھبراہٹ اور کرب و بے چینی کا اظہار نہیں تھا۔ ایک مرتبہ بھی ان کے منہ سے "ہائے" سننے میں نہیں آئی۔ ان کے نرم و نازک بدن پر مسلسل انجکشن لگ رہے تھے لیکن سوئی چبھونے پر انہوں نے ایک بار بھی "سی" نہیں کیا بلکہ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کہ اس ناکارہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ گو بدن کو تکلیف ہے مگر قلب مطمئن ہے۔ آخری وقت میں قلبی اطمینان کی یہ دولت خاص مقبولان الٰہی کو نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ دولت نصیب فرمائیں۔

دوم یہ کہ حدیث نبویؐ:

"من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ"

(جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات چاہتا ہو اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات چاہتے ہیں) تو ہمیشہ پڑھتے پڑھاتے رہے مگر اس کی مشاہداتی تفسیر حضرتؒ کے یہاں دیکھنے میں آئی۔ ایک عرصہ سے دوشنبہ کے دن مرنے کی تمنا تھی' اتوار کی شام کو بار بار دریافت فرماتے تھے کہ دوشنبہ داخل ہونے میں کتنی دیر ہے؟ جب اتوار کا آفتاب غروب ہوا اور آپ کو بتایا گیا کہ دوشنبہ داخل ہوگیا ہے تو فرمایا میری چارپائی قبلہ رخ کردو' حکم کی تعمیل کردی گئی تو قبلہ رخ ہوکر فرشتۂ موت کو دیکھنے کے لئے چشمہ لگا کر بیٹھ گئے اور (اپنے مخصوص لہجے میں) دریافت فرمانے لگے کہ فرشتہ کدھر سے آئے گا اوپر کی جانب سے ...... یا دروازے کی طرف سے؟ یہ ناکارہ مغرب کے بعد حاضر ہوا اور عشاء تک بیٹھا رہا۔ عشاء کے وقت مجھ سے فرمایا کہ میری ایک عرصہ سے آرزو تھی کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم وفات نصیب ہو۔ پھر ذرا سے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ اگر یہ دوشنبہ نہیں تو اور بہت سے دوشنبہ آئیں گے۔ اب آپ جائیں' آرام کریں' یہ ناکارہ تو حسب الحکم اٹھ کر آگیا لیکن حضرت کی ساری رات اسی بے تابی میں کٹی کہ قاصد' کوچ کا پیغام کب لاتا ہے؟

دریں اثنا کچھ غنودگی طاری ہوئی تو افاقہ کے بعد فرمایا کہ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میرے کان میں کہا ہو۔ "ھی حتّٰی مطلع الفجر" معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ طلوع فجر کے وقت ہو گا' اس لئے بار بار دریافت فرماتے کہ طلوع فجر میں کتنی دیر ہے۔ جب رات گزر گئی اور دن طلوع ہوا تو خیال ہوا کہ شاید یہ دوشنبہ گزر جائے گا۔ صاحبزادہ مولانا جلیل احمد نے عرض کیا کہ اب تو سورج نکل آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس دوشنبہ کو نہیں' یہ سن کر حضرت کو جیسے صدمہ ہوا ہو' اس لئے گھبرا کر فرمایا "فکر نہ کرو غروب نہیں ہونے دوں گا"۔ اور اسی وقت سے حالت متغیر ہونا شروع ہوئی بالآخر بوقت چاشت ۱۱-۲۵ پر جان جاں آفرین کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

الغرض لقائے محبوب کا اشتیاق ایسا غالب تھا کہ انتظار میں بے تاب بیٹھے ہیں۔

سوم یہ کہ حضرتؒ کی خواہش و وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین سے تدفین تک کے مراحل بڑی عجلت سے طے ہوئے۔ چنانچہ دوپہر میں جنازہ ہسپتال سے گھر لایا گیا۔ ظہر کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی اور عصر کے بعد عید گاہ کے میدان میں نماز جنازہ ہوئی۔ نماز جنازہ کے لئے نہ کسی کا انتظار کیا گیا اور نہ لوگوں کو جمع ہونے کے لئے زیادہ وقت دیا گیا۔ اس کے باوجود نماز جنازہ میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ بہاول نگر کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ شاید کبھی نہیں ہوا' جس میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ جنازہ کی چارپائی سے لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کندھا دینے کی سعادت حاصل ہو سکے۔ بایں ہمہ بہت سے لوگوں کو مجمع کی وجہ سے جنازہ تک پہنچنا نصیب نہ ہو سکا۔

چہارم یہ کہ حضرتؒ کی یہ وصیت تھی کہ مجھے مدرسہ کے احاطہ میں دفن نہ کیا جائے کیونکہ یہ جگہ قبر کے لئے وقف نہیں ہے بلکہ بہاول نگر سے ملحقہ بستی دین پور شریف میں جہاں قطب العالم حضرت اقدس مولانا اللہ بخش بہاول نگری نور اللہ مرقدہٗ مدفون ہیں ' متولیان سے اجازت لے کر مجھے وہاں دفن کیا جائے۔ حضرت کی اہلیہ محترمہ نے عرض کی کہ بچے اتنی دور کیسے جایا کریں گے؟ تو فرمایا قبر

پر جانا ضروری نہیں یہیں سے ایصال ثواب کرتے رہیں پہنچ جائے گا۔ چنانچہ تدفین کی اجازت اور قبر کی جگہ کی تعیین کے لئے راقم الحروف بڑے صاحبزادہ گرامی جناب مولانا حافظ سراج احمد صاحب زید مجدہٗ کی معیت میں خود وہاں گیا۔ اور مولانا محمد الیاس صاحب زید مجدہم (نبیرہ حضرت قطب العالم مولانا اللہ بخش بہاول نگری) سے عرض کیا کہ آپ کے قبرستان میں ایک نیا مہمان لا رہے ہیں ان کے لئے قبر کی جگہ چاہئے۔ فرمانے لگے میں تو دیر سے تمہارے انتظار میں کھڑا ہوں (اور رات کے ایک خواب کی بناء پر واقعۃً ہمارے جانے سے پہلے انتظار میں کھڑے تھے) چنانچہ وہ ہمیں قبرستان میں لے گئے اور قبروں کی پہلی لائن جس میں حضرت مولانا اللہ بخش بہاول نگری کی قبر مبارک ہے اسی لائن میں حضرت کے لئے جگہ کی تعیین کر دی جو قبرستان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی قبر ہے۔ قبر کی ایسی بہترین جگہ دیکھ کر واقعی رشک آتا ہے۔ بہر حال مغرب کی نماز کے بعد تدفین ہوئی۔ یہاں چند لائق رشک مبشرات و واقعات اور بھی پیش آئے جنہیں قلم انداز کرتا ہوں' البتہ ایک چیز ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ وہ یہ کہ تین بجے کے قریب حضرت کو غسل دینے کے لئے تختہ پر لایا گیا تو بدن مبارک ایسا نرم و گداز تھا کہ بلا تکلف بدن کے کپڑے صحیح سالم اتار لئے گئے حتیٰ کہ نیچے کی بنیان تک بغیر کسی دشواری کے اتار لی گئی' اور صاحبزادہ جمیل احمد صاحب نے بطور تبرک اپنے پاس رکھ لی۔ بعض مقبولان الٰہی کے ابدان مرنے کے بعد بھی تر و تازہ رہتے ہیں' شاید حضرت کا شمار بھی انہی حضرات میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں اور مقبولوں کے صدقہ یہ دولت اس قطرۂ ناپاک کو بھی نصیب فرما دیں تو اس کریم آقا کے کرم سے کیا بعید ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ ان دونوں بزرگوں (حضرت مولانا مفتی علی محمد اور حضرت مولانا مفتی نیاز محمد) کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں' ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر فرمائیں' ان کو اپنی عنایات خاصہ والطاف کریمانہ کا مورد بنائیں' ان کے پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق وسعادت نصیب فرمائیں۔

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً
للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم۔

میری فرمائش پر مرحوم کے صاحبزادے میرے عزیز داماد مولوی منیر احمد سلمہ نے اپنے والد ماجد کے چند علمی نکات اور واقعات قلمبند کیے ہیں جو کافی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ذیل میں انہی کے الفاظ میں پیش کیے جاتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی نیاز محمدؒ کو دینی غیرت وحمیت کا وہ مقام عطا فرمایا تھا کہ حق گوئی وبے باکی ان کا نمایاں وصف دکھائی دیتا تھا اور بات ایسی مضبوط اور ٹھوس علمی انداز سے پیش کرتے کہ مخاطب پر سکتہ طاری ہوجاتا تھا' چنانچہ فرماتے تھے ایک مرتبہ صدر ایوب کے مارشل لاء کے دور میں شہر بہاول نگر کے اندر فوجی جنرل آیا۔ اس نے تمام شہر کے علماء کو جمع کیا اور تقریر کی جس میں علماء کو ملامت کرنے لگا کہ تم لوگ آپس کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہو' ایک دوسرے کی تکفیر کرنے کے علاوہ تمہارا کوئی کام نہیں' تم اپنے منصب میں کوتاہی کرتے ہو' لوگوں کو وعظ ونصیحت اور دین کی باتیں بتانے کی بجائے ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالتے ہو' آخرت میں کیا جواب دو گے؟ سدھر جاؤ ورنہ قانونی کاروائی سے مؤاخذہ کیا جائے گا' اس پر تمام علماء معذرت پیش کرنے لگے کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔

(۱) حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مجھے بڑی غیرت آئی کہ علماء ایسا کیوں کررہے ہیں اور پھر اس شخص کو کیا حق ہے کہ علماء کی یوں تذلیل کرے؟ فرماتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا اور کہا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جنرل صاحب نے کہا جی ہاں! ضرور ارشاد فرمائیں! فرماتے ہیں میں نے سورۂ حدید کی یہ آیت تلاوت کی:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس (الحدید۔۲۵)

تحقیق ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ کے نزول کا ذکر کرنے کے بعد حدید (لوہا) نازل کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ کتاب اللہ اور حدید (لوہا) نازل کرنے میں کیا مناسبت ہے؟

جواب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دو قوتوں سے نوازا ہے' قوت نظری اور قوت عملی۔ قوت نظری کا مطلب یہ کہ بندہ معبود کی مرضیات ونامرضیات کو جانے' مرضیات سے مراد اوامر ہیں یعنی اوامر کو جانے علیٰ حسب مراتب الخمسہ فرائض' واجبات' سنن' مستحبات' مباحات۔ نامرضیات سے مراد نواہی ہیں یعنی منہیات کو جانے علیٰ حسب مراتب الخمسہ حرام' مکروہ تحریمی' مکروہ تنزیہی' اسأت' خلاف اولیٰ۔ اور قوت عملی کے ذریعہ مرضیات پر عمل کرے' علیٰ حسب اوقاتہا یعنی نماز کو اپنے وقت میں' زکوٰۃ کو اپنے وقت میں' حج کو اپنے وقت میں' روزے کو اپنے وقت میں ادا کرے اور نامرضیات سے پرہیز کرے علیٰ حسب مواقعیہا یعنی جب بھی کسی منی عنہ سے پرہیز کا موقع آجائے اس سے پرہیز کرے۔

تو گویا قوت نظری سے اللہ تعالیٰ کی مرضیات ونامرضیات کو جانے اور قوت عملی کے ذریعے سے مرضیات پر عمل کرے اور نامرضیات سے پرہیز کرے۔ جب انسان کی یہ دو قوتیں کامل ہوجاتی ہیں تو انسان کامل بن جاتا ہے۔

"الا الذین امنوا وعملوا الصلحت" میں امنوا سے قوت نظری کی طرف اشارہ ہے اور عملوا الصلحت سے قوت عملی کی طرف اشارہ ہے' جب دونوں پہلو کامل ہوگئے تو اب "فلھم اجر غیر ممنون" کی خوشخبری ہے۔

علماء نے لوگوں میں قوت نظری کی تکمیل کردی ہے۔ چنانچہ جنگل سے ایک ان پڑھ جاہل کو لے آئیں تو وہ بھی چوری کو حرام کہے گا' قتل کو حرام کہے گا وغیرذالک۔ اس کو کس نے بتایا ہے؟ وہ ماں کے پیٹ سے تو سیکھ کر نہیں آیا ہے' علماء نے بتایا ہے' نماز روزہ کو اچھا سمجھتا ہے' بلکہ خود چور بھی چوری کو گناہ سمجھتا ہے۔ یہ قوت نظری علماء نے مکمل کی۔ البتہ قوت عملی کی تکمیل کا کام حکومت کے ذمہ ہے کہ وہ لوہے (تلوار' اقتدار) کو استعمال کرکے اس کی تکمیل کرے' یہ کام حکومت کا تھا' پھر علماء نے قوت عملی کے لئے ترغیب کے پہلو سے اس قوت کی بھی تکمیل کی کوشش کی ہے۔ البتہ ترہیب وسزا کے ذریعہ سے اس کی تکمیل حکومت کا کام ہے' وہ چور کے ہاتھ کاٹتی نہیں' زانی کو رجم

کرتی نہیں، قاتل سے قصاص نہیں لیتی، گویا وہ لوہا جو اللہ نے اتارا ہے اس کو زنگ آلود کر کے رکھ لیا ہے۔ اس کو استعمال نہیں کرتی، تو علماء حق نے اپنے منصب میں کوئی کوتاہی نہیں کی بلکہ یہ حکومت کی کوتاہی ہے، اگر قوت عملی کی تکمیل نہیں کرسکتے تو علماء کو لوہا دے دو (اقتدار دے دو) انشاء اللہ اس کی بھی تکمیل کر کے دکھائیں گے۔ تمام علماء نے اس بات کی تائید کی اور جنرل صاحب خاموش لاجواب بت کی طرح کھڑے رہ گئے اور میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ کریں گے کریں گے.... اور چلتے بنے۔

(۲) صدر ایوب ہی کے مارشل لاء کے زمانے میں عید کے چاند کا مسئلہ پیش آیا تھا اور حکومت نے رات کے بارہ بجے ایک روز قبل (جمعرات) کی عید کا اعلان کردیا، جب کہ چاند نظر نہیں آیا تھا، اب حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت پر پورے ضلع بہاول نگر کا مدار تھا، ان کے اشارے پر پورا ضلع بہاول نگر قدم اٹھاتا تھا، اس لئے حکومت نے آپ پر دباؤ ڈالا کہ آپ کل عید پڑھائیں اور مذہبی حلقوں میں اس کا اعلان کرائیں، ورنہ مارشل لاء کے حکم کی خلاف ورزی پر سنگین کاروائی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ شہر کے ایس پی، ڈی سی اور فوجی افسروں نے دباؤ ڈالا، مگر مفتی صاحبؒ نے جرأت مندی کے ساتھ فرمایا کہ تم دنیا کے معاملات کے افسر ہو! میں دین کے معاملات کا افسر ہوں، خبردار! دینی معاملات میں دخل اندازی کا کسی کو حق نہیں ہے، پھر حدیث پڑھی:

تعس عبدالدینار وعبدالدرھم وعبدالخمیصۃ، ان اعطی رضی وان لم یعط، سخط تعس وانتکس واذا شیک فلا انتقش (مشکوۃ)

ترجمہ: "ہلاک ہوجائے بندہ دینار کا اور بندہ درہم کا اور بندہ چادر کا، (یعنی جو شخص درہم و دینار اور متاع دنیا کی غلامی و بندگی میں گرفتار ہے) اگر اس کو دیا جائے تو خوش ہو، اور اگر نہ دیں تو ناخوش اور ناراض ہو۔ خدا کرے کہ ایسا شخص ہلاک اور ذلیل و خوار ہو، اگر اس کے کانٹا لگے تو خدا کرے کہ نکالا نہ جائے"۔

فرمایا کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبدالدینار و درہم کے حق میں بددعا فرمارہے ہیں کہ اس کے کانٹا چبھے تو اس کو کانٹا نکالنے کو کوئی چیز نہ ملے اور وہ اوندھے منہ ذلیل و خوار ہو، چنانچہ تم سب لوگ اس حدیث کی بددعا کے زمرے میں داخل ہو، کیونکہ تم سب لوگ عبدالایوب ہو کر عید اس کے حکم کے مطابق پڑھنا چاہتے ہو، مگر میں عبداللہ

ہوں' اللہ کا بندہ ہوں' اس کے حکم کے مطابق عید پڑھوں گا' تم ایوب کی فوج کا لشکر لاؤ گے میں اللہ کی فوج کا لشکر لاؤں گا' پھر فیصلہ آسمان وزمین دیکھے گی۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب ؒ کے انکار کی وجہ سے پورے ضلع میں کسی نے عید نہیں پڑھی' بلکہ روزہ رکھا' سوائے سرکاری افسروں کے کہ انہوں نے ایک سرکاری مولوی تیار کرکے عید پڑھی' شام کو چاند نظر آگیا تو دوسرے روز پورے ضلع نے عید پڑھی۔ مگر مفتی صاحب ؒ نے شریعت کے اس فیصلے میں ذرا لچک نہیں دکھائی۔ حضرت مفتی صاحب ؒ بہت ہی شفیق اور نرم تھے مگر دین کے معاملے میں ان سے زیادہ سخت ومتشدد نہیں دیکھا' پہاڑ کی طرح ڈٹ جاتے تھے۔ ان کے اندر بیک وقت ریشم کی سی نرمی اور فولاد کی سی سختی پائی جاتی تھی۔

(۳) بندہ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ امام بخاری ؒ اپنی صحیح میں وحی کو باب کے عنوان سے شروع کرتا ہے' چنانچہ "باب بدء الوحی" کہا ہے "کتاب الوحی" کیوں نہیں کہا؟ بندہ نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا جو سنا پڑھا تھا' مگر والد صاحب نے فرمایا کہ نہیں اس میں ایک اور نکتہ ہے اور امام بخاری ؒ کی نگاہ بہت گہری ہے چنانچہ فرمایا کہ:

باب کے معنی ہیں دروازہ' گویا مطلب ہوا "وحی کا دروازہ" اس کے بعد کتاب الایمان لا رہے ہیں تو گویا اشارہ فرمانا چاہتے ہیں کہ ایمان وہ معتبر ہے جو وحی کے دروازے سے داخل ہو' جو ایمان کہ عقل کے دروازے سے داخل ہو وہ معتبر نہیں' چنانچہ اسلام کی یہ عمارت ارکان خمسہ پر کھڑی ہے' اس میں داخل ہونے کا دروازہ وحی کا ہو تو معتبر ورنہ نہیں۔ چنانچہ فلاسفہ بھی باری تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں مگر وہ وحی کے ذریعے داخل نہیں ہوئے بلکہ عقل کے دروازے سے داخل ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے عقل اول کو پیدا کیا' عقل اول نے عقل ثانی کو پیدا کیا یوں عقل عاشر تک ہوا' پھر عقل عاشر نے پوری کائنات کو پیدا کیا' اور اللہ تعالیٰ عقل اول کو پیدا کرکے معطل ہوگیا (نعوذ باللہ) اس لئے ان کو معطلہ بھی کہتے ہیں' ان کا ایمان معتبر نہیں ہے۔ معتزلہ بھی عقل کے دروازے سے داخل ہوئے۔ چنانچہ وہ اللہ کی ذات کو قدیم مانتے ہیں مگر صفات قدیمہ کی نفی کرتے ہیں' اسی طرح جو بھی عقل کے دروازے سے آیا وہ غیر معتبر ہے بلکہ چور ہے' کیونکہ چور ہی دروازے کے علاوہ

دوسری جگہ سے نقب لگا کر آتا ہے' چنانچہ وحی کے دروازے کے علاوہ کسی اور دروازے سے جو داخل ہوگا اسلام کی اس عمارت میں وہ چور ہے اس کی سزا آخرت میں جہنم ہے۔

(۴) ایک مرتبہ بندہ سے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ سے میں نے سوال پوچھا کہ صحیح بخاری کے ابواب کی ترتیب اولیٰ ہے یا صحیح مسلم کی؟ کہ بخاری باب الوحی کو مقدم کرتا ہے اور مسلم ایمان کو' حضرت مولانا کاندھلویؒ نے فرمایا کہ بخاری کی ترتیب اولیٰ ہے' کیونکہ وحی قدیم ہے اور ایمان حادث ہے' قدیم حادث پر مقدم ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں تو یہ سن کر حضرت کاندھلویؒ اٹھ کر بیٹھ گئے فرمایا کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ:

(۱) وحی کا مبداء خالق ہے اور منتہی مخلوق ہے' ایمان کا مبداء مخلوق ہے اور اس کا منتہیٰ خالق ہے' وحی مبداء کے اعتبار سے افضل ہے اور ایمان مفضول ہے' ایمان منتہیٰ کے اعتبار سے افضل ہے اور وحی مفضول ہے جو منتہی کے اعتبار سے افضل ہو وہ مقدم ہے اس لئے ایمان مقدم ہے کیونکہ وہ منتہی کے اعتبار سے افضل ہے۔ **والیہ یصعد الکلم الطیب الایہ۔**

(۲) وحی خالق سے مخلوق کی طرف تنزل کرتی ہے اور ایمان مخلوق سے خالق کی طرف صعود کرتا ہے' وحی میں نسبت تنزلی پائی جاتی ہے اور ایمان میں نسبت صعودی' نسبت صعودی مقدم ہے نسبت تنزلی سے۔

(ایک اور دلیل دی تھی بندہ کو یاد نہیں رہی) یہ سن کر حضرت کاندھلویؒ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ مولوی نیاز جو تیری رائے وہی میرا فتویٰ ہے۔ بعد میں حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاریؒ کے تعمق نظر پر حیرت ہوتی ہے کہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ترتیب ہم دونوں کی رائے کے موافق پوری اترتی ہے۔
چنانچہ امام بخاریؒ کتاب الایمان کے بعد جلد ثانی میں کتاب فضائل القرآن میں "باب کیف نزول الوحی" پھر لا رہے ہیں' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدم وحدوث کو

مد نظر رکھتے ہوئے وحی کو مقدم لارہے ہیں اور مبدأ و منتہیٰ کے اعتبار سے افضلیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایمان کو وحی سے پہلے لا رہے ہیں، یہ بخاریؒ کی دقت نظر کا کمال ہے۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں ترجمۃ الباب کی حدیث میں مناسبت کے سلسلہ میں بہت سے نکات ہیں جو انشاء اللہ مستقل مضمون میں ذکر کئے جائیں گے۔ حضرت کاندھلویؒ والد صاحب کے استاذ تھے مگر والد صاحب کو عالم ربانی فرمایا کرتے تھے۔

(۵) ایک مرتبہ بندہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ والتین میں اشیاء اربعہ انجیر، زیتون، وادی سینا اور شہر مکہ ہی کی قسم کیوں کھائی ہے؟ کائنات میں اور بے شمار اشیاء موجود ہیں صرف انہی کو کیوں منتخب کیا ہے؟

اس پر فرمایا کہ اس کائنات کے موالید تین ہیں: جمادات، نباتات، حیوانات۔ ان کو موالید ثلاثہ کہتے ہیں۔ ان سب موالید کی ترکیب عناصر اربعہ آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے ہوتی ہے جو تقریباً ایک مسلّمہ چیز ہے اس پر کسی قسم کا استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان چار اشیاء کی قسم کھاکر گویا اشارہ فرمادیا کہ پوری کائنات کی قسم کھاتا ہوں، وہ یوں کہ انجیر اور زیتون کا تعلق عالم نباتات کے ساتھ ہے، اور یہ دونوں درخت اس کے افراد میں سب سے افضل و اشرف ہیں ان کو ذکر کردیا تو گویا اس نوع کے تمام افراد کو ذکر کردیا کیونکہ متبوع کے ذکر سے تابع لامحالہ ذکر ہوجاتا ہے، تو گویا عالم نباتات کی قسم کھائی ہے، اس کے بعد وادی سیناء کو ذکر کیا جس کا تعلق جمادات کے ساتھ ہے پھر جمادات دو طرح پر ہیں، ایک جمادات صحرائیہ یعنی وہ مقامات جہاں پر عام طور پر لوگوں کی آبادی نہیں ہوتی اور دوسرے جمادات عمرانیہ یعنی جہاں لوگوں کی آبادی ہوتی رہتی ہے جیسے شہر وغیرہ۔

وادی سینا جماد صحرائیہ کے افراد میں سب سے افضل و اشرف فرد ہے۔ یہ وہ فردؔ ہے جہاں موسیٰ کلیم اللہ بن کر لوٹے۔ چنانچہ حکم ہوا تھا "فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی" گویا عالم جمادات صحرائیہ کی قسم کھائی ہے۔

شہر مکہ کا تعلق جمادات عمرانیہ کے ساتھ ہے اور وہ ان میں افضل ترین فرد ہے تو "ھذا البلد الامین" کی قسم کھاکر گویا تمام عالم جمادات عمرانیہ کی قسم کھائی ہے، تو گویا پورے عالم جمادات اور عالم نباتات کی قسم کھاکر عالم حیوانات کے افضل ترین فرد "انسان" کے حسن تخلیق کو بیان کرتے ہیں، کیونکہ کائنات کے تمام منافع انسان کے واسطے ہیں،

وسخرلکم ما فی الارض جمیعا' اس لئے ایسی اشیاء چنی ہیں جن سے پوری کائنات کی طرف اشارہ ہوسکے اور چار کے عدد سے اشارہ ہے اس طرف کہ ان موالید ثلاثہ کی ترکیب اور ذریعہ بقا عناصر اربعہ ہیں۔ آگ' پانی' ہوا' مٹی۔ پھر فرمایا کہ یہ نکات بعد الوقوع ہیں' حقیقی مراد باری تعالیٰ ہی جانتے ہیں یہ صرف انسان کی ذہنی کاوش ہے۔

(۶) فرمایا کرتے تھے کہ کثرت ذکر سے عجب و کبر کا شبہ ہوتا ہے اور کثرت دعا سے تواضع و عجز مزید بڑھتا ہے اس لئے میں کثرت دعا کا اہتمام کرتا ہوں اور احادیث کی دعائیں پڑھتا رہتا ہوں' اس میں ذکر کا مفہوم بھی ادا ہوجاتا ہے اور عجب کا بھی خوف نہیں رہتا اور عجز واحتیاج بھی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔

(۷) بندہ کو وفات سے ایک روز قبل فرمایا کہ:

رب ادخلنی مدخل صدق (فی الجنۃ) واخرجنی مخرج صدق (من الدنیا بالرضا والرحمۃ) واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔

میں نے قرآن کی اس دعا میں اضافہ کیا ہے میں یہ پڑھتا ہوں تم آمین آمین کہو' چنانچہ والد صاحب پڑھنے لگے اور بندہ آمین کہتا رہا۔ پھر فرمایا کہ یہ دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت من مکہ الی المدینہ کے موقع پر پڑھی تھی' میں اس وقت پڑھتا ہوں کیونکہ یہ ہجرت من الدنیا الی الآخرۃ کا سفر ہے۔

(۸) i۔ جو بچہ زیادہ برتن توڑتا تھا اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ گھر میں کوئی شیشے وغیرہ کا گلاس وغیرہ توڑدیتا تو خوش ہوکر فرماتے یہ بہادر ہے' یہ بہادر ہے' انشاء اللہ جہاد میں اسی طرح کفار کی گردنیں توڑے گا' اور فرماتے کہ ہمارا نسبی رشتہ صلاح الدین ایوبیؒ سے ملتا ہے۔

ii۔ اسی طرح بچہ بستر پر پیشاب کردیتا تو والدہ محترمہ خفا ہوتیں کہ بستر ناپاک کردیا تو حضرت والد صاحب بھولے انداز میں پوچھتے کیا بات ہوا؟ والدہ شکایت کرتیں تو فرماتے معلوم ہوتا ہے اس کا گردہ کام کرتا ہے' پیشاب بنتا ہے' یہ صحت مند ہے' ورنہ پیشاب بند ہوجاتا تو وبال جان بیماری ہے' یہ اچھا ہے' یہ اچھا ہے تو والدہ خاموش رہ جاتیں۔

iii۔ اگر کسی بچے کو یا طالب علم کو مارنے پر مجبور ہوجاتے تو ایک تھپڑ پیٹھ پر مار کر فرماتے بھاگ جا اب!! اگر کوئی طالب علم ادب کی وجہ سے نہ بھاگتا اور مار کھاتا رہتا تو والد صاحب بے تاب ہوکر ادھر ادھر کھڑے ہوئے لوگوں کو فرماتے کہ اس کو کہو کہ بھاگ

جائے تاکہ غصہ ویسے ٹھنڈا ہو جائے مارنے کی ضرورت نہ پڑے۔
iv۔ بچپن میں بچوں کو مٹی میں کھلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ مٹی اس کا اصل گود ہے۔ اس میں یہ صحت مند ہوتا ہے اس لئے پہلوان مٹی میں کھیلتے ہیں تاکہ صحت مند ہو جائیں۔

(۹) حضرت والد صاحب اپنے چھوٹوں کو اور شاگردوں کو اپنے برابر بٹھاتے اور اکرام فرماتے تھے' اگر کوئی شاگرد ادب کی وجہ سے جھجک محسوس کرتا تو فرماتے کہ یہ تو ہماری دنیا کی تقسیم ہے' استاد شاگرد' چھوٹا بڑا' مگر کیا معلوم اللہ کے نزدیک کون زیادہ محبوب اور قابل احترام ہے' اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ اس شخص کا اکرام مجھ سے نہ رہ جائے جو اللہ کے ہاں مکرم ہے' پھر وہ حدیث سناتے کہ:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شان و شوکت سے سواری پر جاتے ہوئے منافق کے بارے میں پوچھا کہ اس کے بارے میں کیا خیال ہے تو صحابہ نے اس کے بڑے آدمی ہونے کی گواہی دی' اس کے بعد ایک غریب مخلص مسلمان کے بارے میں پوچھا تو صحابہ نے عرض کیا کہ اس بیچارے کی معاشرہ میں کوئی وقعت نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر پہلے والے شخص کی طرح کے لوگوں سے دنیا بھر جائے تو بعد والے شخص کے برابر نہیں ہو سکتے"۔

یہ عالم تھا تواضع اور خوف خداوندی کا۔

(۱۰) حضرت والد صاحبؒ کی وفات سے ایک رات قبل یعنی دوشنبہ (پیر کی رات) میں دین پور شریف کے قبرستان کے متولی حضرت مولانا اللہ بخش صاحبؒ کے پوتے مولانا محمد الیاس صاحب دامت برکاتہم جو حضرت والد صاحب کے شاگرد بھی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے رات کو خواب دیکھا کہ حضرت مولانا نیاز محمد صاحبؒ کا جنازہ قبرستان لایا گیا' میں نے دیکھا تو بہت زیادہ روشن ہو رہے ہیں اور ان کے اعضاء بالکل زندوں کی طرح تروتازہ ہیں' ہاتھ پاؤں مڑجاتے ہیں' ذرا بھی سختی یا اکڑ پیدا نہیں ہوئی' تو میں سوچ رہا ہوں کہ یہ اگر فوت شدہ ہیں تو پھر جسم زندوں کی طرح کیوں ہے؟ اور اگر زندہ ہیں تو یہ لوگ جنازہ بنا کر کیوں لائے ہیں؟ اتنے میں سامنے سے نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم بڑی شان وشوکت اور وقار وسکینہ سے تشریف لا رہے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ ہم اپنے آدمی کا استقبال کرنے آئے ہیں، ہم اس کی تدفین کرنے آئے ہیں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی اور صبح قبرستان جاکر سب سے بہترین جگہ قبر کی پہلے سے مقرر کردی۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع آئی کہ حضرت مولانا کا انتقال ہوگیا ہے اور حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی دامت برکاتہم اور برادرم سراج احمد قبر کی جگہ لینے آئے تو میں نے کہا کہ میں تو آپ حضرات کا انتظار کررہا ہوں۔"

اس نوعیت کے مبشرات اور بھی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ حضرت والد صاحبؒ مرحوم ومغفور ہیں۔

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

(بینات شعبان ۱۴۱۲ھ مطابق مارچ ۱۹۹۲ء)

حضرت مولانا مفتی علی محمدؒ

۳۰ر جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ مطابق ۶ر جنوری ۱۹۹۲ء کو آسمان علم کے دو درخشندہ ستارے غروب ہوگئے (۱) پنجاب کی مشہور دینی درس گاہ دار العلوم کبیر والا کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی علی محمد رحمہ اللہ دو شنبہ کی رات کو دو بجے واصل بحق ہوئے۔ (۲) اور مدرسہ جامع العلوم عیدگاہ بہاول نگر کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی نیاز محمد ختنی رحمہ اللہ اسی دوشنبہ کے دن بوقت چاشت سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون' ان للہ ما اخذ' ولہ ما اعطی وکل عندہٗ باجل مسمّیٰ۔

حضرت مولانا علی محمدؒ کی ابتدائی اور وسطانی تعلیم اپنے علاقہ میں حضرت مولانا شیر محمدؒ اور حضرت مولانا عبد الخالقؒ کے یہاں ہوئی۔ دورۂ حدیث کی تکمیل کے لئے دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے' اور حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علیؒ اور امام معقول ومنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی (قدس اللہ اسرارھم) سے فاتحہ فراغ پڑھا۔ اور حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے ہاتھ پر بیعت سلوک سے مشرف ہوئے۔

فراغت کے بعد موضع "نڑہال" میں استاذ محترم حضرت مولانا عبد الخالقؒ کی زیر سرپرستی تدریس کا آغاز فرمایا (یہ مدرسہ ان دنوں "فنون" کی تعلیم کے لئے بہت مشہور تھا' ہم نے بھی اپنی طالب علمی میں اس کا شہرہ سنا تھا' مگر وہاں کی دیہاتی بود وباش کے مجاہدہ کی ہمت نہ ہوسکی) کچھ عرصہ بعد استاذ محترم ان کو اپنا جانشین بناکر خود تدریس کے لئے دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ یہ حضرت مولانا کی صحت وجوانی کا زمانہ تھا اس لئے بھرپور مجاہدہ کا حق ادا کردیا اور ایک ایک دن میں ۱۹' ۱۹ سبق تک پڑھانے کی نوبت آئی' ۱۹۵۱ء میں استاذ محترم نے قاسم العلوم ملتان میں صدارت تدریس کی مسند آراستہ کی تو ان کے حکم سے "نڑہال" سے قاسم العلوم ملتان آگئے اور وہاں "استاذ الادب والحدیث" مقرر ہوئے۔

۱۹۵۶ء میں استاذ محترم حضرت مولانا عبد الخالقؒ نے گلشن مدنی قاسم العلوم ملتان کو

چھوڑ کر کبیر والا کے ویرانہ کو گلشن بنانے کا فیصلہ کیا اور وہاں ایک نئے "دار العلوم" کی طرح ڈالی تو اپنے لائق شاگرد ہمارے ممدوح مولانا علی محمدؒ کو وہاں آنے کی باصرار دعوت دی، لیکن حضرت مولانا نے اپنے شیخ حضرت شیخ الاسلام مدنی ؒ کے حکم کے بغیر اس دعوت کو قبول کرنے میں تامل فرمایا۔ بالآخر حضرت شیخ الاسلامؒ کے حکم سے ملتان سے دار العلوم کبیر والا منتقل ہوگئے اور پھر تادم آخر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

۱۹۵۸ء میں دار العلوم کبیر والا میں دورۂ حدیث کا آغاز ہوا، پہلے سال صحیح بخاری حضرت مولانا عبد الخالقؒ نے پڑھائی۔ دوسرے سال بخاری شریف کی ایک جلد مولانا عبد الخالقؒ کے پاس اور دوسری مولانا علی محمدؒ کے پاس ہوئی اور تیسرے سال سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کی تدریس مستقلاً آپ کے ذمہ ہوگئی۔ اس دوران "دار الافتا" میں فتویٰ نویسی بھی آپ سے متعلق رہی۔

۱۹۷۴ء سے دار العلوم کا انتظام وانصرام بھی آپ سے متعلق کردیا گیا تو صحیح مسلم اپنے رفیق محترم مولانا منظور الحقؒ کے حوالے کردی اور صحیح بخاری خود پڑھاتے رہے۔ اس طرح اٹھائیس مرتبہ صحیح بخاری شریف پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ کچھ عرصہ قبل جب صحت درس وتدریس کی متحمل نہ رہی تو صحیح بخاری کا درس بھی اپنے تلمیذ رشید جناب مولانا مفتی عبد القادر زید مجدہٗ کے حوالے کردیا۔

حضرت مولانا مرحوم قرون اولیٰ کی یادگار تھے، زہد وقناعت، عبادت و تقویٰ، بے نفسی وکم گوئی ان کا خصوصی شعار تھا، مرنجان ومرنج آدمی تھے، چہرۂ مبارک پر علوم نبوت کی تعلیم وتدریس کے انوار نمایاں تھے۔ پوری زندگی قال اللہ وقال الرسول میں بسر کردی۔ الغرض حضرت مرحوم اپنے دور کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔

حضرت مرحوم ایک عرصہ سے بیمار چلے آرہے تھے اور جاذبۂ لقائے محبوب روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ شب دوشنبہ کو پونے دو بجے وقت موعود آپہنچا اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔ نماز جنازہ بعد از ظہر جامعہ خیر المدارس کے مفتی اعظم جناب مفتی عبد الستار صاحب زید فیضہٗ نے پڑھائی جس میں ایک اندازے کے مطابق ستر ہزار افراد نے شرکت کی جن میں علماء وصلحاء کی تعداد نمایاں تھی، دار العلوم کے متصل اپنی مملوکہ جگہ میں تدفین ہوئی

ع آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

(بینات شعبان ۱۴۱۲ھ مطابق مارچ ۱۹۹۲ء)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رح

۱۲ار رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷ مارچ کو امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری رح کے مایۂ ناز شاگرد محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی نے سفر آخرت فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم اپنے علم وفضل میں اپنے نامور اسلاف کی یادگار تھے۔ ان کا وجود محض ایک فرد کا وجود نہیں تھا بلکہ ایک انجمن اور ایک ادارے کی حیثیت رکھتا تھا۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان کو آخری دور میں علم حدیث کی خدمت کے لئے چن لیا تھا۔

کتب حدیث پر ان کی محققانہ تعلیقات اور دیگر علمی تالیفات ان کے بلند پایہ علمی ذوق، علوم حدیث میں ان کی مہارت، بالخصوص حدیث کے اطراف ومتون اور رجال پر ان کی وسیع نظر کی شاہد عدل ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان کی عمر میں برکت فرمائی تھی اور انہیں حدیث نبوی "من طال عمرہ وحسن عملہ" کا مصداق بنایا تھا۔

ہفت روزہ تعمیر حیات لکھنؤ میں جناب مولانا محمود الازہار ندوی نے حضرت مرحوم پر ایک مختصر سا مضمون رقم فرمایا ہے جس میں مختصرا ان کی حیات طیبہ اور ان کے علمی مآثر کے بارے میں اچھی معلومات جمع کردی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ یہ مضمون قارئین کی خدمت میں پیش کردیا جائے:

"ممتاز عالم دین اور محدث کبیر مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی کا ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء کو انتقال ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا حبیب الرحمان اعظمی علم حدیث اور فن اسماء الرجال کے ممتاز عالم تھے۔ درس و تدریس اور فن حدیث سے آپ کا انہماک مستقل رہا ہے اور آپ کی تحریریں اور مراجعات بڑی اہمیت کے مالک ہیں اور اہل علم بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولانا کا شمار فن حدیث اور اسماء الرجال کے چوٹی کے علماء میں ہوتا تھا جس کی گواہی آپ کی علمی کاوشیں دیتی ہیں۔

مولانا کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام ...... مولانا محمد صابر تھا اور آپ نے دارالعلوم دیوبند میں کچھ وقت گزارا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا انور شاہ کشمیری' مفتی عزیز الرحمان دیوبندی' علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا کریم بخش سنبھلی اور مولانا عبدالغفار صاحب مئوی قابل ذکر ہیں۔

آپ نے ۱۳۲۹ھ میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اسی سال سے دارالعلوم مئو میں تعلیمی خدمات انجام دینا شروع کردیں۔ دو تین سال کے بعد مدرسہ مظہرالعلوم بنارس چلے گئے اور وہاں علوم نقلیہ و عقلیہ کی تعلیم دی' اس کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم از سرنو قائم کیا اور اس سے پوری طرح وابستہ ہوگئے' آپ نے تدریسی خدمات ہی کے تحت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آکر بخاری شریف کا درس دیا۔

مولانا فن حدیث میں امام طحاویؒ کی تصنیفات سے سب سے زیادہ متاثر تھے .... اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کا بھی اثر تھا اور فقہ میں ابن ہمامؒ اور شامیؒ کی تدقیقات کے قائل تھے۔

آپ نے حج و زیارت کے ساتھ علمی تلاش و جستجو کے سلسلہ میں کویت' بیروت' دمشق اور بحرین کا بھی سفر کیا اور ان اسفار میں ان کے ہمراہ مولانا ضیاء الحسن ندوی مرحوم تھے۔ جن کا اشتغال بھی حدیث سے بہت بڑھا ہوا تھا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔

مولانا کا شمار ان محققین و علماء میں تھا جن کے علم و فضل کا سکہ پوری دنیا میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی شہرت و عظمت کی بنیاد فن حدیث کی وہ اہم و نادر کتابیں ہیں جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق و ترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا' ان میں مسند حمیدی' (دو جلد) کتاب الزہد والرقاق جو گیارہ اجزاء' ۱۶۲۷ حدیثوں پر مشتمل ہے' سنن سعید بن منصور دو جلدیں' **المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ للحافظ ابن حجر عسقلانی۔**

مصنف عبدالرزاق مسند احمد کے علاوہ آپ نے زوائد مسند بزار للہیثمی' علامہ محمد طاہر گجراتی صاحب مجمع البحار کا فن رجال سے متعلق رسالہ التوسل' تعلیقات کتاب الثقات لابن شاہین الاتحافات السنیہ لذکر محدثی الحنفیہ' اور **الحاوی لرجال الطحاوی** وغیرہ کی بھی تحقیق و مراجعت کی' مولانا نے علمی و تحقیقی مقالات بھی تحریر فرمائے جو معارف اعظم گڑھ' برہان دہلی دارالعلوم دیوبند' العدل گوجرانوالہ' الفرقان بریلی اور لکھنؤ' البلاغ بمبئی اور النجم لکھنؤ میں شائع ہوئے' آپ عربی زبان وادب میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور عربی مقالات منجملہ دیگر رسائل و کتب کے البعث الاسلامی میں بھی شائع ہوئے۔

مولانا نے منکرین حدیث کے رد میں نصرۃ الحدیث' شیعوں کی رد میں رفع المجادلۃ اور رضاخانیت کے رد میں شارح حقیقی (**النذو لاولیاء اللہ**) بھی لکھے' اس کے علاوہ مولانا نے متعدد رسالے تحریر فرمائے جو ان کے علمی اشتغال پر دال ہیں۔

مولانا نے ایک طویل عمر پائی مگر اس کو علمی و تحقیقی کاموں کے لئے وقف کردیا تھا۔ دارالعلوم مئو' مظہر العلوم بنارس میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے رفیق کار مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی مرحوم اور مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم

کے ساتھ مل کر مفتاح العلوم میں بڑا وقت گزارا اور عرصۂ دراز تک تدریسی خدمات اعزازی طور پر انجام دیتے رہے، مولانا ۱۹۵۲ء میں اتر پردیش کونسل (ودھان پریشد) کے پانچ سال ممبر رہے اور آپ کی علمی اور تحقیقی خدمات کی وجہ سے حکومت ہند نے آپ کو صدارتی انعام سے نوازا۔

مولانا نے اپنی عمر کے آخری ایام میں مدارس دینیہ سے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے حدیث وفقہ میں اختصاص کے لئے المعہدالعالی قائم کیا اور ثانوی ومتوسط کے طلبہ کے لئے مرقاۃ العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔

مولانا کے پسماندگان میں دو لڑکے اور چار بیٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے غمگساروں میں شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ دعا ہے کہ "اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔" آمین

اور تعمیر حیات ہی میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے تاثرات ان الفاظ میں نقل کئے ہیں:

"حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی کی وفات (۱۱ر رمضان المبارک مطابق ۱۷ مارچ ۱۹۹۲ء) سے علوم دینیہ بالخصوص .... فن حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور خلا پیدا ہوا ہے اس کا احساس بہت سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے جس کی برصغیر ہندوپاک ہی نہیں ممالک عربیہ اور مرکز اسلام پر بھی نظر ہے اور وہاں کے علماء اساتذہ، مصنفین و محققین سے بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقفیت ہے، علم حدیث خاص طور پر عالمی وعلمی پیمانہ پر جس انحطاط اور تنزل کا شکار ہے اور اس فن شریف کی واقفیت میں جو سطحیت اور اسمیت پیدا ہوگئی ہے اور خاص طور پر حدیث وروایات صحیحہ اور فقہ حنفی کے درمیان تطبیق اور اس علمی حقیقت کے ثابت کرنے میں کہ مذہب

حنفی حدیث کے خلاف نہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اور خلفائے کبار محض قیاس وذہانت پر اعتماد نہیں کرتے تھے' ان کا ماخذ استنباط احکام میں آیات واحادیث ہی ہوتی تھیں' اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولانا کے ارتحال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اور بھی قابل افسوس وتشویشناک ہے۔

اس علمی تفرد وامتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق' فہم وفراست' ملت کے مسائل ومفادات سے واقفیت وفکر مزید بر آں ہے' اس لئے نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے' بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے' درجات بلند کرے اور اہل علم ودرس کو ان کی تصنیفات وتحقیقات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور فن حدیث سے اشتغال وانہماک کا سلسلہ جاری رہے۔"

حضرت مولانا مسیح اللہ خان رحؒ

۱۶ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادی کا وصال ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً شاملۃً کاملۃً۔

حضرت مرحوم، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے اجلۂ خلفاء میں تھے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنے آخری دور علالت میں اپنے گیارہ خلفاء کے اسمائے گرامی اس تصریح کے ساتھ شائع فرمائے تھے کہ "ان کے طرز تعلیم پر مجھے اعتماد ہے" ان گیارہ حضرات کی فہرست میں حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔

حضرت مرحوم ۱۳۲۹ھ میں ضلع علی گڑھ کی ایک بستی سرائے برلہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے سرکاری اسکول میں درجہ ششم تک ہوئی، اسی دوران بہشتی زیور اور حضرت حکیم الامت کے مواعظ شریفہ کا مطالعہ جاری رہا، لیکن چونکہ ابتدا ہی سے طبیعت نیکی وپارسائی کی طرف تھی اور بچپن ہی سے طاعت وعبادت کا ذوق تھا۔ اس لئے والد ماجد نے اسکول سے اٹھا کر فارسی وعربی کی تعلیم شروع کرادی۔ ابتداء سے مشکوٰۃ شریف تک کی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ ۱۳۵۰ھ میں دورۂ حدیث کے لئے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سے دورۂ حدیث کی تکمیل فرمائی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ بچپن ہی سے عقیدت ومحبت تھی۔ آپ کے مواعظ شریفہ اور تصنیفات کا مطالعہ بھی شروع ہی سے جاری تھا جس سال دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اسی سال حضرت حکیم الامتؒ سے

باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم کرلیا۔ شعبان ۱۳۵۱ھ میں حضرت حکیم الامت ؒ نے آپ کو اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا' اور حضرت حکیم الامت ؒ کے حکم سے جلال آباد میں (جو تھانہ بھون کے قریب ہے) اقامت پذیر ہوئے اور مدرسہ مفتاح العلوم کا اجرا فرمایا جہاں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی تھی' صحیح بخاری کی تدریس حضرت خود فرماتے تھے' اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک علوم نبوت کی نشر واشاعت اور اصلاح وارشاد میں بتوفیق ایزدی مشغول رہے۔

حق تعالیٰ شانہ' کی عنایت خاصہ نے حضرت مرحوم کو چند خصائص سے نوازا تھا جو اس زمانے میں نادر الوقوع ہیں۔

اول یہ کہ حق تعالیٰ شانہ' نے بچپن ہی سے طاعت وعبادت اور اہل اللہ سے تعلق کا ذوق عطا فرمایا تھا۔ بچپن اور جوانی کا زمانہ عام طور سے لا ابالی کا دور ہوتا ہے مگر حضرت مرحوم ابتدا ہی سے زاہد شب زندہ دار تھے' اور حق تعالیٰ شانہ' نے ان کو حدیث نبویؐ **شاب نشأ فی عبادۃ اللّٰہ** کا مصداق بنایا تھا۔ (حدیث میں ہے کہ سات آدمیوں کو قیامت کے دن عرش الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا جس دن کہ اس کے عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ انہی سات خوش بخت انسانوں میں ایسے نوجوان ...... کا ذکر فرمایا جس کی نشو ونما اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوئی ہو)۔

دور طفولیت ہی سے جو طبیعت نیکی کی خوگر ہوگئی ہو اسّی برس کے سن کو پہنچ کر اس میں نیکی کا ذوق ومزاج کس قدر پختہ ہوگیا ہوگا' اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

دوم: فنائیت وتواضع انسانیت کا سب سے بلند ترین جوہر ہے جس پر بے شمار اخلاقی کمالات متفرع ہوتے ہیں' جیساکہ عجب وکبر' خود پسندی وخود رائی نفسانی رذائل میں سب سے بدتر رذیلہ ہے جس کو حضرات صوفیاؒ "ام الامراض" سے تعبیر کرتے ہیں حق تعالیٰ شانہ' نے حضرت کو فنائیت کے جوہر انسانیت سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا' گویا ارشاد نبویؐ "**انتم بنو ادم وادم من تراب**"

(ابو داؤد ص ۶۹۸' ج۔ ۲)

"تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے"۔ پر آپ کی نظر ہمیشہ جمی رہتی تھی۔ اس لئے کبر وتعلّی کا وہاں دور دور پتہ نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنے تئیں سب سے کمتر سمجھتے ہیں' ہر شخص کے ساتھ سراپا

شفقت و رافت تھے، کسی انسان کو کیا معنی؟ کسی حیوان کو بھی اپنی ذات سے تکلیف پہنچ جانا گوارا نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں آپ کے متعدد واقعات معروف و مشہور ہیں۔

سوم: کسی شخص کو اپنے اکابر کا اعتماد حاصل ہونا دولت کبریٰ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری وقت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی تسلی کے لئے فرمایا:

لقد صحبت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاحسنت صحبتہ، ثم فارقک وھو عنک راضٍ، ثم صحبت ابا بکر رضی اللّٰہ عنہ فاحسنت صحبتہ، ثم فارقک وھو عنک راضٍ، ثم صحبت المسلمین فاحسنت صحبتھم ولئن فارقتھم لتفارقنھم وھم عنک راضون۔

"آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، پس حسن وخوبی کے ساتھ آپؐ کی صحبت کا حق ادا کردیا، پھر آپؐ اس حال میں دنیا سے تشریف لے گئے کہ وہ آپ سے راضی تھے، پھر آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحبت اٹھائی پس حسن وخوبی کے ساتھ ان کی رفاقت کا حق ادا کردیا وہ آپ سے اس حال میں جدا ہوئے کہ وہ آپ سے راضی تھے، پھر آپ نے مسلمانوں کی صحبت پائی، پس حسن وخوبی کے ساتھ ان کا حق رفاقت ادا کیا۔ اب اگر آپ ان سے جدا ہوں گے تو اس حال میں جدا ہوں گے کہ وہ آپ سے راضی ہوں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

اما ماذکرت من صحبۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ورضاہ فانما ذالک من من اللّٰہ من بہ علی واما ما ذکرت من صحبۃ ابی ابکر ورضاہ فانما من من اللّٰہ من بہ علی (مشکوٰۃ ص ۵۵۹)

"تم نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی رضامندی کا ذکر کیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر انعام تھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا اور جو تم نے حضرت

ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور ان کی رضامندی کا ذکر کیا ہے
سو یہ بھی مجھ پر اللہ تعالیٰ کا انعام تھا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے
مجھ پر احسان فرمایا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اکابر کی صحبت و رفاقت میسر آنا اور ان حضرات کا اس حال میں دنیا سے رخصت ہونا کہ وہ اس پر اعتماد کرتے ہوں اور اس سے راضی ہوں یہ حق تعالیٰ شانہ، کا انعام عظیم ہے۔

حضرت مرحوم کو حق تعالیٰ شانہ، نے اس نعمت سے ممتاز و مفتخر فرمایا تھا۔ صرف ایک سال کے اصلاحی تعلق کے نتیجہ میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی طرف سے خلافت واجازت کا ملنا آپ کے جوہر عالی کی نشاندہی کرتا ہے' اور پھر آخری ایام میں حضرت حکیم الامت" کا آپ کو اپنے ان گیارہ خلفاء کی فہرست میں شامل کرنا جن پر حضرت کو اعتماد تھا' یہ حق تعالیٰ شانہ، کا آپ پر انعام عظیم تھا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے شیخ و مرشد حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ذوق ومزاج اور طریق تعلیم و تربیت کو پوری طرح جذب کرلیا تھا۔ ایک موقع پر حضرت حکیم الامت" نے فرمایا تھا کہ عیسیٰ و مسیح دونوں بڑھ گئے۔ (عیسیٰ سے مراد حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ مولف "انفاس عیسیٰ" ہیں' اور مسیح سے مراد حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب")

آپ کے ان امتیازی اوصاف وکمالات کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ شانہ، نے آپ کو جاذبیت اور محبوبیت عطا فرمائی' ہندوپاک سے لے کر افریقہ اور مغربی ممالک تک آپ کا سلسلہ پھیلا اور بے شمار حضرات اس کے چشمۂ فیض سے مستفیض ہوئے۔

سن مبارک چوراسی سال کے قریب تھا۔ طبعی اضمحلال اور مختلف عوارض کا سلسلہ ایک عرصہ سے چل رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ سے صاحب فراش چلے آرہے تھے تاآنکہ شب جمعہ ۱۶ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ کو وقت موعود آپہنچا اور ذکر الٰہی میں مشغول ہونے کی حالت میں واصل بحق ہوئے۔

اللھم اغفرلہٗ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ داراً خیرًا من دارہ واھلاً خیرًا من اھلہ اللھم لا تحرمنا اجرہٗ ولاتفتنا بعدہٗ

حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں حضرت اقدس مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ پاکستان میں آخری خلیفہ تھے اور ہندوستان میں صرف دو اکابر تھے۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق مدظلہ العالی۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان کے رخصت ہوجانے کے بعد گلشن اشرفی کا صرف ایک پھول باقی رہ گیا اللہ تعالیٰ ان کو تادیر سلامت باکرامت رکھے۔ آمین

اہلیہ محترمہ مولانا مفتی نیاز محمد ختنیؒ

گزشتہ سال ۲۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ مطابق ۶ر جنوری ۱۹۹۲ء بروز دو شنبہ حضرت مولانا مفتی نیاز محمد ختنی ترکستانی شیخ الحدیث مدرسہ جامع العلوم عیدگاہ....... بہاول نگر کا انتقال ہوا تھا' ابھی ان کا صدمہ نہیں بھولا تھا کہ شمسی حساب سے ٹھیک گیارہ مہینے بعد.........۹ر جمادی الاخریٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۹۲ شب یک شنبہ کو ۸ بجے ان کی اہلیہ محترمہ عارضۂ قلب سے رحلت فرماگئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میری فرمائش پر مرحومہ کے صاحبزادے میرے عزیز داماد مولوی منیر احمد سلمہٗ نے اپنی والدہ مرحومہ کے بارے میں کچھ تاثرات قلمبند کئے ہیں جو کافی سبق آموز ہیں' ذیل میں انہی کے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں:

"والدہ مرحومہ حضرت قاری ابوالحسن صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ حضرت والد صاحب مولانا مفتی نیاز محمد ختنیؒ جب اپنے اکابر اساتذہ کے حکم سے بہاول نگر میں فروکش ہوئے اور مدرسہ جامع العلوم عیدگاہ بہاول نگر کی ذمہ داری سنبھال لی تو یکہ و تنہا اور غریب الوطن تھے' یہاں نہ ان کا کوئی رشتہ دار تھا' نہ شناسا بلکہ ٹھیک طرح ان کی کوئی زبان بھی نہیں سمجھتا تھا' حضرت قاری صاحبؒ نے حضرت والد ماجد کے علم و تقویٰ کو دیکھ کر محض رضائے الٰہی کے لئے اپنی چہیتی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔

والدہ مرحومہ میں اپنے والد محترم حضرت قاری صاحبؒ کے اخلاق و صفات کی نمایاں جھلک نظر آتی تھی۔ وہ جس گھر میں بیاہ کر آئی تھیں وہاں اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کچھ نہیں تھا' غریب سے غریب گھر میں بھی کچھ نہ کچھ ہوتا ہوگا مگر اس درویش خدامست کے پاس واقعۃً کچھ بھی نہیں تھا' والدہ ماجدہ نے صبر و رضا' زہد و قناعت' ہمت و استقلال' خوش دلی اور انشراح قلب کے ساتھ اس گھر کو اس

طرح آباد کیا کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ حضرت والد ماجد والدہ مرحومہ کے اس موروثی جوہر کے ہمیشہ معترف رہے۔ ہمیں مخاطب کر کے اپنے مخصوص لہجے میں فرماتے تھے کہ "تمہارا ماں ولیہؒ ہے' اس کی قدر کیا کرو"۔ یہ خدمت سے ذرا نہیں گھبراتی۔ ان شاء اللہ' اللہ تعالیٰ کے یہاں مخدومہ ہوگی۔ اور کبھی فرماتے تھے کہ "میں اپنا وطن قبیلہ اور خاندان چھوڑ کر یہاں تن تنہا آیا تھا اس عورت نے مجھے پورے کنبہ وقبیلہ کا سہارا دیا"۔

حضرت نانا جی قاری ابو الحسن صاحبؒ' حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمہ اللہ کے خصوصی خدام میں سے تھے' بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عجیب وغریب اوصاف سے نوازا تھا۔ بارہ سال کی عمر تھی کہ حضرت شاہ صاحب کی عنایت خاصہ کا مورد بنے۔ جوان ہوئے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے انہیں قرآن کریم کی خدمت کے لئے .... منچن آباد بھیج دیا (جو کہ بہاول نگر کی ایک تحصیل ہے) قاری صاحب اس وقت سبزہ آغاز تھے' لوگوں کو کم سنی کی شکایت ہوئی تو حضرت مولانا اللہ بخش صاحبؒ بہاول نگری خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے فرمایا کہ "ان کی عمر کو نہ دیکھو یہ دیکھو کہ انتخاب کس کا ہے۔ انشاء اللہ فیض پھیلے گا۔" پھر دنیا نے دیکھا کہ وہ فیض پھیلا کہ باید وشاید' لاہور' شیخوپورہ' قصور' بہاول پور اور رحیم یار خان تک لوگوں نے ان کی ذات سے استفادہ کیا' اور کئی ہزار حفاظ نے ان کے زیر سایہ رہ کر قرآن کے نور سے سینے منور کئے' ان کے شاگرد حفظ کی پختگی' ادائیگی اور روانگی اور تجوید وقرأت کے حسن سے فوراً پہنچانے جاتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ تہجد کے وقت سے لے کر رات عشاء کے بعد تک انسانوں کو پڑھاتے تھے۔ اور رات بارہ بجے کے بعد سے جنات آکر ان سے پڑھتے تھے۔ رات کو صرف دو گھنٹے آرام کرتے تھے۔ ایک روز اہلیہ نے پوچھا کہ رات کو کون پڑھتا ہے؟ تو فرمایا کہ اللہ کی بندی! ایسی مخلوق آتی ہے جو تیری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ بڑے صاحب کرامت اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ علاقے میں سیلاب آگیا اور تقریباً شہر میں داخل ہو چکا تھا جو بند باندھے جاتے وہ ٹوٹ جاتے۔ یہاں تک کہ لوگ حضرت قاری صاحب کے پاس دعا کروانے آئے تو آپ نے وہیں سے مٹی اٹھائی جہاں کھڑے تھے اور دم کر کے دے دی اور

فرمایا کہ اس مٹی کو پانی میں ڈال دو۔ لوگوں نے وہ مٹی جوں ہی پانی میں ڈالی یکایک سیلاب کا رخ بدل گیا اور علاقہ طغیانی سے محفوظ رہا۔

ایک مرتبہ چور گھر میں گھس آئے' چوروں نے عجیب منظر دیکھا کہ ہر طرف قاری صاحب کا نقش نظر آرہا ہے اور دہشت وخوف سے چور بھاگ گئے اور صبح کو حضرت قاری صاحب کے ہاتھ پر توبہ کرلی۔ اس نوعیت کے متعدد واقعات ان کے کشف وکرامات کے مشہور ومعروف ہیں۔

حضرت قاری صاحب کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹے کے پہلو پر صاف کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ بہت ہی عجیب وغریب صفات کا مالک تھا۔ سات سال کی عمر میں ہی انتقال کرگیا تھا۔

مرحومہ عابدہ زاہدہ تھیں' عجز وانکساری کا پیکر تھیں' ہر ایک کی خدمت بلا امتیاز کرنا ان کا وصف خاص تھا' پوری زندگی خدمت میں گزاری' اور اپنی خدمت قطعاً نہیں کروائی' یہی ان کی تمنا تھی کہ چلتے پھرتے رخصت ہو جاؤں محتاجی نہ ہو' ہمیشہ ہمت و طاقت کی دعا فرماتی رہتی تھیں کہ یا اللہ مجھے ہمت دیئے رکھ تاکہ اپنی ماں اور اپنے شوہر کی کماحقہ خدمت کرسکوں' اور واقعی خدمت کا حق ادا کردیا کہ اس دور میں اس کا تصور بھی مشکل ہے' ماں اور حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد رویا کرتی تھیں کہ اب کس کی خدمت کروں وہ دونوں تو جنت کی ہواؤں کے مزے لوٹ رہے ہیں اور مجھ ناکارہ کو بھول گئے کیا پتہ تھا کہ سال کے اندر یہ خادمہ بھی اپنے مخدومین کے پاس پہنچ جائے گی' صلہ رحمی' ہر ایک سے حسن ظن' ہر ایک کے دکھ سکھ میں شرکت' غریب پروری' مہمان نوازی' غرباء ومساکین اور دینی طلبہ پر خصوصی شفقت کے اوصاف حمیدہ سے متصف تھیں۔ مدرسہ کے درجہ حفظ کے ننھے منے طلبہ کو گھر بلا بلا کر صبح ناشتہ کرواتی تھیں اور اگر مدرسہ میں ان کی رہائش کا انتظام نہ ہوتا تو گھر میں ان کے رہنے کا انتظام کردیتیں' ان کے حلقہ میں غرباء ومساکین کی کثرت رہی' حب المساکین کی نعمت اللہ تعالیٰ نے وافر عطا فرمائی تھی۔ مدرسہ کی تعمیر وترقی میں حضرت مفتی صاحب کی بہت معاون رہیں کیونکہ حضرت مفتی صاحب نہ یہاں کی زبان سے زیادہ واقف اور نہ یہاں کے ماحول ومعاشرت سے مناسبت رکھتے تھے۔

مرحومہ کی والدہ محترمہ فالج کی مریضہ ہوگئی تھیں' اور ڈھائی سال تک بستر پر تھیں یہاں تک کہ پیشاب وغیرہ کے لئے بھی نہ اٹھ سکتی تھیں مگر مرحومہ نے جس محبت وجانفشانی سے اپنی ماں کی خدمت کی اس کی نظیر بہت خال خال نظر آتی ہے اور تعجب یہ کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ آیا۔ کبھی بچے کہتے کہ اماں جی! آپ آرام کرلیں سارا دن تو خدمت کرتی رہی ہیں تو فرماتیں کہ "بھئی تمہاری نانی ہے مگر میری تو ماں ہے تمہیں اپنی ماں کے آرام کا خیال ہے کیا مجھے اپنی ماں کے آرام کا خیال نہ ہو"۔ اور ساری رات جاگتے ہوئے گذار دیتی تھیں۔

والدہ ماجدہ کے عقد نکاح کا مسئلہ پیش آیا تو بندہ کی نانی مرحومہ نے حضرت نانا جی قاری ابو الحسن ؒ کے چھوٹے بھائی محترم قاری محمد رفیق صاحب دامت برکاتہم کو لڑکا دیکھنے کے لئے روانہ کیا۔ چنانچہ محترم قاری صاحب بہاول نگر مدرسہ جامع العلوم عید گاہ تشریف لائے اور والد ماجد مفتی نیاز ختنی ؒ (نور اللہ مرقدہ) سے ملاقات کی تو جو کچھ دیکھا نانی صاحبہ سے ان الفاظ میں ذکر کیا:

> "اے حاجن اللہ کی بندی! اگر دنیا چاہیئے تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے ایک ٹوٹی پھوٹی چائے دانی' دو چار پرانے سے کپ' ایک پھٹا پرانا سا مصلیٰ' ایک بوسیدہ قسم کا کمبل اورچند کتابیں' یہ اس درویش کی کل کائنات ہے اور اگر علم وتقویٰ چاہتی ہو تو میں نے اس فقرودرویشی میں بھی اس کو مطالعہ کرتے ہوئے پایا اور اس سے بڑھ کر علم وتقویٰ والا میں نہیں جانتا"۔

نانی مرحومہ نے نیکی وتقویٰ کو بنیاد بناکر رشتہ منظور کرلیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور عنایات کی وہ بارش برسائی کہ تقویٰ وللّٰہیت کی دولت عظمیٰ کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھی ہر نعمت سے خوب جی بھر کے نوازا۔ ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب الخ۔

اور حضرت ناناجی مرحوم نے تو بس اتنا سنا کہ ایک غریب الوطن عالم دین ہے تو بس رشتہ منظور کرلیا۔ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اس توکل علی اللہ کی برکت سے حق تعالیٰ نے وہ نوازا کہ آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔

والدہ مرحومہ طبیعتاً بہت سادہ لوح' بھولی بھالی اور صاف دل تھیں۔ کسی قسم کی چالاکی اور تیزی جو عام طور پر عورتوں میں پائی جاتی ہے کا تصور بھی نہیں تھا۔ انتقام یا کینہ پروری کا خیال بھی محال تھا۔ برسوں کا دشمن ایک مرتبہ ہنس کر بات کرلیتا تو سارے غم بھول جاتی تھیں اور اس کی ایذاؤں' تکلیفوں کو طاق نسیان میں ڈال دیتی تھیں اور اسے اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھنے لگتی تھیں۔ اپنی اس سادہ لوحی کی وجہ سے بسا اوقات پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ "المؤمن غر کریم" (مومن بھولا نرم خو ہوتا ہے) کی زندہ تصویر تھیں۔ رب کریم دنیاوی تکالیف کو ان کے بلندی درجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

وفات سے دو ہفتہ قبل بندہ کے پاس کراچی آئی ہوئی تھیں' رات عشاء کے بعد گلی سے مونگ پھلیاں فروخت کرنے والا آواز لگاتا ہوا گزرا۔ بندہ نے مونگ پھلی خریدی' دوسرے روز پھر وہ معمول کے مطابق صدا لگاتا ہوا گزرا تو والدہ مرحومہ نے فرمایا کہ بیچارے سے مونگ پھلی خرید لو۔ بندہ نے عرض کیا کہ آج پھل لایا ہوں وہ کھائیں گے تو فرمایا "وہ بیچارہ ہماری وجہ سے تو آج آیا ہے کیونکہ کل ہم نے اس سے مونگ پھلی لی تھی تو آج پھر امید باندھ کر آیا ہے' اگر ہم نہیں لیں گے تو خوامخواہ کا سفر پڑے گا' اس پر چھوٹے بھائی حافظ خلیق احمد سلمہٗ نے کہا کہ اماں! یہ تو روزانہ گزرتے ہیں تو اس پر قدرے خفا ہوکر فرمایا کہ "اپنا ہی پیٹ آگے نہ رکھا کرو کسی دوسرے کا بھلا بھی سوچ لیا کرو' دیکھ! رات گئے گلیوں کے چکر کاٹتا پھر رہا ہے' مونگ پھلیاں نہیں بکی ہوں گی تبھی تو پھر رہا ہے' بیچارے کے بیوی بچے بھی انتظار کررہے ہوں گے جاؤ! مونگ پھلی خرید لو اس کا بھی بھلا ہوجائے گا"۔

سبحان اللہ! ذرا دیکھئے تو سہی کس قدر سادہ انداز بیان اور کیسی قیمتی نصیحت کہ یہ ہمدرد آنکھ اپنے ذاتی مفاد اور ضرورت سے تجاوز کرکے کسی دوسرے پریشان حال کی ضرورت اور نفع کو بھی دیکھ رہی ہے جس سے ایثار' ہمدردی' دوسرے کی تکلیف کا احساس مترشح ہورہا ہے۔ جب تک والدہ مرحومہ بندہ کے پاس رہیں اسی جذبہ کے تحت روزانہ مونگ پھلیاں خریدی جاتی تھیں۔ کاش! ہر ماں ایسی ہی تربیت کرنے لگے تو ماحول ومعاشرہ کی آلودگیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ سامنے آئے کہ جہاں محبت و آشتی کے پھول کھلنے لگیں اور ایثار وہمدردی کی مہک پھوٹنے لگے۔

ایک مرتبہ ایک گھر میں جانا ہوا تو ٹیلی ویژن چل رہا تھا والدہ مرحومہ نے دیکھ کر فورا پردہ کرلیا تو انہیں بتایا گیا کہ ٹیلی ویژن کے سکرین پر جو لوگ نظر آرہے ہیں وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تو فرمایا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے دیکھو تو سہی کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مرد دیکھ رہے ہیں"۔

"واہ! یہ سادہ لوحی اور یہ تیز زمانہ" ایسے نیک لوگوں کا بھول پن زبان حال سے پکار رہا ہے کہ ایسے مکروہ وملعون آلات معصیت سے پردے ہی میں رہنا چاہیے' حق تعالیٰ شانہٗ ان ذرائع معصیت کو پردہ ہی دے دے۔ آمین۔

شہر کی سینکڑوں خواتین نے ان سے قرآن کریم پڑھا۔ قرآن کریم سے خاص شغف تھا اور محبت ولگن کے ساتھ قرآن کریم پڑھایا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی تلاوت قرآن ہی فرمارہی تھیں۔ عشاء کی اذان ہوچکی تھی تو دل میں درد محسوس ہونے لگا فرمایا کہ مجھے عشاء کی نماز پڑھادو شاید یہ میری آخری نماز ہے' شاید نصیب نہیں ہوگی۔ گھر کی خواتین نے کہا کہ عشاء کا بہت وقت ہے آپ لیٹ جائیں سر دبادیتے ہیں مگر خود ہی' چارپائی پر بیٹھے بیٹھے قبلہ کی طرف منہ کرکے ہاتھ باندھ لئے۔ گھر کی خواتین نے تکلیف دیکھ کر زبردستی لٹادیا اور سر دبانے لگیں فرمایا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے کہا سنا معاف کروایا کہ جس پر زیادتی ہوئی ہو معاف کردے۔ پھرہاتھ باندھ کر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا یا اللہ میری آخرت سنوارنا! یا اللہ میری آخرت، سنوارنا۔ اس کے بعد تین مرتبہ بلند آواز سے کلمہ پڑھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ پھر ہچکی آنا شروع ہوگئی۔ برادرم خلیل احمد ڈاکٹر کو لینے دوڑے مگر ان کے آنے تک وہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرچکی تھیں۔ وفات سے دو ہفتہ قبل بندہ کے پاس کراچی آئی ہوئی تھیں اور تقریباً چالیس روز رہیں اور اکثر فرمایا کرتی تھیں کہ میں زندگی میں اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی جتنی یہاں تمہارے پاس آکر ہوئی اللہ خیر کرے اس قدر خوش کیوں ہوں۔ سنت عمر پر وفات پائی۔ اور ان کی تمنا کے مطابق دین پور شریف کے قبرستان کے متولی اعلیٰ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب خلیفہ اقدس حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کی خصوصی شفقت اور اجازت سے حضرت مفتی صاحبؒ کے قدموں کی طرف تدفین ہوئی اور نماز جنازہ برادرم مولانا جلیل احمد صاحب نے پڑھائی۔

مرحومہ کی صرف ایک بہن حیات ہیں جو نوگاواں ضلع سہارنپور میں رہتی ہیں اور حضرت قاری اکرام الحق صاحبؒ خلیفۂ اقدس حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ کی بہو ہیں۔ ایک سال میں دو عظیم المرتبت ہستیوں کی جدائی اور فراق خاندان و متعلقین کے لئے بڑا صدمہ ہے۔ رب کریم صبر جمیل اجر جزیل عطا فرمائے۔

حضرت مولانا

سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی

کی شخصیت کا مختصر جائزہ

سعودی حکومت کی جانب سے امسال "شاہ فیصل ایوارڈ" عالم اسلام کے مایہ ناز مفکر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہٗ العالی کو دیا گیا۔ سعودی حکومت کی طرف سے معارف پروری کا یہ اظہار لائق تحسین ہے۔ اور اسلامی حکومتوں کے لئے لائق تقلید بھی۔ جہاں تک حضرت مولانا کی ذات گرامی کا تعلق ہے ان کی شخصیت دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انعام سے بالاتر ہے۔ وہ اس قافلہ کے نمائندہ ہیں جو "اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللہ" کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے اور جس کے نزدیک پوری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی۔ اس لئے ہمارے نزدیک "شاہ فیصل ایوارڈ" سے حضرت کی عزت ووقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اس ایوارڈ کے لئے باعث صد نازش ہے کہ مولانا نے اسے قبول فرمالیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت مولانا کو محض اپنی عنایت وموہبت سے، جن فطری خصائص وکمالات، جن ملکات حمیدہ اور جذبات صالحہ، جس سوزوگداز اور درد دل، جس قلب سانی اور نفس مطمئنہ سے نوازا ہے اور پھران کے سینہ بے کینہ میں اسلام اور عالم اسلام کی سربلندی اور اصلاح امت کے لئے گھلنے اور پگھلنے کی جو دولت ودیعت فرمائی ہے اور پھران کی زبان وقلم سے اسلام کی پیغام رسانی کا جو کام لیا ہے اس کا اصل صلہ ــــــــ اور بے حد وبے پایاں صلہ ــــــــ ان کو خدا تعالیٰ کے سوا کون دے سکتا ہے۔ اور وہ آخرت کے سوا کہاں مل سکتا ہے، تاہم "ثم یوضع لہ القبول فی الارض" کے مطابق دنیا میں جو محبوبیت ومقبولیت انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے وہ اسی موہبت کا ایک ثمرہ ہے۔ حضرت مولانا نے مشرق ومغرب اور عرب وعجم میں مسلسل اسلام کی دعوت کا صور پھونکا ہے۔ اور وہ پوری انسانیت کو اسلام کے خوان یغما پر جمع

ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی امریکہ ولندن پہنچ کر "مغرب سے صاف صاف باتیں" کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی قاہرہ میں "اسمعی یا مصر" کی اذان دیتے ہیں۔ اور کبھی "اسمعوھا منی صریحۃ ایھا العرب" کے ذریعے معدن اسلام (عرب) کے نمائندوں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ کبھی "دریائے کابل سے دریائے یرموک" تک پہنچ کر عالم اسلام کے مقتداؤں کو بیدار کرتے ہیں۔ کبھی انہیں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" کی کہانی سناتے ہیں۔ (جس کا ایک رخ وجد آفرین ہے تو دوسرا خون افشاں)۔ کبھی ان کے سامنے "تاریخ دعوت وعزیمت" کھول کر رکھتے ہیں۔ کبھی انہیں "اسلامیت ومغربیت کی کشمکش" کے ہولناک پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہیں۔ کبھی انہیں آج کے نظریاتی قافلوں سے ہٹ کر "کاروان مدینہ" میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ الغرض مولانا کی دعوت شرق وغرب' عرب وعجم اور افریقہ وایشیاء کی حدبندیوں سے بالاتر ہے وہ پوری انسانیت کو ——— سسکتی بلکتی انسانیت کو' مادی زخموں سے چور چور انسانیت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستگی کی دعوت دیتے ہیں۔ سعودی حکومت اور دیگر اسلامی ممالک کی طرف سے مولانا موصوف کی دینی خدمات کی قدر دانی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اس دعوت کو اپنائیں جو مولانا مدظلہ کی طرف سے مسلسل پیش کی جارہی ہے۔ اور جس کے لئے ان کی پوری زندگی وقف ہے۔